# اردو فنِ خطابت کے ماخذات:

# فنِ خطابت کی اردو کتب پر ریطوریقا کے اثرات کا جائزہ

مقالہ برائے ایم فل (اردو)


مقالہ نگار:

**قاضی محمد نفیس الرحمان**



**نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد**

**اگست ۲۰۲۲ء**

# اردو فنِ خطابت کے ماخذات:
# فنِ خطابت کی اردو کتب پر ریطوریقا کے اثرات کا جائزہ


مقالہ نگار:

© قاضی محمد نفیس الرحمان


یہ مقالہ

ایم-فل (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء



©

# مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز (شعبہِ زبان) کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **اردو فنِ خطابت کے ماخذات: فنِ خطابت کی اردو کتب پر ریطوریقا کے اثرات کا جائزہ**

پیش کار: قاضی محمد نفیس الرحمان رجسٹریشن نمبر 1877/M/U/F19

## ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ یونس _____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی _____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی _____

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ: _____

# اقرار نامہ

میں، قاضی محمد نفیس الرحمان حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم-فل (اردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آیندہ کروں گا۔

_____

قاضی محمد نفیس الرحمان

مقالہ نگار

## نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

# فہرستِ ابواب


| | |
|---|---|
| مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم | III |
| اقرار نامہ | IV |
| فہرست ابواب | V |
| Abstract | VIII |
| اظہارِ تشکر | X |
| **باب اول موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث** | ۱ |
| الف۔ تمہید | ۱ |
| ۱۔ موضوع کا تعارف | ۱ |
| ۲۔ بیانِ مسئلہ | ۱ |
| ۳۔ مقاصدِ تحقیق | ۲ |
| ۴۔ تحقیقی سوالات | ۲ |
| ۵۔ نظری دائرہ کار | ۲ |
| ۶۔ تحقیقی طریقہ کار | ۴ |
| ۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق | ۵ |
| ۸۔ تحدید | ۶ |
| ۹۔ پس منظری مطالعہ | ۶ |
| ۱۰۔ تحقیق کی اہمیت | ۷ |
| ب۔ بنیادی مباحث | ۷ |
| ۱۔ فنِ خطابت | ۷ |

۲۔ اردو فنِ خطابت کے ماخذات ۲۵
۳۔ "ریطوریقا"- تجزیہ ۳۰
حوالہ جات ۶۱
**باب دوم: اردو میں فن خطابت کی منتخب کتب پر ریطوریقا کے اثرات کا جائزہ** ۶۳
الف۔ "خطابت و تقریر"(از خواجہ شمس الدین احمد)- تجزیہ ۶۳
ب۔ "فنِ تقریر"(مرتبہ ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد)- تجزیہ ۷۳
ج۔ "رموزِ خطابت"(از نذیر الدین احمد)- تجزیہ ۹۷
د۔ "فنِ خطابت"(از سید کلب مصطفیٰ)- تجزیہ ۱۰۸
ہ۔ "تعلیم تقریر"(از ابو البیان آزاد)- تجزیہ ۱۳۵
و۔ "فنِ خطابت"(از شورش کاشمیری)- تجزیہ ۱۴۶
حوالہ جات ۱۶۶
**باب سوم: اردو میں خطابت کے عناصر اور اسالیب** ۱۶۹
الف۔ خطابت میں فصاحت و بلاغت ۱۶۹
1۔ علمِ بیان (تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل) ۱۷۲
2۔ علمِ بدیع (صنائع لفظی، صنائع معانی) ۱۸۱
3۔ علمِ معانی ۱۹۴
4۔ روزمرہ اور محاورہ ۱۹۵
ب۔ مطالعہ اور خطابت ۱۹۷
ج۔ اسلوبِ خطابت ۲۰۱
1۔ شکوہ الفاظ ۲۰۲
2۔ طنطنہ ۲۰۴
3۔ اختصار اور جامعیت ۲۰۶
4۔ ابلاغ ۲۰۷

د۔ نام ور مقررین کی تقاریر کا جائزہ ۲۰۹
ہ۔ خطابت- عوامی امنگوں کی ترجمان اور مسائل کا حل ۲۱۴
1۔ مختلف تحریکیں ۲۱۵
2۔ سیاست اور انقلاب ۲۱۷
حوالہ جات ۲۲۰
**باب چہارم مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج، سفارشات** ۲۲۵
الف۔ مجموعی جائزہ ۲۲۵
ب۔ تحقیقی نتائج ۲۳۳
ج۔ سفارشات ۲۳۵
کتابیات ۲۳۷

# ABSTRACT

**Title: Resources of Urdu Rhetoric: Study of "Rhetoric's" Impact on Urdu Rhetoric Books**

The M.Phil Urdu research thesis is study of "Impact of Rhetoric on Urdu Rhetoric Books". Six Urdu books on rhetoric (Khitabat-U-Taqreer, Fan-E-Taqreer, Ramuz-E-Khitabat, Fan-E-Khitabat, Taleem-E-Khitabat & Fan-E-Khitabat) are chosen to discuss and evaluate the impacts of Rhetoric by Aristotle on the Urdu rhetoric books. These Urdu books cover all aspects of rhetoric. The purpose of the research is to understand the theory of Aristotle's rhetoric, to study the nature of Urdu rhetoric, to examine the thematic scope of selected books written on the art of rhetoric in Urdu from the perspective of Rhetoric and to analysis the art & techniques of rhetoric proposed in selected books with respect to Rhetoric by Aristotle.

Urdu Language encompasses various arts. These arts contributed a lot to vitalize Urdu language & literature. The Urdu language has played a vital role in expansion of various arts. Art of rhetoric is one of the prominent arts among these, which deals with eloquence and appropriate speech. The art of rhetoric is actually the art of speech which begins with the first ever word uttered by human-being to covey the message. It is developed with the passage of time, bulge-out in a state of refined art and further emerge as a profound art, skill & branch of education. Rhetoric written by Aristotle considered as one of the briefs, fundamental & authentic standard books composed on this topic. Urdu books written on this art of speech has a significant influence of this outstanding book. Urdu rhetoric writing has taken basis from this splendid book, but there is no doubt in accepting that Urdu rhetoric writing has its own wide concepts and ideas based on Aristotle's theory. The research paper covers almost all the aspects of rhetoric that are influenced by Aristotle's theory and discuss those aspects as well which made their own way to grow on the roots of that theory. Qualitative & analytical research methodology is

followed to acquire authenticity of collected data. The research paper is advantegeous for orators and critics.

Aristotle's theory of Rhetoric composed of three basic points, Ethos, Pathos and Logos. Ethos comprises Orators' personality, character, knowledge and expertise in his field. Ethos means an orator should be aware of his audiences, their psychy, emotions, believes and contemplations to make them convinced on a specific purpose. Logos means a speech must be logical having objective evidences. Urdu Rhetoric also based on the mentioned tri-points. All chosen (six) writers mentioned and discussed art of rhetoric according to these tri-points, however a few more sub-points are added to discussion in accordance with contemporary needs. The chosen writers, consciously and unconsciously took main idea from Aristotle's Rhetoric as it was one of the first books on this art having detail basic discussions. They, however, expanded the main idea according to evolution of time and to their era and territory. They delibrated logics and enthymemes in persuasive manner. Moreover, they interpreted logics, similes, metaphors and proverbs according to the nature and occasion of speech to make it more influential. According to Aristotle, so as to Urdu rhetoric writers, clear and explicit style, energetic and attractive expressions, grammatically correct language, logical sequence of various parts of oratory, demonstration of logics by usage of suitable strategies in accordance with the nature of oratory are basic techniques of a persuasive speech.

First three chapters comprises the detail discussion regarding the topic, whereas, all discussion of the research is briefly summarized in the last chapter. Research results are derived and composed in fourth chapter. Besides, recommendations regarding research on Urdu rhetoric are given at the end of the last chapter.

# اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں اپنے اللہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے ہر مقام پر میرے وہم و گمان سے بڑھ کر میری مدد کی پھر والدین کا احسان مند ہوں جن کی دعاؤں اور وفاؤں کی بہ دولت میں یہاں تک پہنچا۔ مربیِ مشفق جناب پروفیسر ضیا الحق صاحب کا بے حد شکریہ جن کے ایما پر میں نے ایم فل اردو میں داخلہ لیا۔ صدر شعبہِ اردو نمل، اسلام آباد ڈاکٹر فوزیہ اسلم صاحبہ کا ممنونِ احسان ہوں جن کی خصوصی شفقت سے دفاعِ موضوع سے دفاعِ مقالہ تک کا سفر آسان ہوا۔ اپنے شفیق ترین اساتذہ ڈاکٹر محمود الحسن رانا، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر بشریٰ پروین، ڈاکٹر صائمہ نذیر، ڈاکٹر ارشاد بیگم اور ڈاکٹر صنوبر الطاف کا تشکرِ بسیار جنھوں نے ہر گام پر بہترین رہ نمائی کی۔ نگرانِ مقالہ ڈاکٹر نازیہ یونس صاحبہ کو خصوصی ہدیہ تشکر پیش کرتا ہوں، جن کی مشفقانہ نگرانی میں تحقیقی کام پایہ تکمیل تک پہنچا۔ استادِ محترم باقر وسیم قاضی اور شوکت محمود شوکت صاحب کو نذرانہِ تشکر پیش کرتا ہوں، جنھوں نے ہر لحظہ اور ہر لمحہ معاونت کی۔ مقالے کی تسوید و تکمیل میں اہم کردار جامع المحاسن ہاجرہ امینہ علی صاحبہ کا ہے، جن کی استعانت و معاونت کے بغیر یہ ممکن نہ تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ صحت کی خرابی اور دیگر مصروفیات کے باعث میں نے تحقیقی کام سے معذرت کر لی، لیکن انھوں نے ہمیشہ برانگیخت کیا اور بالآخر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے وہ وقت بھی آن پہنچا کہ مقالہ بہترین انداز میں پایہ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

قاضی محمد نفیس الرحمان
ایم فل اردو (اسکالر)

# باب اول

# تمہید اور موضوع کا تعارف

## الف۔ تمہید:

### ا۔ موضوع کا تعارف

اردو زبان مختلف فنون کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ ان فنون نے اردو زبان و ادب کو مستحکم کیا اور اردو زبان نے ان فنون کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انھی فنون میں ایک فنِ خطابت ہے، جو خوش گفتاری اور حسبِ موقع کلام سے متعلق بحث کرتا ہے۔ مجوزہ تحقیقی کام اردو میں فنِ خطابت (Rhetoric) پر لکھی گئی منتخب کتب پر ریطوریقا کے اثرات کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ منتخب کردہ کتب فنِ خطابت کے تمام لوازمات کا احاطہ کرتی ہیں نیز فنی اعتبار سے مستند ہیں۔ شمس الدین احمد کی کتاب "خطابت و تقریر" میں انھوں نے فنِ تقریر کے اصول و ضوابط، تقریر کو مؤثر بنانے کے وسائل اور تقریر سے متعلق فلسفیانہ مباحث کو سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔ ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد کی مرتب کردہ کتاب "فنِ تقریر" میں اس فن کی تاریخ، اہمیت، اوصافِ مقرر، اسلوب اور طریقہ ہائے تقریر جیسے موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے اور چند تصاویر کے ذریعے اس فن کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نذیر الدین احمد کی تحریر کردہ کتاب "رموزِ خطابت" میں خطابت کی اہمیت، تقریر کو مؤثر بنانے کے طریقے، اقسام اور نمونے کی چند تقاریر پیش کی گئی ہیں۔ سید کلب مصطفیٰ کی تصنیف "فنِ خطابت" خطابت کا دیگر علوم سے تعلق، کامیاب خطابت کے مبادی، خطابت کی ابتدا و ارتقا، خطابت بااعتبار نوع، موضوع اور مقصود جیسے مضامین پر مبنی ہے۔ "تعلیمِ تقریر" میں مصنف علامہ ابو البیان آزاد نے جرات اور خود اعتمادی کی نشو نما، نام ور مقررین کی تیاری کے طریقے، پلیٹ فارم اور شخصیت، تقریر کے لوازم اور زبان کی اصلاح کو موضوع بنایا ہے۔ شورش کاشمیری نے اپنی کتاب "فنِ خطابت" میں خطابت کا چارٹ، خطابت کی ضروریات کے علاوہ زبان و بیان جیسے موضوعات کو طشت از بام کیا ہے۔

### ۲۔ بیان مسئلہ

اردو خطابت نے ہر اس آدمی تک اردو زبان و ادب کو پہنچایا جس کی عموماً اردو کتب تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ اردو خطابت نے اردو ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو کے نام ور محققین و ناقدین نے

فنِ خطابت پر بہترین کتب تحریر کی ہیں۔ یہ کتب فنِ خطابت کی تفہیم اور خطیبانہ آہنگ کی تصحیح کے لیے رہنما کتب ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں اردو فنِ خطابت کی منتخب کتب کا ریطوریقا کے تناظر میں تحقیقی مطالعہ کیا گیا ہے، جس سے فنِ خطابت کی مختلف جہات و متعلقات کی تفہیم ممکن ہوئی۔

## ۳۔ مقاصدِ تحقیق

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی مقاصد پیشِ نظر رکھے گئے:

۱. ارسطو کے نظریہ خطابت کی تفہیم اور اردو میں فنِ خطابت کی نوعیت کا مطالعہ۔
۲. اردو میں فنِ خطابت پر لکھی گئی منتخب کتب کے موضوعی دائرہ کار کا ریطوریقا کے تناظر میں جائزہ۔
۳. خطابت کے موضوع پر مبنی منتخب اردو کتب اور خطابت کے فن کا ریطوریقا کے حوالے سے تجزیہ۔

## ۴۔ تحقیقی سوالات

مجوزہ مقالے میں درج ذیل تحقیقی سوالات پیشِ نظر رکھے گئے:

۱. ارسطو کے نظریہ خطابت کے تناظر میں اردو زبان میں فنِ خطابت کی نوعیت کیا ہے؟
۲. اردو میں فنِ خطابت پر لکھی گئی منتخب کتب کا ریطوریقا کے تناظر میں موضوعی دائرہ کار کیا ہے؟
۳. خطابت کے موضوع پر مبنی منتخب اردو کتب اور خطابت ریطوریقا کے تناظر میں کس حد تک فنی تقاضوں کو پورا کرتی ہیں؟

## ۵۔ نظری دائرہ کار

چوتھی صدی قبل مسیح میں ارسطو نے فنِ خطابت کے متعلق تین جلدوں پر مشتمل کتاب "ریطوریقا" لکھی۔ جلد اول خطابت کے عمومی منظر نامے، باقاعدہ تعریف، اقسام اور بنیادی مباحث پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں ارسطو نے مقرر کی ترغیب / تحریک (Persuasion) کے تین بنیادی ستونوں یعنی مقرر کی صداقت و اخلاقیات (Ethos)، سامعین کے جذبات و نفسیات (Pathos) اور دلائل و براہین (Logos) کو مفصل بحث کیا ہے۔ جلد سوم تقریر کے اسلوب اور اندازِ نگارش کا احاطہ کرتی ہے۔ انگریزی میں مذکورہ کتب کے پانچ مستند تراجم ہو چکے ہیں۔ جان ہنری فریس کے ترجمہ ''Aristotle–The Art of Rhetoric'', William Heinemann, Loeb Classical Library Vol.193, January 1926. کے مطابق، ارسطو کے بقول:

"Rhetoric is a counterpart of dialectic, which resembles in being concerned with matters of common knowledge and not with any specific science. Rhetoric may be defined as the faculty of discerning the possible means of persuasion in each particular ease. These consists of proofs, which are (1) Inartificial; (2) Artificial. The latter are three kinds : (1) Ethical, derived from the moral character of the speaker;(2) Emotional, the object of which is to put the hearer into acertain frame of mind; (3) Logical, contained in the speech itself when a real or apparent truth is demonstrated."

مذکورہ نظریہ کی توضیح اردو کے محقق محمد فیصل نے اپنی کتاب "ارسطو---ایک عہد، ایک شخصیت" میں یوں کی ہے:"خطابت ایک ایسا فن ہے جو کہ دانش مندی سے بتاتا ہے کہ کون سی چیز اثر کرنے والی ہے اور کون سی نہیں۔" خواجہ شمس الدین احمد اپنی کتاب "خطابت و تقریر" میں علامہ ابن رشد کی کتاب "تلخیص الخطابۃ" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"و فی اصلاح الحکما ھی صناعۃ تتکلف الاقناع الممکن فی کل مقولۃ من المقولات: ارسطو کی رائے میں اور علوم کی طرح خطابت کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ کوئی مبحث یا کسی علم و فن کا کوئی مسئلہ، خطابت کا زور سب پر چلتا ہے اور کوئی ذہنی یا محسوس شے ایسی نہ ملے گی جو اس کے وسیع دائرہ اثر سے خارج ہو۔"

اس کے علاوہ اردو کے معروف محقق و مؤرخ علامہ شبلی نعمانی اپنے مضمون "فنِ بلاغت" میں اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ارسطو کی کتاب کا موضوع یہ ہے کہ جب کوئی تقریر کسی موقع پر کی جائے تو امورِ ذیل قابلِ لحاظ ہوں گے: (۱) مضمونِ تقریر کیا ہے؟ (۲) تقریر کے مخاطب کون لوگ ہیں؟ (۳) تقریر کرنے والا کون ہے؟ ان مختلف حیثیتوں کے لحاظ سے تقریر

کے مقدمات کس قسم کے ہونے چاہیے۔۔۔ہر ایک کے طریقہ استدلال کو کس
طرح ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیے۔"

ارسطو کے نظریہ خطابت کی تفہیم کے لیے مذکورہ بالا انگریزی اور اردو کی کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ارسطو کا پیش کردہ نظریہ خطابت کی اساس، اقسام، طریقے اور اندازِ بیان کے ضمن میں اردو کی فنِ خطابت پر لکھی گئی منتخب کتب کی موضوعی اور فکری جہات کی تفہیم میں مدد و معاون ثابت ہوا۔

## ۶۔ تحقیقی طریق کار

### I۔ کیفیتی طریقہ:

مجوزہ تحقیق "اردو میں فنِ خطابت کی منتخب کتب پر ریطوریقا کے اثرات کا مطالعہ "بنیادی طور پر ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہے۔ مجوزہ تحقیقی مقالے میں طریقہ کار کی نوعیت کیفیتی تحقیق (Qualitative Research) ہے۔یعنی مجوزہ تحقیق میں معلومات، تصورات، نظریات، تاثرات، اور شواہد کو جمع کر کے آخر میں نتائج اخذ کیے گئے۔ کیفیتی طریقہِ تحقیق کو اپناتے ہوئے مجوزہ موضوع کے لیے فنِ خطابت پر لکھی گئی اردو کتب کو منتخب کیا گیا کیوں کہ مذکورہ کام اردو میں تشنہ تحقیق تھا۔

تحقیقی کام کے باقاعدہ آغاز سے قبل مجوزہ موضوع سے متعلق مقاصد ترتیب دیے گئے۔ حصولِ مقاصد کے لیے سوالاتِ تحقیق مرتب کیے گئے۔ مقاصد و سوالاتِ تحقیق کو مد نظر رکھتے ہوئے مقالے کا نظری دائرہ کار طے کیا گیا۔ بعد ازیں مقاصد، سوالات اور نظری دائرہ کار کے مطابق ابواب بندی کی گئی۔ ابواب بندی کے مندرجات کو مد نظر رکھتے ہوئے تحقیقی کام کو آگے بڑھایا گیا اور مقالے کی تکمیل کے لیے مواد ترتیب دیا گیا۔

### II۔ دستاویزی طریقہ:

چوں کہ مقالہ میں فنِ خطابت کی منتخب کتب کو تجزیاتی طور پر دیکھنا مقصود تھا، اس لیے دورانِ تحقیق تاریخی اور دستاویزی طریقہِ تحقیق اختیار کیا گیا۔ یعنی پہلے سے موجود اس تحقیقی مواد سے استفادہ کیا گیا، جو متعلقہ موضوع سے قریب تر تھا۔ نیز مقالے کی تکمیل کے لیے بنیادی مآخذ کے ساتھ ثانوی مآخذ میں اردو کتب اور رسائل و جرائد کے علاوہ انگریزی کتب، لغات، ریسرچ پیپرز اور تنقیدی مضامین مد نظر رہے۔

## III۔ کتب خانے اور آن لائن طریقہ:

تحقیقی مواد کی جمع آوری کے لیے جامعات، ادارہ جات کے کتب خانوں اور نجی کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا۔ جن میں نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے کتب خانوں، حمید اللہ لائبریری اور مقتدرہ قومی زبان کو ترجیحی بنیادوں پر استعمال کیا گیا۔ علاوہ ازیں آن لائن طریقہ تحقیق اپناتے ہوئے اردو کی مستند ویب گاہ ریختہ ڈاٹ کام پر موجود کتب اور انگریزی کی ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا گیا۔

مجوزہ تحقیق فیلڈ ورک یا سائنسی نوعیت کی نہیں ہے، لہٰذا موضوع سے متعلق مواد کی جمع آوری اور ترتیب کے بعد تجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ ادبی تحقیق کے جملہ اصولوں کے اطلاق کے بعد حاصل شدہ مواد کے اثبات و نفی کے ذیل میں نتائج مرتب کیے گئے۔

## ۷۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق

انگریزی زبان میں ارسطو کی کتاب "ریطوریقا" کے پانچ مستند تراجم اور اس کے علاوہ اس پر متعدد مباحث شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۸۱۱ء میں ڈینئیل مائیکل (Daniel Michael) نے A Dissertation Upon Rhetoric" کے نام سے متذکرہ کتب اور اس میں پیش کردہ نظریہ خطابت پر بحث کی۔ علاوہ ازیں اس کتاب کا سب سے پہلا انگریزی ترجمہ رچرڈ سی جیب (Richard C. Jebb) نے ۱۹۰۹ء میں "The Rhetoric of Aristotle" نام سے کیا۔ دوسرا ترجمہ ۱۹۲۴ء میں جان ہنری فریس (John Henry Freese) نے "Aristotle-The Art of Rhetoric" کے عنوان سے کیا، جو "لوئب کلاسیکل لائبریری" میں بہ طور ایک جزو شائع ہوا۔ اسی طرح ڈبلیو ریز رابرٹ (W. Rhys Robert) نے اس کتاب کا ترجمہ "Rhetoric by Aristotle" کیا، جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے کلاسیکل ورک میں ایک جزو کے طور پر شائع ہوا۔ لین کوپر (Lane Cooper) کا ترجمہ شدہ متن "The Rhetoric of Aristotle" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا جب کہ جارج اے کینیڈے (George A. Kennedy) نے ۱۹۹۱ء میں اس کتاب کا مختصر ترجمہ "A New History of Classical Rhetoric" کیا۔ علاوہ ازیں جاکلین لٹزک اور میری ہینگلر (Jaclyn Lutzke & Mary Henggler) نے ارسطو کے پیش کردہ خطابت کے تین بنیادی اصولوں کی تفہیم کے لیے ۲۰۰۹ء میں ایک مضمون "The Rhetoric Triangle"

لکھا۔ ۱۹۹۰ء میں ڈبلیو گیلرچ کی کتاب " Aristotle Rhetoric: Theory, Truth & Metarhetoric" منظرعام پر آئی۔ اردو میں محمد فیصل کی کتاب "ارسطو، ایک عہد۔۔ایک شخصیت" (مشتاق بُک کارنر، لاہور، ۲۰۱۵ء) میں ارسطو کے فنِ خطابت کے نظریے کو سرسری طور پر بحث کیا گیا ہے۔ حافظ مظفر محسن نے جے-وی-سرنی (J.V.Cerney) کی کتاب کا اردو ترجمہ "الفاظ کا جادو" (سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء) کے نام سے کیا۔ جس کے باب پندرہ میں 'خطابت کا فن' کے نام سے مضمون تحریر کیا۔

## ۸۔ تحدید

مجوزہ تحقیقی کام اردو میں فنِ خطابت (Rhetoric) کی منتخب کتب پر ارسطو کی کتاب "ریطوریقا" کے اثرات کے مطالعہ پر مبنی ہے۔ منتخب کردہ کتب فنِ خطابت کے تمام لوازمات کا احاطہ کرتی ہیں نیز فنی اعتبار سے مستند ہیں۔

## ۹۔ پس منظری مطالعہ

انگریزی زبان میں ارسطو کی کتاب "ریطوریقا" کے پانچ مستند تراجم اور اس کے علاوہ اس پر متعدد مباحث شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا سب سے پہلا انگریزی ترجمہ رچرڈ سی جیب (Richard C. Jebb) نے ۱۹۰۹ء میں "The Rhetoric of Aristotle" نام سے کیا۔ دوسرا ترجمہ ۱۹۲۴ء میں جان ہنری فریس (John Henry Freese) نے "Aristotle-The Art of Rhetoric" کے عنوان سے کیا، جو "لوئب کلاسیکل لائبریری" میں بہ طور ایک جزو شائع ہوا۔ اسی طرح ڈبلیو ریز رابرٹ (W. Rhys Robert) نے اس کتاب کا ترجمہ "Rhetoric by Aristotle" کیا، جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے کلاسیکل ورک میں ایک جزو کے طور پر شائع ہوا۔ لین کوپر (Lane Cooper) کا ترجمہ شدہ متن "The Rhetoric of Aristotle" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا جب کہ جارج اے کینیڈے (George A. Kennedy) نے ۱۹۹۱ء میں اس کتاب کا مختصر ترجمہ " A New History of Classical Rhetoric" کیا۔ علاوہ ازیں جاکلین لٹزک اور میری ہینگلر (Jaclyn Lutzke & Mary Henggler) نے ارسطو کے پیش کردہ خطابت کے تین بنیادی اصولوں کی تفہیم کے لیے ۲۰۰۹ء میں ایک

مضمون "The Rhetoric Triangle" لکھا۔ ۱۹۹۰ء میں ڈبلیو گیلرچ کی کتاب "Aristotle Rhetoric: Theory, Truth & Metarhetoric" منظر عام پر آئی۔

اردو میں محمد فیصل کی کتاب "ارسطو، ایک عہد۔۔ایک شخصیت" (مشتاق بُک کارنر، لاہور، ۲۰۱۵ء) میں ارسطو کے فنِ خطابت کے نظریے کو سرسری طور پر بحث کیا گیا ہے۔ حافظ مظفر محسن نے جے-وی-سرنی (J.V.Cerney) کی کتاب کا اردو ترجمہ "الفاظ کا جادو" (سیونتھ سکائی پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۸ء) کے نام سے کیا۔ جس باب پندرہ میں 'خطابت کا فن' کے نام سے مضمون تحریر کیا۔

## ۲۔ تحقیق کی اہمیت

انگریزی ادب میں فنِ خطابت (Rhetoric) پر خاطر خواہ تحقیقی کام ہو چکا ہے۔ فنِ خطابت پر اردو ادب میں کافی کتب موجود ہیں لیکن ان پر تاحال کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مجوزہ تحقیق میں فنِ خطابت پر لکھی گئی منتخب اردو کتب کا تحقیقی مطالعہ ارسطو کے نظریہ خطابت کی روشنی میں کیا گیا۔ یہ تحقیق اپنی نوعیت کی ایک منفرد تحقیق ہے۔ یہ ناقدین و محققین کے لیے نئی راہیں ہموار کرے گی، جس سے فنِ خطابت کے نئے زاویے سامنے آئیں گے۔ یہ تحقیقی کام فنِ خطابت کے عناصر کی اہمیت اور باہمی ربط کو اجاگر کرنے میں بھی معاون ہو گا۔

## ب۔ بنیادی مباحث

## 1۔ فنِ خطابت

جب کوئی مقرر اپنی ابلاغی اور فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنا پیام یا مدعا سٹیج کے ذریعے عوام (Pubic) تک پہنچاتا ہے تو اس کا یہ عمل خطابت کہلاتا ہے۔ خطابت عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے لغوی معنی "خطبہ پڑھنا، تقریر کرنا، تقریر کا فن، خطبہ پڑھنے کا فعل" (۱) ہے۔ خطابت کا مترادف لفظ فنِ تقریر ہے۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے، فن اور تقریر۔ فن کا معنی "صلاحیت، استعداد، قابلیت، لیاقت، مہارت یا ہنر" ہے جب کہ تقریر عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مادہ "قرر" ہے، جو گفتگو کے معنی میں مستعمل ہے۔ تقریر کے معنی وارث سرہندی نے "بیان، ذکر، گفتگو، بحثِ علمی و عقلی، تکرار، حجت" (۲) بیان کیے ہیں۔ نوراللغات میں فن کا مطلب "ہنر، جوہر" جب کہ تقریر کے معنی "گفتگو کرنا، بیان، ذکر، بات چیت، بحث، علمی یا عقلی تکرار، مباحثہ، حجت، تقریر کرنا، بیان کرنا، حجت کرنا" (۳) درج ہیں۔

اصطلاحی معنی میں خطابت سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنے مدعا کے انفرادی اظہار کے ذریعے مجموعی طور پر لوگوں تک اپنا مافی الضمیر پہنچائے، تو یہ فعل خطابت ہے۔ یہ عمل سرانجام دینے والے کو 'خطیب / مقرر' کہا جاتا ہے۔ جس کے معنی "خطبہ پڑھنے والا، تقریر کرنے والا، وہ عہدہ دار جو بادشاہ کو کسی شخص یا بات کی طرف دعا دے کر توجہ کرتا ہے، عربوں میں ایک عہدہ دار جس کا کام اپنی قوم کی خوبیاں اور مخالفین کی برائیاں ظاہر کرنا تھا۔ شورش کاشمیری اپنی کتاب "فنِ خطابت" میں خطابت کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "عوام سے اجتماعاً ہم کلام ہونے کا نام خطابت ہے۔ اصطلاحاً اس فن کا نام ہے جس کا مقصود و مطمع عوام سے خطاب کرنا اور ان کے دل و دماغ میں اپنی غایت و منشا اتارنا۔ خطابت میں ترغیب اور ترہیب دونوں ہیں۔ فی الجملہ خطابت زبان کا اعجاز ہے۔"(۴)

گویا یہ کہا جاسکتا ہے کہ عوامی گروہ سے جب کوئی اجتماعی طور پر مخاطب ہوتا ہے تو یہ خطابت یا تقریر کہلاتا ہے۔ جس کا مقصد صرف اور صرف اپنے مدعا اور مقصد کا عوام تک ابلاغ ہے۔ اپنی تقریری صلاحیتوں کو استعمال کرتے ہوئے زبان اور بیان کے اعجاز سے اپنی بات کو لوگوں کے دلوں میں اتارنا خطابت ہے۔ خطیب اس مقصد میں کامیابی کے لیے رغبت کا پہلو بھی لوگوں کے سامنے رکھتا ہے اور تخویف کا بھی۔ احتشام کٹونوی اپنی کتاب "فنِ خطابت" میں تقریر کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "جب منظم طریقہ سے کسی مقصد یا اظہارِ خیال کے لیے اپنی بات کہتے ہیں تو اسے تقریر کہتے ہیں۔ بعض تقریر آپ کے دل کو چھوتی ہے، بعض آپ کے دماغ کو مخاطب کرتی ہے۔ تقریر کیا ہے؟ شاعری ہے، موسیقی ہے، یہ ترنم ہے، نقش گری ہے، جھکڑ ہے، اچھی تقریر سادے الفاظ میں بلند خیالات ہیں۔ یہ زبان کا شستہ اور صاف استعمال ہے، یہ فصاحت ہے، یہ بلاغت ہے۔"(۵)

انسان کو قدرت نے جن ممیز اوصاف و خواص سے نوازا ہے ان میں اک نطق بھی ہے۔ اسی کی بدولت اسے حیوانِ ناطق کہہ کر دیگر جانوروں سے امتیاز بخشا گیا ہے۔ اسے قوتِ گویائی عطا کی گئی تاکہ یہ اپنے مافی الضمیر کو طشت از بام کر سکے۔ اس کی قوتِ ناطقہ کے مختلف درجے ہیں۔ روزمرہ گفتگو میں اندازِ گفتگو عمومی اور سہل الفہم ہوتا ہے۔ تقریری صورت میں الفاظ و اصوات اور ان کے معنوی نظام کو تقاضائے خطابت کے تحت برتا جاتا ہے جب کہ تحریری شکل میں الفاظ و تراکیب کو رقم کرنے کی ترتیب و تنظیم تسویدی

تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ سائنسی میدان میں دورانِ گفتگو سائنسی اصطلاحات( Scientific Terminologies) کو برتا جاتا ہے، منطقی اور نپا تلا انداز سراہا جاتا ہے۔ ادبی محافل میں اندازِ سخن کی نوعیت محفل کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے، شستہ زبان، رواں لہجہ اور ملائمت سے مملو اظہارِ بیان جیسے اوصاف ادبی سخن وری کا لازمہ ہیں۔ سیاسی حلقوں میں گفت گو کا انداز یکسر بدل جاتا ہے، بعینہٖ عوامی مجمع سے خطابت کی نوعیت کے مطابق اندازِ تقریر اپنایا جاتا ہے۔ الغرض، اس کائناتِ رنگ و بو میں ایک قوتِ ناطقہ کے درجوں میں اتنا ہی تنوع اور وسعت پوشیدہ ہے جتنا انسانی درجوں میں۔ بہ حیثیت مجموع عوامی حلقوں سے مخاطب ہونا خطابت کہلاتا ہے۔ اسی خطابت کے متعلق سید کلب مصطفےٰ لکھتے ہیں کہ

> "خطابت نام ہے اس فن کا جس کی مدد سے اپنی بات دوسروں سے منوائی جا سکے۔ یعنی اس سے مراد وہ بیان ہے جو دلوں کو گرمانے، کسی بات کو واضح کرنے، کسی امر کا یقین دلانے، اثر پیدا کرنے، ترغیب دینے یا سامعین کو کسی خاص عمل یا روش پر آمادہ کرنے میں مدد دے۔"(۶)

سامعین و حاضرین اگر مقرر کی گفتگو کی تہ تک پہنچ جائیں اور اس کی کہی گئی ہر جہت تک نہ صرف ان کی رسائی ممکن ہو بلکہ کامل تفہیم ہو جائے تو ان لوگوں سے مخاطب شخص مقرر ہے۔ یعنی، ابلاغ اور تفہیم ہی کی بہ دولت کوئی شخص مقرر کہلانے کا حق دار ہے۔ اب چاہے وہ اس تکمیلِ مقصد کے لیے نادر الفاظ اور سہل تراکیب کا استعمال کرے یا پیچیدہ الفاظ اور دقیق تراکیب کو اپنائے۔ تقریر کا آہنگ و اسلوب وہ ہو جو مقرر کے ہر مدعا اور مقصد کو مخاطبین کے قلوب و اذہان تک پہنچائے۔ یہ اب مقرر کی لیاقت و ذہانت پر منحصر ہے کہ وہ طرزِ خطابت و فصاحت کو اقتضائے مدعا کے مطابق ڈھال لے اور سامعین کی تفہیمی سطح کو چھونے لگے۔ عربی کی معروف کہاوت "خاطبوا الناس علی قدر عقولهم" کے مطابق لوگوں سے ان کی عقل اور فہم و فراست کے مطابق خطاب کیا جائے تاکہ مدعائے خطابت کی تکمیل ممکن ہو۔

اردو فنِ خطابت نے عربی خوانِ خطابت سے بھی خوشہ چینی کی ہے۔ عربوں کو اپنی فصاحت اور بلاغت پر ہمیشہ سے ناز رہا ہے۔ ان کا یہ فخر بجا ہے کیوں کہ ان کی زبان بلاغت سے معمور ہے اور ان تمام خصوصیات سے متصف ہے جو اسے ہمیشہ برتر اور اعلا رکھیں۔ عربی میں اس فن پر لکھی گئی کتب میں جو تعریفِ خطابت کی گئی ہے، وہ یہ ہے:

''ومن اقدام ما عرفت به الخطابه؛ تعريف ارسطو بانها: 'قوة تتكلف

الاقناع الممکن فی کل واحد من الامور المفردۃ" (۷)

یعنی جمہور کے ساتھ بالمشافہ بات کرنا، ان کو کسی بات پر قائل کرنا اور ان کو کسی طرف مائل کرنے کے فن کو خطابت کہتے ہیں۔ زبانِ عربی میں احمد محمد الحوفن خطابت کی بابت لکھتے ہیں:

"فن مشافهة الجمهور، واقناعه واستمالته۔" (۸)

یعنی خطابت وہ قوت ہے جو ہر ایک کو ہر ایک مسئلہ الگ الگ سمجھا دے یا منوا دے۔ خطابت ایک ایسی طاقت کا نام ہے جس کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے دلائل دے اور وہ دلائل اتنے پختہ، موثر اور اٹوٹ ہوں کہ مخاطب یا مخاطبین اس دعویٰ کے قائل ہو جائیں۔ زبان و بیان، طرزِ اظہار اور دلائل سے خطابت کو اثر پذیر بنایا جاسکتا ہے۔

انگریزی زبان میں خطابت کے لیے لفظ Rhetoric استعمال ہوتا ہے۔ مختلف انگریزی لغات کے مطابق خطابت ایک موثر فن ہے جو قوتِ گویائی اور تحریر دونوں سے متعلق ہے۔ ایک موثر تقریر یا تحریر دراصل خطابت ہے۔ خطیب تقریر و تحریر کی وساطت سے اپنا مدعا دیگر افراد پر واضح کرتا ہے۔ جس قدر عمدگی سے وہ یہ کام سرانجام دے گا، اسی قدر خطابت کی خوبی بڑھے گی۔ Merrium Webster لغت کے مطابق:

"The art of speaking or writing effectively".(۹)

سٹین فورڈ کے مطابق ارسطو فنِ خطابت کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے کہ

> "Aristotle defines the rhetorician as someone who is always able to see what is persuasive (Topics VI.12, 149b25). Correspondingly, rhetoric is defined as the ability to see what is possibly persuasive in every given case."(۱۰)

ارسطو کے مطابق خطیب وہ ہے جو ہمیشہ یہ دیکھنے کے قابل ہو کہ ترغیب کیسے دی جاسکتی ہے؟ یا محرک کیا ہے؟ خط و کتابت میں فنِ خطابت ایسی صلاحیت ہے جو ہر دیے گئے امر کے ممکنہ محرکات کو دیکھ اور سمجھ سکتی ہے۔ یعنی خطابت کے ذریعے کسی بھی منظر، مسئلے، نظریے، رویے یا واقعے کے محرکات معلوم کیے جاسکتے ہیں۔ پھر ان محرکات کے ذریعے سامعین یا قارئین کے اندر مطلوبہ دعوے کی ترغیب یا ترہیب پیدا کی جاتی ہے۔ ایک اور جگہ ارسطو کے نظریہ فنِ خطابت کو ان الفاظ میں قلم بند کیا گیا ہے:

> "According to Aristotle, rhetoric is: "the ability, in each particular case, to see the available means of

persuasion." He described three main forms of rhetoric: Ethos, Logos, and Pathos."(۱۱)

ارسطو کے مطابق فنِ خطابت ایک صلاحیت ہے جو ہر مخصوص امر میں محرکات یا سامعین کے جذبات برانگیخت کرنے کے ذرائع دیکھتی، سمجھتی اور نافذ کرتی ہے۔ ارسطو نے فنِ خطابت کی تین بنیادی اور مرکزی اقسام بتائی ہیں: اخلاقیات یاEthos، دلائل یاLogosاور جذبات یاPathos۔

"Rhetoric refers to the study and uses of written, spoken and visual language. It investigates how language is used to organize and maintain social groups, construct meanings and identities, coordinate behavior, mediate power, produce change, and create knowledge. Rhetoricians often assume that language is constitutive (we shape and are shaped by language), dialogic (it exists in the shared territory between self and other), closely connected to thought (mental activity as "inner speech") and integrated with social, cultural and economic practices."(۱۲)

فنِ خطابت مطالعہ و پڑھائی اور تحریری، تقریری اور بصری صلاحیتوں کے استعمال کا نام ہے۔ یہ اس بات کا کھوج لگانے میں معاونت کرتی ہے کہ ایک زبان سماجی گروہوں کو منظم اور قایم کرنے، ان کے مطالب و مدعا اور پہچان کی تعمیر میں، سب کے رویوں کو یکساں رکھنے، قوت و طاقت کو متوازی رکھنے، تغیر لانے اور علم بنانے میں کس قدر معاون ہے۔

## 1.1: اقسامِ خطابت:

### I: خطابت کی اقسام بہ لحاظ نوع:

خطابت کو بہ اعتبار نوع چار اقسام میں منقسم کیا جاتا ہے: خطابت مکتوبی، خطابت بالحفظ، خطابت اعدادی اور خطابت ارتجالی۔ خطابت مکتوبی سے مراد وہ خطابت ہے جسے تقریر سے قبل تحریر کر لیا جائے۔

موضوع سے متعلق تمام خیالات اور معلومات کو منضبط کر کے قرطاس کے سپرد کر دیا جائے۔ الفاظ اور جملوں کا انتخاب، خیالات کی ترتیب، معلومات کی تنظیم اس موثر پیرائے میں تحریر کر لی جاتی ہے جو سامعین کی سماعتوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خطابت کا یہ ذریعہ اظہار اس لیے ناقص ہے کہ مقرر کو بر موقع اور بر محل اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ سامعین کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی سبق یا مضمون پڑھ رہا ہے۔ رجائیت کے بجائے یہ ذریعہِ اظہار قنوطیت اور بوریت کا باعث بن جاتا ہے۔ اغلاط و اسقام سے بچنے کے لیے حالیہ مقررین سیاسی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر اس قسم کی خطابت کو ترجیح دیتے ہیں اور فی الوقت اس کا رواج بھی بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ایسی تقاریر بر جستگی اور اثر آفرینی کی حامل نہیں ہوتی ہیں۔

خطابت بالحفظ سے مراد وہ خطابت ہے جس کو تحریری قوت کے بجائے ذہنی طاقت کے بل بوتے پر تیار کیا جاتا ہے اور بعد ازیں سامعین کے سامنے رٹی ہوئی تقریر دہرا دی جاتی ہے۔ خطابت مکتوبی اور خطابت بالحفظ میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ بھی پہلے تیار کردہ تقریر ہوتی ہے جو من و عن سامعین کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ یہ تقریر بے رنگ، سرد، بے کیف اور غیر فطری تو ہوتی ہے لیکن اگر کہیں کوئی فقرہ یا جملہ لکنت کی وجہ سے یا سبقت لسانی کی وجہ سے رہ جائے تو پوری تقریر میں بے ربطی پیدا ہو جاتی ہے۔ رٹی رٹائی تقاریر کرنے والے مقررین خود اعتمادی اور آزادی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتے ہیں۔ خطابت کے لیے ضروری ہے کہ مقرر فطری میلان کا حامل ہو۔ اگر قدرت نے اسے فطری ذوق و شوق ودیعت کیا ہے تو اس کی زبان بھی دل کش، شستہ، شائستہ اور رواں ہو گی۔ خطابت کی حدت اس میں ایسا اندازِ بیان تخلیق کرے گی، جو نہ صرف موثر ہو گا بلکہ مقرر، سامعین اور خود خطابت کے لیے بھی مفید اور معاون ہو گا۔ وقتی ولولے کے تحت جب کوئی مقرر تقرر کرتا ہے تو اس کی بات زیادہ فطری محسوس ہوتی ہے، آساں بھی ہوتی ہے اور سامعین کے لیے قابلِ تفہیم بھی۔ خود مقرر کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کی تقریر عوام کے قلوب و اذہان میں اتر رہی ہے یا ان کے سروں پر سے گُزر رہی ہے۔ اس کی بہ نسبت خطابت بالحفظ کے حامل مقررین اپنا حلقہِ اثر وسیع نہیں کر سکتے ہیں۔ ان تمام مسائل اور قباحتوں کے باوجود نو آموز مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ خطابت مکتوبی یا خطابت بالحفظ کی باقاعدہ مشق کرے۔ ابتدا میں ان اقسام سے استعانت کی بہ دولت مجمع کا رعب و دبدبہ ذہن و دل سے محو ہو جاتا ہے، لوگوں کا سامنا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ ان اقسام کو اپنا کر ایک نو آموز کامیاب مقرر بن سکتا ہے۔

خطابت اعدادی انواعِ خطابت میں اس خطابت کو کہتے ہیں جس میں خطیب یا مقرر اپنے موضوع سے

متعلق مواد اور معلومات جمع کر کے تقریر سے قبل اک ذہنی خاکہ تیار کرتا ہے، اسے نکات کی صورت میں کسی کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ لیتا ہے اور پھر دورانِ تقریر وقتاً فوقتاً اسے دیکھتا رہتا ہے۔ کامیاب مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ کسی سہارے کا محتاج نہ ہو، کیوں کہ اس سے تقریر کی اثر انگیزی میں خلل واقع ہوتا ہے۔ ضروری ہے کہ خطیب یا مقرر سامعین کی پیشانیوں سے اپنا موضوع تلاش کرے، ان کی منشا، طلب اور ضرورت کے تحت اپنی تقریر کو آگے بڑھاتا جائے اور ان کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی خطابت کے جوہر دکھائے۔

خطابت ارتجالی وہ نوعِ خطابت ہے جو نہ تو خطابت مکتوبی کے تحت آتی ہے، نہ ہی خطابت بالحفظ یا خطابت اعدادی کی ذیل میں آتی ہے۔ اس میں مقرر بغیر کسی تیاری کے برجستہ و برمحل اپنی معلومات اور مطالعہ کے بل بوتے پر تقریر کرتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مقرر کے پاس مناسب اور موثر ذخیرہ الفاظ ہو، اس کی معلومات کا دائرہ وسیع ہو، مختلف علوم پر اس کی خاطر خواہ دسترس ہو تاکہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ فی البدیہہ خطابت کے لیے تقریر سے قبل کوئی تیاری نہیں کی جاتی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ بغیر کسی سوجھ بوجھ اور معلومات کے کسی موضوع پر تقریر شروع کر دی جائے۔ فی البدیہہ تقریر میں موضوع سے زیادہ مقرر کا اسلوبِ بیان اہمیت رکھتا ہے۔ مقرر کو موضوع کی تیاری کا باقاعدہ موقع میسر نہیں آتا ہے، اس لیے وہ اپنے تجربے اور سابقہ مطالعے کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ اگر معلومات میں کمی بھی ہو تو اسلوبِ بیان کا حُسن اسے پورا کر دیتا ہے۔ ارتجالی تقریر کرنے والے مقررین کہنہ مشق ہوتے ہیں۔ ترتیبِ مضامین اور انتخابِ الفاظ میں ایسی سلیقہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہر موضوع کو بیّن اور منطقی انداز میں بہ خوبی اور بہ آسانی پیش کر دیتے ہیں۔ خطابت کی دیگر اقسام سے یہ قسم سامعین کو زیادہ متاثر کرتی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے تمام مواعظ میں جو تاثیر اور قوت پائی جاتی تھی وہ ارتجالی خطابت کا مظہر تھی۔ ان ﷺ کی تقاریر کسی مسودے کی اعانت سے تیار نہیں کی جاتی تھیں بلکہ خلوص، تیقّن اور اصلاح و فلاحِ امت کے جذبے کے تحت ہوتی تھیں۔

## II: خطابت کی اقسام بہ لحاظ موضوع:

موضوع کے اعتبار سے خطابت کو جن حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ دینی خطابت

۲۔ علمی خطابت

۳۔ سیاسی خطابت

۴۔ سماجی خطابت

۵۔ کاروباری خطابت

۶۔ عسکری خطابت

محولہ بالا خطابت کی تمام اقسام میں دینی خطابت کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اس میں بہ حیثیت مجموع انسان سے خطاب کیا جاتا ہے۔ اس کا حلقۂ اثر وسیع اور آفاقی ہے۔ مذاہب کی ترویج و اشاعت دینی خطابت کی بہ دولت ہی ہوتی ہے۔ مذکورہ خطابت کی ذیل میں تبلیغی خطابت، عیدین وجمعہ کے خطبات، مواعظ، کتھا، ذکرِ میلاد، ذاکری، مناظرہ اور مذہب سے متعلقہ تمام رسمی خطبات آتے ہیں۔

جامعات، مدارس اور کتب میں علمی خطابت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ درس و تدریس ہدایت و نصیحت، علمی و فنی مسائل کی تحقیق و تنقید، معلومات کی ترویج اور سامعین میں غور و فکر اور تحقیق و جستجو کو برانگیخت کرنے کے لیے جن موضوعات پر تقاریر کی جاتی ہیں، وہ علمی خطابت کی ذیل میں آتی ہیں۔ علمی خطابت ہی کی ذیل میں مباحثہ بھی آتا ہے۔ مباحثہ دراصل دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے مابین کسی موضوع پر بحث کرنے کا نام ہے۔ یہ انتہائی مفید اور قدیم عمل ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی افادیت اور اہمیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، عوامی اور جامعاتی سطح پر مختلف موضوعات پر مباحث کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مباحثے میں دلائل و براہین سے دونوں فریقین کسی ایک موضوع کے حق میں یا مخالفت میں گفتگو کرتے ہیں۔ خطابت میں مہارت کے لیے ضروری ہے کہ اس عمل سے گُزرا جائے کیوں کہ اس سے فی البدیہہ خیالات اور زورِ بیان کے کمالات میں حُسن پیدا ہوتا ہے۔

ریاست اور اس کے نظام سے متعلق جو تقریر کی جاتی ہے، وہ سیاسی خطابت کی ذیل میں آتی ہے۔ بین الاقوامی اور ملکی معاملات، حکومت کی عوام سے بات چیت، ایوانوں میں ہونے والے مباحث و تقاریر، حکومت اور اپوزیشن کے باہمی معاملات، پارلیمانی اور عوامی ربط اسی سیاسی خطابت کی بہ دولت ممکن ہوتا ہے۔ خطابت کی اس قسم کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ہے۔ بعض اوقات ایسے معاملات بھی ایک سیاسی مقرر کی تقریر سے حل ہو جاتے ہیں، جو طویل جنگ و جدل سے حل ہونا بھی مشکل نظر آتے ہیں۔ اس قسم کی تقریر میں الفاظ و محاورات کا استعمال نہایت سوچ سمجھ کر کیا جاتا ہے تاکہ کوئی سیاسی مخالف گرفت نہ کر سکے۔ اگر اس طرح کی کوئی غلطی سر زد ہو بھی جائے تو سیاسی مقررین عوام سے براہ راست مخاطب ہو کر کوئی نئی تاویل پیش کر دیتے ہیں۔

سماجی خطابت سے مراد وہ خطابت ہے، جس میں سماج کے تمام مسائل و وسائل کو پرویا جاتا ہے۔ مختلف تقریبات، تہذیبی، ثقافتی، تعزیتی، تحسینی اور الوداعی اجلاس میں خطابت کی اسی نوع سے معاونت حاصل کی جاتی ہے۔ مختلف اقوام میں کھانے کے بعد تقاریر کرنے کی باقاعدہ رسم موجود ہے، یہ رسم روم سے شروع ہوئی۔ اہلِ روم کھانے کے بعد اپنے مہمان کے اعزاز میں مے کے اندر روٹی کا ٹکڑا بھگو کر اس کے لیے دعا کا اہتمام کرتے تھے اور اس کے بعد اس کی تکریم میں چند الفاظ پیش کرتے تھے۔ اہلِ روم نے انگلستان پر حملہ کیا تو دیگر رسوم کی طرح یہ رسمِ ضیافت بھی انگلستان کے سماج تک پہنچی۔ وقت کے ساتھ یہ ہلکی پھلکی رسم ضیافتوں کا لازمہ بننے لگی اور کئی دیگر ممالک میں پھیل گئی۔ چند تکریمی جملوں سے بڑھ کر یہ باقاعدہ گھنٹے بھر یا اس سے زیادہ دورانیہ کی ایک اچھی خاصی تقریر میں ڈھل گئی، اسے ضیافتی خطابت کہا جانے لگا۔ مغربی ممالک کے علاوہ کئی مشرقی ممالک میں بھی اس قسم کی خطابت کا رواج رہا ہے۔ سرزمینِ ہندوستان پر ابتداً یہ خطابت انگریزی زبان تک ہی محدود تھی، مگر جیسے جیسے اس کا رواج بڑھا، ملکی اور علاقائی زبانوں میں بھی اس قسم کی خطابت کا باقاعدہ اہتمام نظر آنے لگا۔ یہ خطابت نجی یا پرائیویٹ ہوتی ہے، پُر تکلف ضیافت اور بے تکلف دعوت کے بعد اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پُر تکلف ضیافت میں چوں کہ دعوت کے تمام مندرجات پہلے سے طے شدہ ہوتے ہیں، لہٰذا کھانے کے بعد کی تقریر اور اس کا موضوع بھی پہلے سے طے کر لیا جاتا ہے۔ تاہم بے تکلف ضیافت میں ارتجالاً اس خطابت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس خطابت کی نگرانی کرنے والے کو ٹوسٹ ماسٹر (TOAST MASTER) کہا جاتا ہے۔ پُر تکلف ضیافت میں ٹوسٹ ماسٹر بھی پہلے سے منتخب کردہ ہوتا ہے مگر بے تکلف ضیافت میں اس کا انتخاب بھی عین خطابت کے وقت کیا جاتا ہے۔ ضیافتی خطابت میں وقت کو ملحوظ رکھنا ناگزیر ہے۔ برمحل گفتگو، سامعین کی دل چسپی کے موضوعات، انداز اور اختصار اس کے بنیادی خصائص ہیں۔ ضیافتی مقرر کو ان بنیادی لوازمات کو ملحوظ رکھ کر تقریر کرنی چاہیے۔ چوں کہ اس خطابت کا اہتمام حاضرین کو خوش کرنے اور دعوتی حسن کو بڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے لہٰذا مقرر کے لیے ان مقاصد کو ملحوظ رکھنا بھی لازم ہے۔ تعزیتی خطابت بھی سماجی خطابت کا اہم پہلو ہے۔ مرنے والے کی یاد میں تعزیتی جلسے یا تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے جلسوں میں مرنے والے کی وفات پر اظہارِ غم و ملال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں مرنے والے کے حالاتِ زندگی پر تقاریر کی جاتی ہیں؛ یہ خطابت ہر سماج کا جزو ہے۔ سماجی خطابت کی ذیل میں ایک اور طرزِ خطابت یعنی تہنیتی خطابت بھی شامل ہے، یہ تعزیتی خطابت کے برعکس ہے۔ کسی خوشی کے موقع پر ایسی محفل کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد و مدعا اظہارِ انبساط ہے۔ کسی شخصیت کے خیر مقدم

کے لیے، شادی، سال گرہ یا کسی پر مسرت موقع پر تقاریب منعقد کی جاتی ہیں، جن میں موقع کے اعتبار سے تقاریر کا اہتمام ہوتا ہے۔ وداعی تقاریر کسی معزز شخصیت کے وقتِ وداع پر کی جاتی ہیں۔ اس میں بچھڑنے کا غم، سفر کی خیریت کی دعاؤں اور نیک تمناؤں کا اظہار کیا جاتا ہے۔

تاجر برادری کے اجلاس میں کی جانے والے مباحث اور عدالتی تقاریر کاروباری خطابت کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس کا بنیادی وصف یہ ہے کہ اس میں اختصار اور حقائق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یہ عموماً جذباتیت سے پاک ہوتی ہیں۔ کاروباری خطابت اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ معاشرے کا ہر فرد کسی نہ کسی کاروبار یا ملازمت سے وابستہ ہے۔ زندگی جینے کے لیے بنیادی ضروریات کی تکمیل لازمی ہے اور بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لیے ملازمت یا کاروبار ناگزیر ہے۔ ہر کاروباری یا ملازمت پیشہ شخص اپنی صلاحیت و اہلیت کو مترشح کر کے خاطر خواہ تاثر و طاقت کے حصول کا متمنی ہے۔ مقصدِ مذکورہ کے لیے اسے خطابت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جس قدر وہ فصیح البیان ہو گا اسی قدر بذریعہ خطابت وہ اپنی صلاحیت کا لوہا منوا سکے گا۔ اپنی صلاحیت کی تشہیر کے لیے اسے بہر حال ایک اچھی زبان، اچھے لہجے اور اچھی ادائیگی کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت خطابت پورا کرتی ہے، اسی کی ذیل میں عدالتی خطابت بھی آتی ہے۔ اس خطابت کا دائرہ کار کمرہِ عدالت ہے۔ تاہم اس کے نتائج پورے سماج کے سامنے آتے ہیں۔ اس اعتبار سے اس کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔

عسکری خطابت میں وہ تقاریر شامل ہیں جو افواج اور عساکر میں دورانِ جنگ ولولہ اور جوش و جذبہ پیدا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں کہ سالارِ لشکر اپنی بروقت اور پُر جوش عسکری خطابت سے اپنی فوج میں ایسی نئی روح پھونکتا ہے جو ان میں ایک ان دیکھی طاقت پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ ایسی کئی ولولہ انگیز اور دل گیر عسکری تقاریر نے ہاری ہوئی جنگوں کا پانسہ پلٹا۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسی منفرد اور شان دار تقاریر سے بھری پڑی ہے۔ بدر و حنین کے معرکوں سے لے کر رانا سانگا کی ٹڈی دل فوج کے ساتھ صف آرائی تک ہر میدان میں عسکری قلت کے باوجود انھی جنگی تقاریر نے مسلمانوں کو فتح یاب کیا۔ نپولین کی وہ عسکری تقریر بھی صرفِ نظر نہیں کی جاسکتی ہے جس نے ایک تھکے ماندے لشکر کو پھر سے جیت کا جذبہ دیا۔ چوں کہ اس خطابت کا مقصد عساکر میں جذبوں کو بیدار کرنا ہوتا ہے، لہٰذا یہ مادی لالچ یا عنصر سے یکسر پاک ہوتی ہے۔ عسکری مقرر اپنے لشکر کو اصولوں، عقائد اور ایمان کے تحت عمل پر ابھارتا ہے، آنے والی مشکلات اور خطرات کو واضح طور پر ان کے سامنے عیاں کرتا ہے اور پھر ان خطرات سے نبٹنے کے لیے قوتِ شجاعت کو بروئے کار لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس خطابت میں جوش اور جذبہ سب سے اہم ہے۔ ایجاز و

اختصار کے ساتھ ایسے جامع اور بھرپور الفاظ کا استعمال جو لوگوں میں جوش، جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے کا موجب ہوں، اس خطابت کے لوازم ہیں۔ نیز اندازِ خطابت بھی پُرجوش اور جذبات برانگیخت کر دینے والا ہو۔

## III: خطابت بہ لحاظ مقصود:

مقصد و مدعا کے لحاظ سے خطابت کی چار اقسام ممکن ہیں: ترغیبی خطابت، ترہیبی خطابت، تائیدی خطابت اور اختلافی خطابت۔ ترغیبی خطابت کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ سامعین و ناظرین کو ایک خاص نظریے، سوچ، مقصد یا تحریک کے متعلق مثبت معلومات دے کر ان کی توجہ اس طرف راغب کی جائے۔ زیرِ خطابت موضوع کے حق میں دلائل و براہین کے ذریعے ان کے قلب و ذہن میں مطلوبہ فکر و نظریہ کو راسخ کر کے انھیں اس کا حامی بنایا جائے۔ یعنی، کسی نظریے یا مقصد کی ترغیب دینا، ترغیبی خطابت کا مقصد و مدعا ہے۔ ترہیبی خطابت اس کے بالکل برعکس ہے۔ ترہیبی خطابت میں کسی نظریے یا مقصد کے کم زور پہلوؤں کو واضح کر کے اس کو اپنانے اور اس کی ترویج سے روکنا مقصود ہوتا ہے۔ تائیدی خطابت میں کسی نظریے کی تائید کرنا مقصودِ تقریر ہوتا ہے، جب کہ اختلافی خطابت ایسے موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، جن میں کسی مقصد، مدعا، تحریک یا نظریے سے اختلاف کرنا مقصود ہو۔ بہ اعتبار موضوع خطابتِ مقصودی کی یہ چاروں انواع دینی، سیاسی، علمی، کاروباری، سماجی یا عسکری ہو سکتی ہیں۔ بعینہٖ، نوع کے اعتبار سے یہ اعدادی، ارتجالی، بالحفظ یا مکتوبی ہو سکتی ہیں۔

## 1.2: خطابت کی تاریخ اور ارتقا:

خطابت کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی، جب انسان نے قوتِ ناطقہ کو بروئے کار لایا۔ اسی شخص کو اولین خطیب یا مقرر کہا جا سکتا ہے، جس نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین اور سامعین سے خطاب کیا یا اپنے مافی الضمیر کا اظہار ان کے سامنے کیا۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خطابت انسان کی گویائی کے ساتھ وجود میں آئی۔ خطابت کی ابتدا انسان کی تخلیق سے قبل ہو چکی تھی، جس کی دلیل ہمیں قرآن مجید سے ملتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ روحوں سے مخاطب ہوئے، ان سے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے؟ "الست بربکم؟"(۱۳) قرآن کریم کی یہ آیت ثابت کرتی ہے کہ پہلا خطیب خود رب کائنات ہے اور سامعین انسانی ارواح، جن کے جسم ابھی تشنہ تخلیق تھے۔ اس کے بعد جب انسان کی تخلیق ہوئی اور اس نے اپنی قوتِ گویائی کو استعمال کیا تو خطابت انسانوں بھی میں منتقل ہوئی۔ کوئی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ خطابت ہی کے ذریعے ابلاغ کی ابتدا ہوئی۔ اللہ نے انسانوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے خطابت ہی کو ذریعہِ اظہار بنایا۔ بعد ازیں، جو بھی اللہ تعالیٰ کا پیام بر

بنا کے انسانوں میں مبعوث کیا گیا، اسے بھی قدرت نے فصاحت و بلاغت سے نواز کر خطابت کی بہ دولت لوگوں تک پیغامِ الٰہی پہنچانے کی توفیق دی۔ ان پر جو کتب نازل کی گئیں ان میں بھی جو انداز اپنایا گیا، وہ بھی خطیبانہ ہے۔ تحریر کی ابتدا سے قبل تقریر ہی مقصد و مدعا کے اظہار کا ذریعہ رہی ہے۔ فنِ خطابت کو قدیم زمانہ ہی سے اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ اس وقت تحریر کا رواج نہ تھا۔ خطابت ہی کے ذریعے لوگوں تک بات پہنچائی جاتی تھی۔ یونان میں ارسطو سے قبل ہر فلسفی نے یہی طریقہ کار اختیار کیا۔ سوفسٹس خطابت کی وجہ سے اس زمانے میں بہت مقبول ہوا، اس کا حلقہ اثر بہت وسیع تھا۔ تاریخِ انسانی میں سب سے پہلے یہی لوگ تھے جنھوں نے معاوضے کے عوض اس فن کی تعلیم دینا شروع کی۔ سوفسٹس اس فن کو سیکھنے کی باقاعدہ ترغیب دیتا تھا۔ حلقۂ اثر وسیع ہونے کی وجہ سے لوگ اس کی بات کو تسلیم کرتے تھے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ فنِ خطابت میں مہارتِ تامہ حاصل کیے بغیر امورِ ریاست میں کسی شخص کو اہم منصب پر نہیں بٹھایا جا سکتا ہے۔ وہ شخص کوئی عہدہ حاصل کرنے کا اہل نہیں ہے، جس کا دامن خطابت سے تہی ہے۔ اس نے اس حوالے سے جو تحریک چلائی، وہ خاصی کام یاب ہوئی۔ لوگوں میں فنِ خطابت سیکھنے کی رغبت اور محبت پیدا ہوئی، اس لیے اس عہد میں ہر شخص یہ فن سیکھا کرتا تھا۔ سوفسٹس کے بعد سقراط نے اس فن کو ایک نئی شکل دی۔ وہ دورانِ تقریر استفہامیہ انداز اپنا لیتا، اپنے مدعا و مقصد کے بیان کے ساتھ ساتھ سامعین سے موضوع سے متعلق سوال کرتا، کبھی خود جواب دیتا، کبھی سامعین سے اس کی توقع کرتا، غرض اس کی خطابت میں سوال و جواب ایسے بر موقع اور بر محل ہوتے جیسے انگوٹھی میں نگینے۔ اس کے انداز نے خطابت کے حُسن کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس میں اضافہ کیا۔ بعد از سقراط اس کے معروف شاگرد افلاطون نے خطابت کو ذریعۂ تدریس بنایا، مگر اس کے ساتھ تحریر کی بھی مدد لی۔ افلاطون نے خطابت کے متعلق رائے دیتے ہوئے کہا کہ اس فن کی بدولت عوام پوری توجہ اور انہماک سے بات سنتی ہے۔ ایسا خطیب جو فنِ خطابت میں مہارت تامہ نہیں رکھتا وہ کبھی بھی عوام کو متحد نہیں کر سکتا، مجمعے کو کنٹرول میں لے کر اپنی مرضی و منشا کے مطابق ان سے کام نہیں لے سکتا۔ ناتجربہ کار خطیب کی وجہ سے ایک متحرک مجمع بھی منجمد اور متحد لوگ بھی جلد منتشر ہونے لگتے ہیں، اس لیے خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس فن میں کامل دسترس حاصل کرے تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکے۔ افلاطون کے بعد اس کے مایہ ناز شاگرد ارسطو نے اکیڈمی کے زمانے میں اس فن میں مہارت حاصل کی اور اس حد تک حاصل کی کہ اس نے اس کے جملہ معائب و محاسن کو طشت از بام کیا، اس فن کو نفیرِ عام کیا۔ اس فن کا تعارف

کرواتے ہوئے وہ رقم طراز ہے کہ "خطابت ایک ایسا فن ہے جو کہ دانش مندی سے بتاتا ہے کہ کون سی چیز اثر کرنے والی ہے اور
کون سی نہیں۔"(۱۴)

یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس فن کے متعلق با قاعدہ ایک کتاب "ریطوریقا" (فنِ خطابت) تحریر کی، لیکن اس کے دائرہ کار کو کافی محدود رکھا۔ اپنی اس تصنیف میں اس نے اثر پذیری کو عمومی بیان نہیں کیا۔ اس نے زیادہ زور عوامی تقاریر کی اثر پذیری کے بیان پر دیا ہے۔ ارسطو نے مختلف مواقع پر کی جانے والی تقاریر کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے، اس نے ان تقاریر کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے: سیاسی تقریر، عدالتی تقریر، رسوماتی تقریر۔ تقریر کی مذکورہ تینوں اقسام کو پیش کرنے کے انداز بھی مختلف ہیں۔ اگر کوئی شخص سیاسی موضوع پر تقریر کر رہا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی تقریر کی ابتدا اور انتہا ریاست اور اس کے تمام متعلقات کا احاطہ کرنے والی ہو۔ وہ تمام امور اس کی تقریر کا حصہ ہوں، جن کی بہ دولت ریاست فائدہ حاصل کر سکتی ہے نیز وہ امور بھی شاملِ مضمون ہونے چاہئیں جو ریاست کے لیے مضر ہیں۔ اگر تقریر عدالت میں کی جا رہی ہو تو مدعا و مقصد انصاف کا حصول ہوتا ہے، اس وقت ان تمام دلائل کو بروئے کار لانا چاہیے جن کی وجہ سے فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق لیا جا سکے۔ اگر کوئی مقرر کسی رسم کے موقع پر تقریر کر رہا ہے تو اس کو اس رسم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات لوگوں تک پہنچانی چاہیے۔ اگر وہ رسم قابلِ تعریف ہے تو اس کی تحسین کرنی چاہیے؛ اگر وہ قابلِ مذمت ہے تو اس کی مذمت بیان کرنی چاہیے۔ مختلف مقامات پر کی جانے والی تقاریر کے متعلق مقرر کے پاس مکمل معلومات ہونی چاہئیں۔ جب تک ان موضوعات پر کی جانے والی تقاریر کے متعلق اس کے پاس علم نہیں ہو گا تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے۔ ارسطو کی یہ کتاب عمومی کی جانے والی تقاریر کو موثر بنانے کے اصول بیان نہیں کرتی ہے، تاہم مذکورہ مواقع پر کی جانے والی تقاریر کو پُر تاثیر بنانے کے لیے تفصیلاً بحث کرتی ہے۔ ارسطو نے اس فن کے سیکھنے کے متعلق یوں رائے دی ہے کہ اس کو وہی لوگ سیکھیں جو اس فن سے فائدہ حاصل کر سکیں اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کریں۔ فنِ تقریر میں مہارت انھی لوگوں کو حاصل کرنی چاہیے، جن کا واسطہ عموماً ایسے طبقوں سے پڑتا ہے جن میں مختلف شعبوں اور عمروں کے لوگ شامل ہوتے ہیں، لیکن اگر شعبہِ تدریس میں دیکھا جائے تو یہاں استاد کو خطابت کی ضرورت زیادہ تر پیش نہیں آتی۔ مثلاً ایک جیومیٹری پڑھانے والے استاد کے لیے خطابت کی کوئی ضرورت نہیں۔

یونان کی ایک ریاست 'سی کورس' کے ایک باشندے کوراکس نے اس فن کو بہ طور مضمون اختیار کیا۔ اس نے اس فن کو پانچ حصوں میں منقسم کیا: آغاز، وضاحت، دلائل، ضمنی تفصیلات اور اختتام۔ بعد از کوراکس اس کے تربیت یافتہ متعلم ٹسی ایس نے اس فن کی ترویج اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں، لسی ایس نے اس کو مزید وسعت بخشی۔ اس موضوع پر جس شخص نے بھی قلم اٹھایا، اس نے 'ریطوریقا' سے ضرور خوشہ چینی کی۔ یونان کی ایک نامی گرامی شخصیت پائی سٹریس بھی تھا، جو وسائل کی کمی کے باوجود اپنی صلاحیتوں کا بر موقع و بر محل استعمال کر کے بہت جلد مشاہیر میں شامل ہو گیا۔ یہ معروف فلسفی سولن (Solan) کا معاصر تھا۔ تقریر پر اسے کامل دسترس حاصل تھی، اسی فن میں مہارت کی بہ دولت اس نے تقریباً چالیس برس تک یونان پر مضبوط و مستحکم حکومت کی۔ یہ تقریر کرنے سے قبل اپنے تمام خیالات کو قرطاس کے سپرد کر دیتا تھا۔ یہی وہ پہلا شخص تھا، جس نے تقریر سے قبل موضوع سے متعلق نکات منظم طریقے سے ضبطِ تحریر میں لانے کی داغ بیل ڈالی، یہی وجہ تھی کہ اس کی تقریر مربوط اور موثر ہوتی تھی۔ وہ نباضِ فطرتِ انسانی ہونے کے ساتھ خطیبِ منبرِ سحر بیانی بھی تھا۔ یونان کے معروف مقررین میں ڈیموستھینز (Demosthenes) کا نام بھی نمایاں ہے۔ اس کو قدرت نے ایسا صوتی حسن عطا کیا تھا کہ اس کی باتیں دل میں گھر کر جاتی تھیں، حالاں کہ اس کے سیاسی حریفوں میں بھی ایس چینس (Aes Chines) بھی شامل تھا، جو بہ ذات خود ایک بڑا مقرر تھا۔ مگر کبھی بھی ڈیموستھینز کا مقابلہ نہیں کر سکا تھا۔ علاوہ ازیں، اس فن میں اسی ایس (Isias) نے بھی نام پیدا کیا۔ یہ اگرچہ ڈیموستھینز کا اتالیق تھا لیکن ڈیموستھینز قدرتی صلاحیتوں کی بنا پر اسی ایس کو خطابت میں پیچھے چھوڑ گیا، محنت سے یونان کے خطیبِ اعظم کے درجے تک پہنچا۔ یونان کی آزادی میں ڈیموستھینز نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یونان کو جب اہلِ روما نے فتح کیا تو اس وقت سسرو (Cicero) نمایاں خطیب کے طور پر ابھرا۔ اہلِ روما کا یہ فن سسرو کی حیات تک محدود رہا اور ان کی آزادی بھی سسرو کی زندگی سے وابستہ تھی۔ بعد ازیں، جمہوریت کی جگہ آمریت پنپنے لگی۔ عوام الناس ایک بار پھر روحانیت اور مذہب کی طرف راغب ہوئے۔ خطبا کی جگہ واعظین کو اہمیت دی جانے لگی۔ کچھ صدیاں گزرنے پر، امتدادِ زمانہ کے ساتھ فنِ خطابت میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی، یہاں تک کہ خطابت کو سیاسی حقوق کے حصول کا ذریعہ گردانا جانے لگا۔ خطابت کے ذریعے اس دور کی اقوام کی طرف سے اپنی تہذیبی و تمدنی برتری ثابت کرنے کی بھی کوششیں کی جاتی رہیں۔ عیسیٰؑ کے مبعوث ہونے تک خطابت ترقی کی منازل طے کر چکی تھی۔ اس زمانے میں نام ور خطبا میں پطرس اور پولس شامل ہیں، جن کے خطبوں کے مجموعے پانچ جلدوں میں اب بھی محفوظ ہیں۔ اہلِ روما کے

بعد جس قوم نے اس فن میں سب سے زیادہ امتیاز حاصل کیا، وہ عرب تھے۔ انھوں نے علوم وفنون کی ترویج میں کلیدی کردار ادا کیا۔ یونانیوں اور رومیوں کی مانند عربوں میں بڑے اور نام ور مقرر و خطیب پیدا ہوئے۔ اسلام سے قبل جن خطبا نے نام وری اور شہرت حاصل کی، ان میں کعب بن لوی، حرثان بن محرث، قیس بن خارجہ، خویلد بن عمر، اکثم بن صیفی اور سحبان بن وائل شامل ہیں۔ عربوں کے خطبا میں جو عزت سحبان کے حصے میں آئی، وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس کی مہارتِ خطابت ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی۔ عرب جب کسی مقرر کو بے حد داد دینا چاہتے تو یہ کہتے کہ "ھو اخطب من سحبان" یعنی وہ سحبان سے زیادہ بڑا خطیب ہے۔ سحبان اپنی تقریر کو موثر بنانے کے لیے اپنی تمام صلاحیتوں کو استعمال کرتا، اتنا جوشیلا اور جذباتی انداز اختیار کرتا کہ پسینے میں شرابور ہو جاتا۔ فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ کسی لفظ کی تکرار نہ کرتا تھا۔ اہلِ عرب فصاحت و بلاغت کے رسیا تھے، قدرت نے انھیں مافی الضمیر کے اظہار کی جو صلاحیت عطا کر رکھی تھی، اس نے ان کی خطابت کو چار چاند لگا دیے۔ ان کی شاعری اور خطابت کے جو نمونے ملتے ہیں، وہ ان کے کمالِ فن کی دلیل ہیں۔ ان کی خطابت کا یہ عالم تھا کہ ایک مقرر اور خطیب جب تقریر شروع کرتا تو ایک منجمد گروہ کو بھی ایسے متحرک کرتا کہ وہ بڑے سے بڑے مقصد کے حصول کے لیے تیار ہو جاتے اور اس کے لیے جدوجہد شروع کر دیتے تھے۔ وہ حقیقی معانی میں سلطانِ اقلیمِ الفاظ و معنی تھے۔ غرض، ان کی زندگی کا ہر شعبہ خطابت اور شاعری سے جُڑا ہوا تھا۔ انھیں قدرت نے اس حد تک کمالِ فن سے نوازا تھا کہ وہ اپنے علاوہ دیگر اقوام کو عجم کہتے تھے۔ عربوں کی تقاریر و خطابت کبھی طول پکڑتی اور کبھی اختصار کے پیرائے میں ڈھل جاتی لیکن اس کا لطف اور چاشنی ہمیشہ برقرار رہتی۔ وہ خطبہ دینے کے لیے بلند مقام کا انتخاب کرتے یا اونٹ پر سوار ہو جاتے تھے۔ عربوں کے ہاں خطیب کے اوصاف یہ تھے: فصاحت و بلاغت، شجاعت و سطوت، صوتی بلندی، کریم النفسی اور باعمل ہونا۔

سید کلبِ مصطفیٰ کی کتاب "فنِ خطابت میں درج معلومات کے مطابق عرب کے ایک سربرآوردہ مقرر قس بن ساعدہ زمانہ جاہلیت سے لے کر اسلام کے فروغ تک بقید حیات رہے۔ ان کی خطابت جملہ اوصاف سے متصف تھی۔ شستہ زبان، شگفتہ بیان، مربوط کلام، نادر تشبیہات و استعارات کا التزام اور علمی و ادبی واقعات کے انصرام کی وجہ سے ان کی تقریر کا لطف دو آتشہ ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ رسول کریم ﷺ نے بھی جب انھیں سماعت فرمایا تو ان کی فصاحت و بلاغت سے معمور خطابت کو سراہا۔ اسلام کی بعثت سے قبل عربوں میں خطبا کی نسبت شعرا کو زیادہ اعزاز و اکرام سے نوازا جاتا تھا۔ ان شعرا کی خصوصیت یہ تھی کہ بر

محل اور بر موقع ایسے نادر اور اچھوتے اشعار کہتے کہ سامعین کا دل موہ لیتے تھے، مگر جب اسلام کا فروغ شروع ہوا تو خطبا کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ اسلام کے فروغ میں خطابت نے اہم کردار ادا کیا۔ دعوتِ اسلام کے لیے خطابت ایک لازمہ تھی، اس لیے خطبا کی مانگ بڑھنے لگی۔ اچھے خطیبوں کی باقاعدہ تربیت کی گئی اور انھیں خطابت کے تمام اسرار و رموز سے آگاہ کیا گیا، جس کی بہ دولت خطابت میں بھی جدت اور ندرت پیدا ہوئی نیز خطابت اقتضائے حال کے مطابق ڈھل گئی۔ عربوں کی خطابت کا نمایاں وصف سچائی اور دلی جذبات کا برملا اظہار ہے۔ ان کی خطابت راست بازی کی آئینہ دار اور صداقت کی طرف دار ہے۔ اسلوبِ بیان سادگی، رعنائی اور بے تکلفی سے مملو ہو کر جیسے ہی خطیب کی زبان سے نکلتا تھا، ایسے ہی دلوں میں گھر کر جاتا تھا۔ خاتم النبیین، امام الانبیا حضرت محمد ﷺ کی شخصیت تمام محاسن کا عمدہ نمونہ تھی۔ آپ ﷺ بہترین خطیب اور مقرر بھی تھے۔ آپ ﷺ کی خطابت اور فصاحت و بلاغت کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ جب بھی کوئی گفتگو فرماتے، وہ اس قدر پُر کشش، جامع، مختصر اور اتنی من موہنی ہوتی کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداقِ اتم تھی۔ آپ ﷺ کا ہر کلام حکمت، ملائمت اور عزوبت سے معمور ہوتا تھا، کیوں کہ خدائے بزرگ و برتر کو "ما ینطق عن الھوی" (۱۵) کی عملی تفسیر کائناتِ انسانی کو بہ طور نمونہ دکھانی تھی۔ (۱۶) نبی رحمت ﷺ کے وصال کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بہترین خطیب کے طور پر سامنے آئے۔ آپؓ نے نہ صرف خلافت کا منصب سنبھالا، بلکہ خطابت میں بھی جانشینی کا پورا حق ادا کیا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ خلیفۂ ثانی منتخب ہوئے۔ انھیں قدرت نے بہت ساری خصوصیات ودیعت کر رکھی تھیں۔ ان خصوصیات کی وجہ سے ہی نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر (رضی اللہ عنہ) ہوتا۔ عمر رضی اللہ عنہ دیگر امور کی طرح خطابت میں بھی سب سے ممتاز و ممیز تھے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بھی خطابت کے شاہ سوارِ عظیم تھے۔ انھیں خطابت میں یہ مقام اس لیے ملا کیوں کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے اور موثر خطیب، خدا کے حبیب ﷺ کے تربیت یافتہ تھے۔ بعد ازیں، علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ خلافت کے منصبِ اعلا پر فائز ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ صرف باب العلم تھے، بلکہ انھیں اللہ نے منفرد بلاغت و خطابت سے نوازا تھا، جس کی زندہ اور روشن مثال "نہج البلاغہ" ہے۔

دورِ جاہلیت میں شاعری کو خطابت پر ترجیح دی جاتی تھی۔ اشاعتِ اسلام کے بعد صورت حال بدلتی چلی گئی۔ جیسے جیسے قرآن کریم کی معجز بیانی عام ہوتی گئی، ایسے ایسے داعیانِ اسلام کی زبان بھی فصاحت و بلاغت سے مملو ہوتی گئی۔ اس اندازِ بیان نے خطابت کو ایک نئی جہت دی۔ یہ اسلوبِ خطابت نہ صرف

سامعین کو پُر جوش اور ولولہ انگیز کرتا بلکہ انھیں مستقل مزاج بنا کر تحریکِ عمل سے سرفراز کرتا رہا ہے۔ خلفائے راشدین کے عہد اور اس کے بعد خطابت کے موضوعات حمدِ خدا، سیرتِ مصطفیٰ ﷺ، پند و نصیحت، ریاستی امور کی اصلاح، ترغیب و ترہیب، جہاد کا فروغ اور کارِ نمایاں کے لیے برانگیخت کرنے جیسے تحریکی عنوانات سے معنون ہوتے تھے۔ خطبا اور مقررین اپنی تقریر کی ابتدا خدا کی تعریف و توصیف سے شروع کرتے تھے اور پھر اپنے موضوع سے متعلق دلائل و براہین ایسے شستہ اور شگفتہ انداز میں پیش کرتے تھے کہ سامعین کے دل میں اتر جاتے۔ یہ وہ عہد تھا جب خطابت کی سیاسی وقعت میں اضافہ ہوا۔ اس میں وہ تمام محاسن شامل ہو گئے، جن کی بہ دولت خطابت بامقصد ہو گئی۔ اس عہد کو خطابت کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔

سید کلبِ مصطفیٰ کی کتاب "فنِ خطابت" کی معلومات کے مطابق تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ عربوں کے بعد یورپ میں بالخصوص فرانس، انگلستان اور امریکا میں خطابت ترقی کرنے لگی۔ یورپی خطابت میں اس وقت سلاست اور اظہارِ واقعہ عربی خطابت کی نسبت کم ہوتا تھا لیکن وسعتِ معلومات کی وجہ سے اہلِ یورپ اپنے مافی الضمیر کا اظہار اور تقاریر و خیالات کی ترتیب سہولت سے پیش کرتے تھے۔ فرانس کے ممتاز اور نمایاں مقررین میں باس وے (Bossuet)، وکٹر ہیوگو (Victor Hugo)، میرابو (Mirabeau)، والیٹر اور کلیمانسو (Clemenco) شامل ہیں۔ ان کے بعد اس فن میں فرانس کے سابقہ وزیر اعظم ایرس ٹایڈ بریان (Aris Tide Briand) جو خطابت میں اپنی نظیر آپ تھے، نمایاں ہو کر سامنے آئے۔

انگلستان کے معروف مقررین میں اڈمنڈ برگ (Edmund Burke)، سپر جن (Surgeon)، جارج وائیٹ فیلڈ (George Whitefield)، گلیڈ سٹن (Gladstone)، ڈزریلی (Disraeli)، لارڈ روز بری (Lord Rosebery)، لارڈ سالسبری (Lord Salsbury)، لائڈ جارج (Lioyd George)، لارڈ ایسکوئتھ (Lord Asquith) اور ونسٹن چرچل (Winston Churchil) کے نام نمایاں ہیں۔

امریکا کے ممیز خطبا میں ابراہم لنکن (Abraham Lincoln)، ہنری کلے (Henry Clay)، ڈینیل ویبسٹر (Daniel Webster)، ولیم جیننگز بریانڈ (William Jennings Briand)، ہنری وارڈ بیچر (Henry Ward Beacher)، ووڈ رو ولسن (Wood Row Wilson)، وارن جی ہارڈنگ (Warng Harding) اور روز ولٹ (Roose Velt) کے اسما سرِ فہرست ہیں۔ مغربی خطبا کی خطابت کا خاص وصف یہ ہے کہ وہ دقیق اور ثقیل الفاظ سے مبرا ہوتی ہے۔ سادگی، شگفتگی اور زود فہمی کا خاص خیال رکھا

جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، خیالات کی ترتیب اور جذبات کی تنظیم کا خصوصی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مغربی خطبا موقع و محل کی مناسبت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔

برصغیر صدیوں سے علم و فن، تہذیب و تمدن کا سرچشمہ رہا ہے۔ اس سرزمین نے بڑے بڑے مفکر علما، ادبا، شعرا، صوفیا، اتقیا اور صلحا کو جنم دیا۔ مختلف علوم و فنون اس دھرتی پر پنپتے رہے، لیکن خطابت تمام علوم و فنون پر اس لیے حاوی رہی کیوں کہ یہ اکثر علوم و فنون کے فروغ کا ذریعہ رہی ہے۔ اس لیے ہندوستان میں نام ور مقررین اور خطبا نے اپنے فن کی بہ دولت عزت و شہرت حاصل کی۔ ہندوستان میں جب انگریزوں کی آمد ہوئی تو یہاں کا منظر نامہ ہی بدل گیا۔ انگریزی تہذیب و ثقافت اور علم و ادب کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ خطابت پر بھی انگریزی خطابت اثر پذیر ہوئی۔ نام ور مقررین میں راجارام موہن رائے، کیشب چندر سین، دادابائی نوروجی، سریندر ناتھ بنرجی، گوکھلے، بدر الدین طیب جی، سی آر داس، بشن نرائن در، بھولا بھائی ڈیسائی، سری نواس شاستری، راجگوپال آچاری، ہردے ناتھ کنزرو، ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر ہادی حسین، محمد علی جناح، ڈاکٹر رادھا کرشن اور مولانا محمد علی جوہر ممیز ہیں۔ برصغیر کے حالات جب دگرگوں ہوئے، قانون ساز ایوانوں اور عوام کے درمیان کشیدگی اور پیچیدگی بڑھ گئی تو خطابت کو مزید فروغ ملا۔ سیاسی، اقتصادی اور مذہبی بیداری کی وجہ سے میدانِ خطابت میں وسعت آتی گئی۔ تحریکِ آزادی کے رہ نماؤں نے خطابت ہی کی بہ دولت ہندوستان کے کوچے کوچے میں انگریزی استبداد کے خلاف عوام کو ایسا متحرک کیا کہ ہر شخص آزادی کے حصول کے لیے انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ خطابت ہی کا کمال تھا کہ اتنے وسیع پیمانے پر ایک بڑے مدعا اور مقصد کو فروغ ملا۔ وہ واعظین اور مقررین جنھوں نے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا اور اسی زبان میں خطابت کے جوہر دکھائے، ان میں سر سید احمد خان، محمد حسین آزاد، محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت مدن موہن مالویہ، سر وزیر حسن، بہادر یار جنگ، سر رضا علی، سید حیدر مہدی، مولانا وحید الدین سلیم، سید کلب عباس، مولانا ابو الکلام آزاد، سید عطا اللہ شاہ بخاری، عبد الماجد دریابادی، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر علی خان، شورش کاشمیری، علامہ شبلی نعمانی اور الطاف حسین حالی کے نام نمایاں ہے۔ محولہ بالا متکلمین نے اپنے کلام اور احسن الخطابۃ کی بدولت قومی غیرت و حمیت کی بجھی ہوئی چنگاری کو ہوا دے کر شعلہ بنایا، اپنے شان دار ماضی اور عروج و زوال کے تذکرے سے ان کے دلوں کو گرمایا، حسد و نفاق کی آتش پر اخوت و مروت کا پانی چھڑکا۔ غرض، سارا سیاسی و سماجی منظر نامہ بدل کر رکھ دیا۔(۱۷)

خطابت عوام الناس کی عقول پر تسلط جمانے کا نام نہیں ہے، البتہ ان کے شعور و عقل کو جلا بخشنے، ان کے فہم و ادراک کو روشن کرنے کا نام ہے۔ خطابت در حقیقت حقائق کو اس انداز میں پیش کرنے کا نام ہے کہ وہ خوب صورت اور پر کشش پھولوں کا گلدستہ معلوم ہو۔ سامعین اور حاضرین کو مقرر یا خطیب کے الفاظ ایسے محسوس ہوں جیسے ایک ماہر جوہری قیمتی اور نادر جواہرات بکھیر رہا ہے اور سامعین کی سماعتیں آگے بڑھ کر انھیں چُن لیں۔ اس فن کی خوب صورتی یہ ہے کہ یہ زہر کو بھی اس انداز میں پیش کرے کہ وہ بصیرت اور سماعت کے لیے عزوبت سے معمور امرت معلوم ہو۔

" حکم ہے، سچ بھی قرینے سے کہا جائے، ندیمؔ
زخم کو زخم نہیں پھول بتایا جائے(۱۸)

امتدادِ زمانہ کے ساتھ فنِ خطابت میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ اقتضائے حال کے مطابق اس کے اظہار اور اسلوب کی شاہراہیں وسیع سے وسیع تر ہوتی گئیں۔ ابتدا سے انتہا تک مختلف تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال میں خطابت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ یونان سے روما تک، روما سے عرب تک، عرب سے یورپ تک اور یورپ سے ہندوستان تک اس نے مختلف منازل طے کیں اور بالآخر معراج کو پہنچی۔

## 2۔ اردو فنِ خطابت کے ماخذات

اردو فنِ خطابت بھی اردو کی طرح دیگر زبانوں کے علم و ادب سے ماخوذ ہے۔ اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس نے اقتضائے وقت کے مطابق مختلف علوم و فنون سے خوشہ چینی کی۔ اس نے اپنے دامن میں یونانی، عربی، فارسی اور انگریزی علم و ادب کو سمویا ہوا ہے۔ جب یونان علوم و فنون کا مرکز اور گہوارہ تھا، اس وقت خطابت عروج پر تھی۔ بعد ازیں جب عربوں کے ہاں انقلاب آیا تو ان کی خطابت میں تغیر و تبدل کے ساتھ اس کی نشو و نما میں اضافہ ہوا۔ عربی ادب سے بھی اس نے استفادہ کیا اور دامنِ فکر کو کشادہ کر کے اپنے اظہار میں جدت پیدا کی۔ خطابت فارسی خوانِ علم و ادب سے بھی مستفید ہوئی۔ بعد ازاں، جب برصغیر میں انگریزوں کا تسلط مضبوط ہوا تو اس کے ساتھ انگریزی تہذیب و تمدن اور علم و ادب بھی برصغیر میں در آیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے علوم و فنون پر انگریزی کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، خطابت میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انگریزی خطابت کے نمایاں اوصاف کا اردو خطابت میں ظہور ہونے لگا، الغرض اردو خطابت نے مختلف علوم سے استفادہ کیا۔

عرب اقوامِ عالم میں سب سے زیادہ افصح اللسان تھے۔ زبان و بیان کا یہ عالم تھا کہ ہر واقعے کے بعد عربوں میں سے کوئی ایک کھڑا ہو جاتا، فی البدیہہ اشعار کہتا اور خطابت کے جوہر دکھاتا تھا۔ یہ سب کچھ ایسے لگتا تھا جیسے فصاحت و بلاغت کا ایک دریا امڈ آیا ہو۔ نبی کریم ﷺ کی بعثت اور نزولِ قرآن کے بعد خطابت کو ایک نیا آہنگ ملا، کیوں کہ حضرت محمد ﷺ کی زبان پر جو کلام آتا وہ کلامِ انسانی نہیں بلکہ کلامِ الٰہی تھا، جس کی معجز بیانی ہر سماعت اور ہر دل کو اپنے حصار میں لے لیتی۔ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی خصوصیات سے نوازا جو دیگر انبیا کو نہیں دی گئی تھیں، ان میں ایک عطیہِ جوامع الکلم بھی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد ان کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں بھی اندازِ بیان اور اعجازِ بیان کی وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جو نہ صرف قابلِ تحسین ہیں بلکہ قابلِ تقلید بھی ہیں۔ علی ابن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) حقیقی معانی میں اسمِ با سمیٰ تھے۔ وہ نہ صرف باب العلم تھے بلکہ علم کے بیان کا جو ڈھنگ اور طریقہ قدرت نے انھیں عطا کر رکھا تھا، افصح اللسانی بہ ذات خود اس پر نازاں ہے۔ ان کے خطبات کا ایک ایک جملہ اور ایک ایک لفظ ہزار معنی در بغل ہے، حتیٰ کہ ابن الحدید ان کے بارے میں رائے دیتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ بالکل بجا ہے کہ جتنی بار بھی حضرت علی کے خطبات کا مطالعہ کیا جائے، ہر بار نئے نکتے سامنے آتے ہیں۔ ان کی گہرائی و گیرائی کی وجہ سے اگر زندگی کے آخری لمحات تک اس کا مطالعہ بہ نظرِ عمیق کیا جاتا رہے تو یہی صورتِ حال رہے گی۔ سید ظفر حُسنِ فصاحت و بلاغت سے معمور کتاب "نہج البلاغہ" میں شامل ایک مضمون "امیر المومنین کی علمی خدمات" میں ابن الحدید کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اس مختصر مضمون میں میں حضرت کے ایک خطبہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس ایک قطرہ سے سمندر کی وسعت کا حال معلوم کر لیجیے۔ ۔الحمد لله الذي لا يبلغ مدحته القاىلون۔ ولا يحصى نعماوه العادون۔ ولا يؤدي حقه المجتهدون۔ الذي لا يدركه بعد الهمم۔ ولا يناله غوص الفطن۔ الذي ليس لصفته حداً ٖخدود۔ ولا نعمت موجود۔ (حمد اس ذات کے لیے کہ تعریف کرنے والے جس کی تعریف کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ شمار کرنے والے اس کی نعمتوں کا شمار نہیں کر سکتے ہیں۔ کوشش کرنے والے اس کا حق ادا نہیں کر سکتے۔ وہ، وہ ہے کہ ہمتوں کی ڈوریاں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ انسانی عقل کتنا ہی گہرا غوطہ لگائے اس کی ذات تک نہیں پہنچ سکتی۔ وہ، وہ ہے جس کی صفت کے لیے کوئی معین حد ہی نہیں۔ ہماری طرح اس کی ذات میں تغیر نہیں۔"(۱۹)

برصغیر میں اسلام کی آمد کے بعد عربی زبان کا عمل دخل زندگی اور روزمرہ کے معاملات میں بڑھ گیا۔ اردو کے بہت سے الفاظ عربی سے مشتق ہیں۔ اسلامی حکومت کے دوران عربی علم و فن اور ادب کی بھی ترویج ہوئی، جس کی وجہ سے اردو میں عربی رچ بس گئی۔ خطابت میں بھی عربی کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ اردو خطبانے عربی علم و فن سے بھرپور استفادہ کیا۔ اہلِ عرب کو قدرت نے فصاحت وبلاغت خصوصی طور پر ودیعت کر رکھی تھی۔ عربی خطابت صداقت، بے ساختگی، راست بازی اور طلاقت و ذکاوت کا مظہر تھی۔ اردو فنِ خطابت اور اس پر تحریر کردہ کتب میں عربی خطابت کی فصیح البیانی، بلیغ الکلامی، ملائمت، زورِ بیان کی شدت، الفاظ کی معنوی وسعت اور روانی نظر آتی ہے۔

دیگر فنون کی طرح فنِ خطابت کا منبع اور ابتدائیہ یونان کو قرار دیا جاتا ہے۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں لکھی گئی ارسطو کی تحاریر "ریطوریقا" کو خطابت کے فن پر اوّلین باقاعدہ تسویدی مواد تسلیم کیا جاتا ہے۔ ارسطو کی یہ کتب وقتاً فوقتاً تین حصوں میں سامنے آئی تھیں۔ ہر کتاب میں خطابت کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنا کر بحث کی گئی ہے۔ شبلی نعمانی کے مطابق ان کتب کی بنیاد تین نکات پر ہے: اول تقریر کا موضوع اور مواد کیا ہے۔ دوم تقریر کے مخاطبین کون ہیں اور سوم مقرر یا خطیب کون ہے۔ غرض ان تینوں کتب میں خطابت کے بنیادی لوازم اور مبادیات کو بحث کیا گیا۔ پہلی کتاب میں ارسطو نے خطابت کو بہ طور فن تفصیلاً قلم بند کیا ہے۔ نیز ایتھنز کی ثقافت میں فکری اور فلسفیانہ مباحث کے تحت فنِ خطابت کے مبادی بیان کیے ہیں۔ ارسطو کے مطابق خطابت مدلل مباحثے کی طرح ہے۔ مختلف آرااور نظریات کو دلائل و براہین کے ذریعے رد کرتی ہے یا ان کی تائید کرتی ہے۔ ارسطو نے یہاں اضماریہ (Enthymeme) کو متعارف کروایا ہے۔ یعنی منطق کی وہ دلیل جس کا ایک قضیہ محذوف ہوتا ہے۔ ارسطو نے اضماریہ کی تین اقسام بتائی ہیں: پہلی قسم وہ جس میں دلیل کی بنیاد غیر مستحکم ہے۔ دوسری قسم وہ اضماریہ ہے جو ایسے دلائل پر مشتمل ہے جن کی بنیاد منطقی حقائق کے بجائے اشارات اور علامات پر ہوتی ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جس میں ان دلائل کو بیان کیا جاتا ہے، جو سامعین کی طرف سے اٹھائے گئے غیر مستحکم یا مستحکم مفروضوں کے حق میں یا مخالف ہوں۔ علاوہ ازیں، اضماریہ کی ایک اور قسم بھی ہے، جسے بصری دلیل کہا جاتا ہے۔ ارسطو نے اسے زیادہ تفصیل سے بحث نہیں کیا۔ ارسطو کسی مخصوص معاملے میں تحرک کے دستیاب ذرائع میں صلاحیت کو خطابت قرار دیتا ہے۔ نیز اس معاملے میں مقرر پر بھروسے کے دورویے بیان کرتا ہے: آرٹسٹک اور غیر آرٹسٹک۔ خطابت کے ذریعے خطیب پر اعتماد اور بھروسا تین طریقوں سے ہوتا ہے، جسے ارسطو نے Ethos یعنی اخلاقیات یا کردار، Pathos یعنی سامعین

کے جذبات اور ذہنی رجحان، Logos یعنی منطقی دلائل کا نام دیا ہے۔ ارسطو نے پیراڈیم اور منطقی دلیل کو خطابت کے ذرائع قرار دیا ہے. علاوہ ازیں خطابت کی تین اقسام / اصناف کو سامعین کی تین اقسام کے مطابق قرار دے کر پیش کیا ہے: بیانیہ یا سیاسی خطابت، عدالتی خطابت اور دورانِ تقریب تہنیتی یا ملامتی خطابت۔ بیانیہ خطابت میں ارسطو نے پانچ بنیادی سیاسی موضوعات معیشت، جنگ و امن، قومی و ملی دفاع، درآمدات و برآمدات اور قوانین کی تشکیل کو بحث کیا ہے۔ بیانیہ خطابت میں اخلاقی موضوعات کو بحث کرتے ہوئے مسرت و انبساط کے لیے انسانی افعال، ان کے اہداف اور ان ممکنہ پہلوؤں کو بیان کیا ہے، جو اس کا سبب بنتے ہیں۔ سماج میں اچھائی کو پھیلانے کے لیے مختلف پہلوؤں کو بھی مفصل بیان کیا ہے۔ ارسطو کے مطابق بیانیہ خطابت انسانی فلاح، مسرت اور سماجی خوش حالی کا سبب ہونی چاہیے۔ ان پہلوؤں کو سماج میں پھیلانے کے لیے مقرر کو منطقی دلائل دیتے ہوئے اپنی بات کا اختتام اس انداز میں کرنا چاہیے کہ وہ عوام کے اندر مثبت جذبات کو پروان چڑھائے نیز یہ جذبات عوام کے لیے مفید ہوں اور راہ بری کا کام دیں۔ ارسطو نے چار سیاسی طاقتوں جمہوریت، بادشاہت، اشرافیہ، چند سری حکومت کو بیانیہ خطابت کے لیے مفید قرار دیا ہے۔ تحسینی یا ملامتی تقریر کے ضمن میں ارسطو عزت اور اچھائی کے معیارات کو بحث کرتا ہے۔ اس کے مطابق ماحول اور حالات کے مطابق تقریر کے ذریعے سماج کے اچھے اور برے رویوں پر حسبِ ضرورت تحسین اور ملامت کی جانی چاہیے۔ نیز مقرر کو چاہیے کہ ان بنیادی خصائص کو بہ طور دلیل سامنے لائے جس کی بنیاد پر مدح یا قدح کی جارہی ہے۔ عدالتی خطابت میں دلائل الزام دہی اور دفاعی حکمت عملی کے مطابق لانے چاہئیں۔ ارسطو کے مطابق مسرت و انبساط کا باعث بننے والے جذبات لوگوں کے تخیل، فکر اور سوچ پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی کی بہ دولت وہ دُکھ اور سُکھ کی کیفیات محسوس کرتے ہیں اور اسی کے ذریعے ان کے کردار اور شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ انھی نکات کو بنیاد بنا کر ارسطو عدالتی خطابت کے لیے ایسے جذبات کی مختلف اقسام کو مفید قرار دیتا ہے جو لوگوں کے اذہان و افکار کو بدلنے کا باعث ہوں۔ انھی جذبات کو وہ مجرموں کے غلط امور اور ان کے دفاعی دلائل کی بنیاد بھی قرار دیتا ہے۔ عدالتی خطابت کے لیے ارسطو انصاف اور ناانصافی کی بنیاد پر دلائل کو منقسم کرتا ہے، نیز انصاف کی بنیاد پر دیے جانے والے درست دلائل اور افعال کو اہمیت دیتا ہے۔ انصاف کے حصول کے لیے غلط دلائل اور غلط اقدامات کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ ارسطو نے ان مباحث کو بھی جامع انداز میں قلم بند کیا ہے جو ایک مقرر یا خطیب کے ان دلائل سے متعلق ہیں، جو عدالتی میدان میں اس کے کیس کو

کم زور یا مضبوط بناتے ہیں۔ یہ دلائل اور مباحث قانون، گواہی، معاہدوں، ٹارچرز اور حلفیہ بیانات پر مشتمل ہوتے ہیں۔

ارسطو کے مطابق جذبات انسان کے نظریات تک کو بھی بدل سکتے ہیں، اس لیے ایک مقرر کو چاہیے کہ وہ عوامی جذبات اور احساسات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے دلائل دے جو براہ راست ان کے جذبات کو اپیل کریں، اس لحاظ سے سامعین کو اپنے مدعا کے لیے قائل کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ مقرر کو اپنی شخصیت، کردار، سماجی مقام اور مرتبے کو مد نظر رکھتے ہوئے عوامی جذبات کو ابھارنا چاہیے۔ وہ جذبات کو ابھارنے کے مختلف مثبت طریقوں کو پیش کرتا ہے نیز، منفی طریقوں جیسے غصہ، تحقیر یا اہانت آمیز الفاظ اور لہجے کے استعمال کو خطابت کی خامی قرار دیتا ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ وہ جذبات کو لوگوں کی راہ نمائی کے لیے ایک مثبت رویے کے ساتھ لے کر چلے۔ جذبات کو منطقی دلائل اور مادی وسائل کے تحت استعمال کرنا چاہیے۔ ارسطو کے مطابق پیراڈیم کی چند معروف اقسام ہیں: اول 'تقابل'، دوم ' فرضی روایت یا کہانی'، سوم 'ضرب الامثال اور تشبیہات"۔ ارسطو عوامی جذبات، مقرر کی شخصیت اور اس کے مختلف پہلوؤں کو سامعین پر بہتر تاثر چھوڑنے اور اپنے مقصد کی تائید کروانے کا بہترین ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

ارسطو مقرر کی آواز، زبان اور اندازِ بیان کو خطابت کا اہم پہلو قرار دیتا ہے۔ استعارات، تشبیہات اور ضرب الامثال کا ماہرانہ اور بر محل استعمال، روکھی پھیکی اور عامیانہ زبان سے پرہیز، مہذب زبان اور لہجے کا استعمال، ذو معنی الفاظ اور ابہام والے جملوں سے احتراز، تذکیر و تانیث کو درست نہج پر برتنا مقرر کے لیے لازم ہے۔ مقرر کے لیے لغت سے خاطر خواہ واقفیت ہونا بھی ضروری ہے، اس کا ذخیرہِ الفاظ بھی وسیع ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں، مقفیٰ عبارت سے خطابت کا سمعی تاثر بڑھتا ہے، تاہم یہ قافیہ بندی شاعرانہ تاثر سے پاک ہونی چاہیے۔

اردو فنِ خطابت کے اصول و مبادی میں یونانی خطابت کے تمام رموز نظر آتے ہیں۔ فنِ خطابت پر تحریر کردہ اردو کتب ارسطو کے اصولِ خطابت اور خصائصِ خطیب سے ماخوذ ہیں۔ "خطابت و تقریر" از شمس الدین احمد، "فنِ تقریر" مرتبہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد، "رموزِ خطابت" از نذیر الدین احمد، "فنِ خطابت" از سید کلب مصطفےٰ، "تعلیمِ تقریر" از ابو البیان آزاد اور "فنِ خطابت" از شورش کاشمیری میں خطابت کی تفہیم، اقسام، اصول، لوازم، خصائص، خطیب کی خصوصیات، ذمہ داریاں اور دائرہ کار ارسطو کے پیش کردہ فنِ خطابت سے مشتق ہے۔

انگریزی فنِ خطابت کا ماخذ بھی ارسطو کی "ریطوریقا" ہے۔ ریطوریقا کے بے شمار انگریزی تراجم اور خلاصے لکھے گئے۔ ان تراجم میں مستند ترین تراجم یہ ہیں: رچرڈ سی جیب (Richard C. Jebb) نے اس کا ترجمہ ۱۹۰۹ء میں "The Rhetoric of Aristotle" نام سے کیا۔ دوسرا ترجمہ ۱۹۲۴ء میں جان ہنری فریس(John Henry Freese) نے "Aristotle-The Art of Rhetoric" کے عنوان سے کیا، جو "لوئب کلاسیکل لائبریری" میں بہ طور ایک جزو شائع ہوا۔ اسی طرح ڈبلیو ریز رابرٹ (W. Rhys Robert) نے اس کتاب کا ترجمہ "Rhetoric by Aristotle" کیا، جو آکسفورڈ یونیورسٹی کے کلاسیکل ورک میں ایک جزو کے طور پر شائع ہوا۔ لین کوپر (Lane Cooper) کا ترجمہ شدہ متن "The Rhetoric of Aristotle" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا ہیں۔ جارج اے کینیڈے (George A. Kennedy) نے ۱۹۹۱ء میں اس کتاب کا مختصر ترجمہ " A New History of Classical Rhetoric" کیا۔ انھی تراجم سے انگریزی فنِ خطابت مستفید ہوا اور ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے منظم و مربوط مقام تک پہنچا۔ برصغیر پر انگریز نو آبادیات کے سبب تہذیب و ثقافت کے ہم راہ انگریزی علم و ادب نے بھی برصغیر کے زبان و بیان کو متاثر کیا۔ انھی علوم و فنون میں ایک فن خطابت کا بھی ہے۔

## 3۔ "ریطوریقا" از ارسطو- تجزیہ

"ریطوریقا" فنِ خطابت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں سے ایسی کتاب ہے، جسے فی الوقت آفاقی سطح پر با قاعدہ فنِ خطابت کی پہلی معتبر اور مستند کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ ارسطو کی یہ تصنیف ابتدا سے لے کر اب تک نہ صرف مقبول ہے بلکہ بعد میں آنے والے ماہرینِ فن نے اس سے خوشہ چینی کی۔ مختلف زبانوں میں فنِ خطابت کے موضوع پر لکھی گئی کتب پر اس کے واضح اثرات موجود ہیں۔ اردو فنِ خطابت کے رشحاتِ قلم بھی اس کے اثر سے تہی نہیں۔ "ریطوریقا" میں ارسطو نے فنِ خطابت کی تفہیم کے لیے اسے تین بنیادی حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلے حصے میں خطابت کا تعارف، قائل کرنے کی اقسام اور ذرائع، خطابت کی اقسام، اہمیت و افادیت، مقرر کے لیے چند ضروری معلومات کا ہونا، مقرر کے وہبی اور کسبی اوصاف، خطابت کا مقصد، بنیادِ دلائل کے بارے میں آگہی، لوازمِ تقریر، الزام و دفاع کے طریقے، سامعین کی خوشی کے ذرائع اور غلط کاموں کے محرکات و اثرات کا علم، منصفانہ و غیر منصفانہ امور کی تقسیم سے واقفیت، عدالتی تقریر میں قائل کرنے کے غیر تکنیکی ذرائع کو مفصل بحث کیا ہے۔ کتاب کا دوسرا حصہ مقرر کے شخصی کردار، سامعین کے جذبات، جذبات کی مختلف اقسام، عمومی تقریر و مباحثے میں دلائل کی اقسام، اقوال (مقولوں) کی اقسام اور ان کے استعمال، قیاسِ استثنائی اور اعتراضات کے دفاع پر مشتمل ہے۔ کتاب کے تیسرے حصے میں قائل کرنے

کے ذرائع، زبان و بیان کا مناسب استعمال، غلط زبان کے استعمال کی صورتیں اور نتائج، تشبیہات کا استعمال، زبان کی درستی کے بنیادی ذرائع، موثر زبان کے خصائص، نثری زبان کے خصائص، استعارات کا استعمال، اقسامِ خطابت کے مختلف انداز، تقریر کے دو اہم حصے موضوع اور دلائل، ترتیبِ تقریر، مباحثے کا مقصد- بیانیہ دلائل کی تشکیل اور اختتامیہ کے حصص پر مدلل بحث قلم بند کی گئی ہے۔

## I۔ ریطوریقا-حصہ اول

### 1۔ خطابت کا تعارف

ارسطو کے مطابق خطابت مباحثے کی ایک قسم ہے۔ اس فن کی بہ دولت سامعین کو کسی مقصد کی تحریک و ترغیب دی جاتی ہے۔ قیاسِ استثنائی فنِ خطابت کی تحریکی قوت کا مادہ ہے۔ خطابت در حقیقت حتمی معانی میں قائل کرنے کے ذرائع سے منسلک ہے۔ قائل کرنا ایک بصری مظہر کی طرح ہے۔ عام طور پر ہم آنکھوں سے کوئی مظہر دیکھ لینے کے بعد مکمل طور پر قائل ہو جاتے ہیں۔ مقرر کا بصری مظہر منطقی دلیل ہے، جو قائل کرنے کے تمام طریقوں میں عموماً موثر ترین ہے۔ قیاس استثنائی منطقی قیاس کی ایک شکل ہے۔ مصنف کے مطابق فنِ خطابت کسی ایک مخصوص مضمون کا پابند نہیں، بلکہ یہ ہمہ گیر ہے۔ اس کا دائرہ کار وسیع اور آفاقی ہے۔ اس کا مقصد محض سامعین کو قائل کرنے میں کامیابی ہی نہیں، بلکہ ان تمام حالات اور آلات کی دریافت ہے، جن کی بہ دولت سامعین کو مہارت سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ کسی بھی دیے گئے معاملے میں قائل کرنے کے میسر ذرائع سے مشاہدہ کرنے کا شعبہ ہے۔ ارسطو کے مطابق

> "Rhetoric may be defined as the faculty of observing in any given case the available means of persuasion."(۲۰)

### 2۔ سامعین کو قائل کرنے کے طریقے

قائل کرنے کے طریقوں کو ارسطو نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ جن میں پہلا حصہ 'مقرر کا ذاتی کردار' ہے۔ اگر مقرر اچھی شہرت کا حامل نہیں ہے تو اس کی تقریر موثر نہیں ہو سکتی۔ دوسرا حصہ، سامعین کو ایک خاص ذہنی فریم میں ڈھالنا ہے۔ یعنی، سامعین کی نفسیات اور جذبات کو مد نظر رکھ کر اپنے مدعا و مقصد کے مطابق موڑ لینا ہے۔ تیسرا حصہ، دلائل ہے، جن کی مدد سے مقرر سامعین کو منطقی طریقے سے قائل کرتا ہے۔ بعد ازیں، مصنف نے قائل کرنے کے تین موثر ذرائع بیان کیے ہیں۔ اولاً، مدلل مباحثہ کرنا، ثانیاً انسانی کردار اور مختلف النوع اچھائی کو سمجھنا اور ثالثاً جذبات و احساسات کو جاننا اور سمجھنا ہے۔ مصنف کے مطابق دلیل سے قائل کرنے کی دو صورتیں ہیں، ایک مثال کے ذریعے آمادہ کرنا اور دوسرا منطقی دلیل کے ذریعے قائل کرنا۔ دونوں صورتیں موثر ہیں، تاہم منطقی دلائل پر مبنی تقریر موثر تر ہے۔ مقرر منطقی دلائل کو اس

طرح پیش کرے کہ سامعین انتہائی سرعت و سہولت سے انھیں سمجھ سکیں۔ دلائل کی تفہیم و ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ مقرر کو اپنے منطقی دلائل اور امثلہ بنیادی ممکنات سے تشکیل دینی چاہئیں۔ ایسے پہلو جو ناممکن ہوں یا ممکن تو ہوں، مگر کبھی ہوئے نہ ہوں، انھیں بہ طور دلیل پیش نہیں کرنا چاہیے، تاکہ تفہیمِ مدعا سریع الفہم رہے۔ مصنف کے مطابق فنِ خطابت میں منطقی دلائل کی بنیاد کچھ حقائق سے تشکیل پاتی ہے، جن میں امکانات اور علامات شامل ہیں۔ جن علامات میں کوئی وصف آفاقی پہلو سے منسلک کیا جائے، وہ ناقابلِ تردید ثبوت بناتی ہیں۔ جیسے، کسی کو بخار ہونا، اس کی بیماری کی علامت ہے۔ اس کو رد نہیں کیا جاسکتا ہے کہ بخار بیماری کی علامت ہے۔ بعینہٖ، ایسی دلیل جس میں آفاقی پہلو کسی وصف سے جوڑا جائے تو وہ قابلِ تردید دلیل ہوتی ہے۔ جیسے، سقراط عادل اور دانا ہے اس لیے کہ ہر عادل دانا ہوتا ہے۔ مگر یہ قابلِ تردید ہے، کیوں کہ ضروری نہیں ہے ہمیشہ ہر عادل دانا ہو۔ بعد ازیں، مصنف نے مثالوں کو استقرائی صورت میں پیش کرنے کو موثر گردانا ہے۔ یعنی، مثالوں کو پہلے چھوٹے اجزا میں منقسم کرکے سمجھاتے ہوئے، مکمل جزو بنایا جائے۔

ہر شعبے کے موضوعات پر تقریر کی نوعیت اور استدلال کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ سائنسی نظریے کو اخلاقی استدلال سے نہیں سمجھایا جاسکتا، جب کہ اخلاقیات کو سائنسی منطق کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا، مقرر کو منطق ترتیب دیتے ہوئے اس بنیادی تفاوت کو مد نظر رکھنا چاہیے، تاکہ تقریر موثر اور بر محل ہو۔

## 3۔ تقریر کی اقسام

ارسطو نے "ریطوریقا" کے حصہِ اولیٰ میں سامعین کی اقسام کے باوصف تقریر کو تین بنیادی حصص میں منقسم کیا ہے: سیاسی تقریر، عدالتی تقریر اور عوامی یا رسمی تقریر۔ سیاسی تقاریر ترغیب و ترہیب کا باعث بنتی ہیں، عدالتی تقاریر الزام تراشی یا دفاع کے لیے کی جاتی ہیں، جب کہ عوامی تقاریر کسی کی تحسین و تذمیم کے لیے تشکیل پاتی ہیں۔ سیاسی تقاریر مستقبل سے، عدالتی تقاریر ماضی سے جب کہ عوامی تقاریر حال سے تعلق رکھتی ہیں۔ تاہم عوامی تقاریر ماضی اور مستقبل سے بھی منسلک ہو سکتی ہیں۔ تقریر کی اختتامی نوعیت بھی ان تین اقسام کے مطابق مختلف ہوتی ہے۔ سیاسی مقرر کا مقصد کسی مجوزہ عمل کی افادیت یا نقصان کو قایم کرنا ہوتا ہے، وہ اسی فائدے یا نقصان کو باور کراتے ہوئے، جان دار دلائل کو سمیٹتے ہوئے تقریر کا اختتام کرے گا، تاکہ سامعین کی سماعتوں کو مطلوبہ نتائج پر آمادہ کیا جاسکے۔ عدالتی تقاریر میں فریقین کا مقصد کسی معاملے میں انصاف یا ناانصافی کا قیام ہے۔ لہٰذا، مقررین مرکزی نکتے کے ضمن میں متعلقہ ضمنی نکات پیش کرتے ہیں اور انھی کے مطابق کسی کی توصیف یا تذلیل کرتے ہوئے تقریر کا اختتام کرتے ہیں، تاکہ مطلوبہ نتائج کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔ تینوں قسم کے مقررین کے لیے لازم ہے کہ وہ اس پہلو پر کامل دسترس رکھتے ہوں کہ کیا ممکن

ہے، کیا ناممکن ہے، کیا ہو چکا ہے، کیا ہونے جا رہا ہے، کیا نہیں ہوا، کیا نہیں ہو گا۔ یہی علم اسے مختلف موضوعات سے متعلق دلائل اور منطق کی تشکیل میں مدد دیتا ہے۔

خطابت سائنسی منطق اور سیاست کی اخلاقی برانچ کا امتزاج ہے، یہ جزوی طور پر جدلیات جیسی اور جزوی طور پر نفیس استدلال جیسی ہے، اس کا دائرہ کار وسیع ہے۔ علم کی گہرائی اور گیرائی نہ صرف تقریر کو پختہ اور شائستہ بناتی ہے، بلکہ مقررین کی پذیرائی کا بھی باعث بنتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے پانچ بنیادی پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے، جن کے متعلق خاطر خواہ علم سیاسی مقرر کو میدانِ خطابت میں کام یابی کے زینے فراہم کرتا ہے۔ جن میں ملکی آمدنی کے طریقے، ذرائع اور اخراجات کا علم، جنگ اور امن کے محرکات اور عسکری قوت کا علم، قومی دفاع کی صورت حال کا علم، درآمدات و برآمدات اور قانون سازی کے بارے میں مکمل آگاہی لازم ہے۔

## 4۔ خطابت کی اہمیت وافادیت

ارسطو نے خطابت کی اہمیت و افادیت کو عقلیت و بصیرت سے بیان کیا ہے۔ خطابت کے فوائد بتاتے ہوئے انھوں نے چار اہم اور بنیادی نکات بیان کیے ہیں۔ ان میں پہلا افادی نکتہ یہ ہے کہ خطابت حقیقی اور منصفانہ پہلوؤں کو سامنے لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ دوسرا یہ کہ خطابت کی بہ دولت کم علم لوگوں تک بھی علم کی رسائی ممکن ہوتی ہے۔ تیسرے نکتۂ افادیت کے مطابق دانائی اور استدلال سے فنِ خطابت کے اصولوں کو مدنظر رکھا جائے تو شدید ترین مخالف بھی قائل ہو جاتا ہے۔ چوتھا یہ کہ اعصابی طور پر کم زور شخص بھی خطابت کے بل بوتے پر منطقی لحاظ سے اپنا دفاع کر سکتا ہے۔

## 5۔ مقرر کے وہبی و کسبی اوصاف (Ethos)

ارسطو نے "Ethos" کی ذیل میں مقرر کے چند اہم اور بنیادی وہبی و کسبی اوصاف بیان کیے ہیں، جو مقرر کو مقبولیت اور ارفعیت کی راہ پر گام زن کرتے ہیں۔ یہ اوصاف اگر کسی مقرر میں مکمل طور پر پائے جائیں تو اس کا حلقۂ اثر وسیع ہو جاتا ہے۔ وہبی اوصاف میں سب سے پہلے "اچھی پیدائش" ہے۔ اگر کوئی مقرر بااثر خاندان، آزاد اور آسودہ حال ریاست میں پیدا ہوا ہے تو وہ لوگوں میں قابلِ قدر ٹھہرتا ہے، جس کے باعث اس کی بات زیادہ موثر ہوتی ہے۔ "اچھی اولاد اور کثیر التعداد اولاد" مقرر کے لیے باعثِ افتخار ہے، نیز اس کی شہرت میں اضافے کا سبب ہے۔ وہبی خوبیوں میں جسمانی خصائص جیسے خوب صورتی، دراز قامت اور طاقت شامل ہیں، جو اس کی شخصی وجاہت، شان و شوکت اور سطوت میں اضافے کا باعث ہیں۔ یہ خصائصِ شخصی مقرر کی تاثیرِ گفتار پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔

"Its constituent parts are: good birth, plenty of friends, good friends, weailth, good children, plenty of children, a happy old age, also such bodily excellences as health, beauty, strength, large stature, atheletic powers together with fame, honour, good luck and virtue." (۲۱)

کسبی اوصاف میں دولت کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ ایک ممتاز، صاحبِ ثروت شخص کی تقریر کو سامعین اہمیت دیتے ہیں، سامعین کو متوجہ کرنے کے لیے اسے زیادہ محنت صرف نہیں کرنا پڑتی۔ مقرر کا صاحبِ دولت ہونا اس کے شخصی وقار اور تقریری تاثیر میں اضافے کا موجب ہے۔ اچھی شہرت قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ مقرر کے اختیار میں ہے کہ وہ کس طرح عوام میں مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ ایک معروف مقرر کی بات کی اثر انگیزی فزوں تر ہوتی ہے۔ عزت اچھے کاموں کے لیے معروف ہونے کی علامت ہے۔ سماج میں باعزت مقرر کا مقام و مرتبہ بہت بلند ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے مقرر کی تقریر سامعین کے لیے پُر اثر اور پُر کشش ہوتی ہے۔ جسمانی خصوصیات میں "صحت" وہبی وصف بھی ہے اور کسبی بھی۔ فطری طور پر صحت مند مقرر کو بھی صحت برقرار رکھنے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے، علاوہ ازیں، غیر صحت مند مقرر محنتِ شاقہ کے ذریعے صحت مند ہو سکتا ہے۔ "صحت مند جسم ہی صحت مند دماغ کا حامل ہو سکتا ہے"، حاضر دماغی اور حاضر جوابی مقرر کے لیے ناگزیر ہے، لہٰذا مقرر کو صحت و تن درستی کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ "اچھے اور کثیر التعداد دوست ہونا" مقرر کا ایک اہم کسبی وصف ہے۔ صحبت انسان کی پہچان بھی ہے اور انسان شعوری اور غیر شعوری طور پر اپنی صحبت سے ہی خوبیاں اور خامیاں اپناتا ہے۔ لہٰذا، صحبت یعنی دوستوں کا اچھا ہونا مقرر کے خود اچھا ہونے کی علامت ہے۔ اچھی قسمت مقرر کی فطری خوبی ہے، جس کے باعث وہ عوام و خواص میں نمایاں ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے مراد یہ ہے کہ مذکورہ تمام یا ان میں سے اکثر یا اہم ترین خصائص کا حامل ہونا مقرر کی عزت افزائی کا باعث ہے۔ یہ خوبیاں مقرر کو "Ethos" کے پیمانے پر کامیاب بناتی ہیں۔ اخلاقی اور شخصی خصوصیات سے متصف مقرر کی گفتار لامحالہ زود اثر ہو گی۔

ایک مقرر، بالخصوص سیاسی مقرر کا مقصدِ تقریر عموماً سماجی اچھائی اور افادیت ہوتا ہے۔ "Ethos" کے تحت ارسطو نے اچھائی اور برائی کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ان ذرائع پر مفصل گفت گو کی ہے، جو افادیت اور اچھائی کے ضمن میں سامعین کو قائل کرنے کے لیے مقرر کی معاونت کر سکتے ہیں۔ اچھی عادات اپنانے اور بڑی برائیوں سے مجتنب ہونے سے مقرر کے افعال و اعمال بھلائی کے ترجمان بن جاتے ہیں، جو سامعین کے لیے باعثِ مسرت بھی ہے اور باعثِ افادیت بھی۔ زندہ دل، خوب صورت، عادل، متحمل مزاج، وجیہہ، صحت مند، دولت مند، حوصلہ مند، دانش مند، غیرت مند، باعزت، نیک طینت اور حق گو مقرر عوام و

خواص میں پسند کیا جاتا ہے، نیز سماجی اصلاح اور اچھائی میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے، کیوں کہ ایسے مقرر کی بات باوزن اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ بعد ازیں، مصنف اچھائی کا ایک اور پہلو یہ بیان کرتے ہیں کہ ہر وہ چیز اچھی ہے جو دشمن کے لیے مفاد کے برعکس ہے۔ جیسے عوام کی کم ہمتی اور بزدلی ان کے دشمن کے لیے مفید ہے، اس لیے یہ برائیاں ہیں، جب کہ حوصلہ اور بہادری اچھائیاں ہیں، جو دشمن کے لیے غیر مفید ہیں۔ جس شے کی نشان دہی کوئی دانا اور قابلِ بھروسا انسان کرے وہ بھی اچھائی ہے۔ دشمنوں کے لیے ضرر رساں اور احباب کے لیے مفید تمام پہلو بھی اچھائی کے ضمن میں آتے ہیں۔ اچھائی، مسرت انگیزی اور افادیت کے پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان خصائص کو اپنا کر ایک مقرر اپنے کلام اور دلائل کو زود اثر بنا سکتا ہے۔

بعد ازیں، مصنف نے ان پہلوؤں پر سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے، جن کے مطابق مقرر کو کسی کی مخالفت یا حمایت میں بولنے کے لیے دلائل تیار کرنے چاہئیں۔ نسبتی اچھائی اور نسبتی برائی کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے وہ یہ بات واضح کرتے ہیں کہ مقرر کو ایسی بنیادوں پر دلائل تیار کرنے چاہئیں، جو نسبتاً زیادہ مطلوب اور نتیجہ خیز ہوں۔ جیسے حُسن کے بالمقابل صحت زیادہ مطلوب ہے، عوام کی کم تعداد کی حمایت کی نسبت اکثریت کی حمایت مطلوب اور نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اسی طرح دیگر مادی و روحانی پہلوؤں، مثلاً صحت بخش و مسرت انگیز، بامقصدیت و بے مقصدیت، نایاب میسر و فراواں میسر، مشکل و آساں اور اچھائی و برائی میں نسبتاً مطلوب اور فائدہ مند چیزوں کو پیش کیا گیا ہے، جس بنیاد پر دلائل کی تیاری زیادہ بہتر اور اثر انگیز طریقے سے ہو سکتی ہے۔ حقیقی مقصد کی نسبت ظاہری مقصد زیادہ بہتر اور نتیجہ خیز ہے، اس ضمن میں مصنف کے الفاظ یہ ہیں:

> "What aims at reality is better than what aims at appearance. We may define what aims at appearance as what what a man will not choose if nobody is to know of having it. This would seem to show that to to receive benefits is more desirable than to confer them, since a man will choose the former even if nobody is to know of it, but it isn not the general view that he will choose the latter if nobody knows of it."(۲۲)

یعنی حقیقی مقصد ظاہری مقصد سے بہتر ہے، کیوں کہ اگر کسی انسان کے حقیقی مقصد سے کوئی بھی واقف نہیں ہو گا، تب بھی وہ اس مقصد کو اپنائے رکھے گا، جب کہ ظاہری مقصد میں ایسا نہیں ہوتا۔ ظاہری مقصد محض دکھانے کے لیے ہوتا ہے، جب کہ حقیقی مقصد پیش و پس پردہ ہمیشہ قایم رہتا ہے۔ نیز حصولِ

مقصدِ حقیقی بالعموم انسان اور بالخصوص مقرر کے ہمہ وقت مد نظر رہتے ہیں۔ نسبتاً مطلوب پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر مقرر کو دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

## 6۔ حکومتی معاملات سے آگہی سیاسی مقرر کے لیے ناگزیر

سامعین کو قائل کرنے اور عوامی معاملات میں بہترین، مستند اور نتیجہ خیز انداز میں بولنے کے لیے سیاسی اور عوامی مقرر کے لیے لازم ہے کہ وہ حکومت، تمام حکومتی اقسام، معاملات اور متعلقات کے بارے میں خاطر خواہ معلومات رکھتا ہو۔ کیوں کہ سامعین کو ان کے مفاد کے بارے میں آگاہی دے کر انھیں بہ آسانی قائل کیا جا سکتا ہے۔ سامعین کے مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کو دلائل و براہین پیش کرنے چاہئیں، تاکہ ترغیب و تحریک کے مقصد کو حاصل کیا جا سکے۔

## 7۔ خوبی اور عیب میں امتیاز- مقرر کے اوصافِ حسنہ کے ذریعے سامعین کی آمادگی

مقرر کا کردار وہ پہلی چیز ہے جو سامعین کو اپنے مدعا کی طرف راغب کرنے میں اہمیت رکھتی ہے۔ معزز وہ ہے جو اچھا، قابلِ تعریف اور باعثِ مسرت ہے۔ لہٰذا، اوصافِ حسنہ معزز کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔ خوبی اچھی اور بھلی چیزوں کو رکھنے اور پھیلانے کا شعبہ ہے۔ مصنف کے مطابق خوبی کی متنوع اشکال یہ ہیں: حوصلہ، عدل، اعتدال، ضبط نفس، شان و شوکت، سخاوت، فراخ دلی، دانائی، شائستگی اور ذہانت۔ خوبی معزز ہے، اس لیے اس کے تحت کیے جانے والے کام بھی معزز ہیں۔ مقرر کے کردار کی خوبیاں اس کے مقصد و مدعا کی ترویج اور سامعین کو ان پر آمادہ کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔

## 8۔ تعریفی و تذمیمی تقاریر کی تیاری میں معاون پہلو

مصنف نے ان پہلوؤں کو مفصل و مدلل قلم بند کیا ہے، جو تعریفی و توصیفی اور تذمیمی و ملامتی تقاریر میں دلائل و براہین کی تیاری میں معاونت کرتے ہیں۔ مصنف کے مطابق توصیفی تقاریر کرتے ہوئے مقرر کو ان تمام خوبیوں کو مد نظر رکھنا چاہیے جو باعثِ مسرت، قابلِ تعریف اور معزز ہیں، کیوں کہ یہی خوبیاں سامعین کے قلوب و اذہان کو کشش کرتے ہوئے قائل کرنے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ وہ خوبیوں اور ان کے اثرات کو مفصل تحریر کرنے کے بعد یہ باور کراتے ہیں کہ توصیفی تقریر میں کسی شخص، ملک، قوم یا کسی کی بھی تعریف کرنے لیے یہ پہلو اہم ہیں، کیوں کہ یہی معزز ہونے کے پیمانے پر پورا اترتے ہیں۔ خوبیوں کا برعکس خامیاں یا عیوب ہیں۔ مثلاً کوئی حوصلہ مند نہیں ہے تو یہ اس خوبی کے بالمقابل اس کا عیب ہے، ایمان داری کے بالمقابل بے ایمانی، اخلاص کے بالمقابل دھوکا دہی وغیرہ۔ اس طرح یہی معزز اوصاف تذمیمی تقاریر میں تذمیم و ملامت کے لیے بھی معاونت کرتے ہیں۔

## 9۔ الزام و دفاع کا طریقہ

بعد ازیں، مصنف نے "الزام اور دفاع" اور ان کے متعلقات پر مفصل بحث کی ہے۔ الزام اور دفاع عموماً عدالتی تقاریر کے ضمن میں آتے ہیں۔ ان کے متعلقات میں اہم ترین منطق کے وہ اجزا ہیں جو ان میں استعمال کر کے مقرر الزام تراشی یا دفاع کو یقینی بناتا ہے۔ غلط کام کے محرکات اور نوعیت، غلط کام کرنے والوں کی ذہنی حالت اور جن لوگوں کے ساتھ غلط کیا گیا یعنی متاثرین؛ یہ وہ پہلو ہیں، جن کا جاننا "الزام و دفاع" کی ذیل میں اہم ہے۔ مصنف نے سب سے پہلے غلط کام کا تعارف پیش کیا ہے، اس کے بعد ان تینوں پہلوؤں کو بالترتیب قلم بند کیا ہے۔ وہ کام جو قانون، سماجی روایات اور اخلاقیات کے برخلاف قصداً کیا جائے، غلط کام کہلاتا ہے۔ غلط کام کرنے کا سب سے اول محرک غلط کام کرنے والے کے اپنے کردار اور شخصیت میں موجود بُرائی ہے۔ کسی سے انتقام لینے والا دراصل عادتاً منتقم مزاج ہوتا ہے، اس کا عمل اس کے اپنے کردار کی بہ دولت سرزد ہوتا ہے۔ جو اعمال انسان کی اپنی ذات کی بہ دولت واقع ہوتے ہیں، وہ اس کی عقلی و بے عقلی خواہش، عادت یا فطرت کے سبب ہوتے ہیں۔ وہ افعال جن میں انسان کی اپنی ذات کا عمل دخل نہیں ہوتا، وہ فطرت، دباؤ یا اتفاقیہ سرزد ہوتے ہیں۔ یہاں مصنف واضح کرتا ہے کہ انسان کی عمر، حیثیت، عہدہ یا مقام کسی غلط فعل کے سرزد ہونے کا محرک نہیں ہوتا، بلکہ اس کی خواہش، عادت، دباؤ یا اتفاق اصل محرک ہوتا ہے۔ ایک مفلس انسان دولت کے حصول کے لیے کوئی غلط کام کرتا ہے، مفلسی محرکِ اصلی نہیں ہے، کیوں کہ ہر مفلس شخص غلط کام نہیں کرتا۔ اصل محرک حصولِ دولت کی "خواہش" ہے۔ ایک صاحبِ ثروت شخص مزید دولت کے حصول کے لیے بھی غلط کام کر سکتا ہے، نیز کسی اور خواہش کی تکمیل بھی اسے غلط کام کرنے پر اکساتی ہے۔

اتفاقیہ سرزد ہونے والے غلط کام اگرچہ خود انسان کی طرف سے وقوع پذیر ہوتے ہیں، مگر اس میں اس کے ارادے یا مقصد کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ انتقامی افعال کا محرک غصہ اور جنون ہے۔

## 10۔ خوشی اور خوش گواریت

خوشی ایک تحریک ہے، جس سے روح مکمل اور اپنے وجود کے معمول پر آجاتی ہے۔ خوشی کے اس تعارف کے مطابق وہ عناصر جو خوشی کے باعث بنتے ہیں، خوش گواریت کہلاتے ہیں۔ خوش گواریت کے بہت سے پہلو مصنف نے قلم بند کیے ہیں۔ انسان کا اپنی فطرت اور اصل کی طرف راغب ہونا، عادات اور خواہشات، کسی دباؤ کے بغیر بہ خوشی کام کرنا، احساسات کی تسکین، طاقت کو بڑھانے کے محرکات اور خواہش، برائی سے پاک رہنا، محبت پانا اور دینا، خیال رکھنا اور خیال رکھے جانا، انتقام لینا یا معاف کرنا، کسی مقصد کا حصول یا حصول کی تمنا اور امید اور صلاحیتوں کا ادراک ہونا انسان کے لیے خوشی کا سبب بنتے ہیں، لہٰذا یہ تمام خوش گواریت کی متفرق اشکال ہیں۔ علاوہ ازیں، انسان کے لیے اس کی ذات اہم اور مقدم ہوتی ہے، اس لیے ذاتی

خصائص، صلاحیتیں، ان کا سراہا جانا بھی خوش گواریت ہے۔ عزت اور اچھی شہرت بھی انسان کے لیے آسودگی و طمانیت کا باعث ہیں، پس یہ بھی خوش گواریت میں داخل ہیں۔ طویل مدت کے بعد یا محنت سے حاصل شدہ چیزیں اور تفریح کا باعث بننے والی چیزیں خواش گواریت کا حصہ ہیں۔ خوشی اور خوش گواریت کے یہ تمام وہ پہلو ہیں، جو بھلائی یا برائی کا موجب بنتے ہیں۔ انھی کے ذریعے ایک مقرر سماجی و ملی معاملات اور رجحانات کو پہچان کر اصلاحِ سماج و مفادِ ملت کے لیے کوشش کرتا ہے۔

## 11۔ غلط کام کے محرکات

بعد ازیں، ارسطو نے مقررین کے لیے نفسیاتی طور وہ تمام نفسیاتی حالتیں اور محرکات طشت از بام کیے ہیں، جو دوسروں کے ساتھ برائی کے لیے برانگیخت کرتے ہیں۔ مقرر نے چوں کہ سامعین کی رہ نمائی اور اصلاح کا فریضہ سرانجام دینا ہوتا ہے، اس لیے اسے تمام برائیوں کے محرکات کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ عدالتی تقاریر اور مقدمات کی بابت ارسطو نے چند ضروری نکات بیان کیے ہیں، تاکہ مقررین پر نہ صرف جرم کی نوعیت واضح ہو، بلکہ وہ کسی بھی مقدمے میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکیں۔ ارسطو نے بتایا ہے کہ وہ لوگ بہ آسانی برائی اور غلط کاری میں مبتلا ہوتے ہیں، جن کی اعلا حکام تک رسائی ہوتی ہے، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جرم کر کے ججوں کے فیصلے پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو اپنی پُر اعتماد ظاہری شخصیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے برائی کرتے ہیں، کیوں کہ ان کی ظاہری شخصیت اور الزامات میں تصادم کے باعث لوگ ان کی برائی کا یقین نہیں کرتے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو ایسے بڑے اور شاذ و نادر ہونے والے جرائم اور برائیاں کرتے ہیں، جن کے لیے لوگوں نے احتیاطی تدابیر اختیار نہیں کی ہوتیں۔ چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے، جو مفادات کے حصول اور خواہشات کی تکمیل کے لیے جرائم کرتے ہیں۔ ان کو حاصل ہونے والا نفع بعد میں ملنے والی سزا سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا ہے۔

بعد ازاں، ارسطو نے متاثرین کی مختلف اقسام بتائی ہیں، متاثرین یعنی وہ لوگ جن کے ساتھ معاشرے میں عموماً بُرا کیا جاتا ہے۔ متاثرین کی پہلی قسم وہ ہے جن کے پاس برائی کرنے والوں کی مطلوبہ شے موجود ہوتی ہے۔ وہ اس شے کے حصول کے لیے ہر طرح کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کی حق تلفی کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان متاثرین کی ہے جن کے ساتھ ماضی میں برائیاں اور ناانصافیاں ہوئیں، لیکن انھوں نے انصاف کے لیے کوئی تگ و دو اور قانونی چارہ جوئی نہیں کی ہوتی، اس لیے جرم کرنے والا بے باکی سے ان کی حق تلفی کرتا ہے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے، جن کے ساتھ اس سے پہلے برائی نہیں ہوئی ہوتی یا جن کے ساتھ اکثر برائی ہوتی رہتی ہے۔ دونوں غیر محتاط ہوتے ہیں، اول الذکر یہ سوچ کر کہ اس کے ساتھ کبھی کچھ برا نہیں ہو گا اور موخر الذکر یہ سوچ کر کہ اس کے ساتھ اب کچھ بُرا نہیں ہو گا۔ ان کے غیر محتاط رویے کی وجہ سے غلط کار کو ان

کے ساتھ برائی کرنے کا رُوزن مل جاتا ہے۔ متاثرین کی چوتھی قسم وہ ہے، جن کی معاشرے میں بُری شہرت ہو اور لوگ انھیں نگہِ نفرین سے دیکھتے ہوں، ایسے لوگوں کے ساتھ برائی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ پانچویں قسم ان لوگوں کی ہیں جو خود غلط کاریوں میں ملوث ہوتے ہیں، اس لیے ان کے ساتھ برائی کرتے ہوئے غلط کار کسی ذہنی یا سماجی دباؤ کا شکار نہیں ہوتا۔ عدالتوں میں عمومی طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو کم زور ہوں اور وہ لوگ جو سماعتوں کی مد میں بھاری فیس نہیں دے سکتے، اپنا حق حاصل نہیں کر سکتے۔ علاوہ ازیں، وہ مقررین بھی مقدمے میں کام یابی سے ہم کنار نہیں ہوتے، جو فصاحت اور عملی صلاحیت سے تہی ہوتے ہیں، کیوں کہ وہ بجا طور پر اپنا موقف بیان نہیں کر سکتے۔ چھٹی قسم ایسے لوگوں کی ہے جو کم زور، مفلس یا غیر فصیح ہیں، درج بالا وجوہ سے ان کے ساتھ برائی کا ارتکاب آسان ہے۔ ساتویں قسم ان لوگوں کی ہے، جن کے ساتھ برا کرنے سے انسان اچھے کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ یہاں ارسطو نے جیسن تھیسولینز (Jason Thessalonians) کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا ہے کہ بے شمار منصفانہ کام کرنے کے لیے چند غیر منصفانہ کام کرنا بھی ایک فریضہ ہے۔

## 12۔ منصفانہ اور غیر منصفانہ رویہ

عدالتی مقررین کی تقاریر میں استحکام اور استدلال پیدا کرنے کے لیے ارسطو نے منصفانہ اور غیر منصفانہ امور کی درجہ بندی کی ہے۔ اس نے قانون کو دو حصوں "خاص قانون" اور "عالمی قانون" میں منقسم کیا ہے، جسے مختلف اور مخصوص معاشرے تسلیم کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان قوانین کے مطابق اور موافق عمل کرتا ہے، تو اس کا یہ عمل منصفانہ ہے، اگر وہ ان قوانین کے خلاف عمل کرتا ہے، تو اس کا فعل غیر منصفانہ ہے۔ علاوہ ازیں، غلط اور صحیح کی تقسیم کے لیے کچھ شرائط کا تذکرہ کیا ہے، اگر متاثرہ شخص ان شرائط پر پورا اترے تو اس کے ساتھ غلط ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ پہلی شرط کے مطابق متاثرہ شخص نے واقعتاً نقصان اٹھایا ہو، دوسری شرط کے مطابق اس نے اپنی خواہش کے خلاف نقصان اٹھایا ہو اور تیسرا یہ کہ نقصان پہنچانے والا نقصان پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ عدالتوں میں اس وقت تک منصفانہ فیصلوں کی توقع نہیں کرنی چاہیے، جب تک جرم کی نوعیت، اصل محرکات اور الزامات کے حامل اشخاص کے امور کا بہ نظر غائر جانچ پرکھ نہ کی جائے۔ اس لیے عدالتی مقرر کو نہ صرف قانون پر کامل دسترس ہونی چاہیے، بلکہ جرم کی نوعیت کی درست تفہیم کے ساتھ ساتھ درست وضاحت سے واقفیت ہونا بھی بے حد ضروری ہے۔

بعد ازیں، مصنف نے اچھائی اور برائی کو بھی دو اقسام میں منقسم کیا ہے۔ ایک فعل کا اچھا یا برا ہونا قانون میں تحریری طور پر موجود ہے، جب کہ بعض افعال کی نوعیت قانون میں تحریر شدہ نہیں ہوتی۔ ایسے میں ان کی نوعیت کو غیر تحریری مخصوص قانون (جیسے ثالثی اور پنچائیت) کے ذریعے طے کیا جاتا ہے۔ اس کے

تحت جرم کی نوعیت کے ساتھ محرک اور مجرم کے ارادے کو پرکھتے ہوئے منصفانہ فیصلہ کیا جاتا ہے۔ مساوات کے ذریعے مجرمانہ کارروائیوں اور نادانستہ سرزد ہونے والے جرائم میں فرق لازم ہے۔ مجرم کے عمل کو اس کا ارادہ نہیں سمجھنا چاہیے، بلکہ اس کے کردار، اوصاف اور گزشتہ معاملات کو جانچ کر اس کے ارادے اور نیت کی بنیاد پر درست اور مبنی بر عدل فیصلہ کرنا چاہیے۔

## 13۔ عدالتی تقریر میں قائل کرنے کے غیر تکنیکی طریقے

مصنف نے عدالتی تقریر کی ذیل میں پانچ غیر تکنیکی طریقے بیان کیے ہیں، جو جج، سامعین اور مخالفین کو قائل کرنے میں مدد و معاون ہو سکتے ہیں۔ قانون، گواہ، معاہدے، ٹارچر (دباؤ)، حلف۔ اگر تحریری قانون کسی کے خلاف فیصلہ سناتا ہے تو وہ فطری (یونی ورسل) قانون کا سہارا لے کر اپنا دفاع کر سکتا ہے۔ جیوری کا ایمان دارانہ طریقے سے فیصلہ کرنے کا حلف صرف تحریری قانون کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ فطری قانون کے لیے بھی ہوتا ہے، کیوں کہ فطری قانون مساوات کے تقاضوں پر نا قابلِ تغیر ہوتا ہے۔ تحریری قانون میں ردو بدل بھی ہوتا رہتا ہے، نیز اس میں غلطی اور ابہام کا بھی امکان رہتا ہے۔ گواہ "قدیم اور موجودہ" دو طرح کے ہوتے ہیں۔ قدیم گواہان وہ جن کے فیصلوں سے سب واقف ہوتے ہیں، موجودہ گواہ وہ ہیں جنھوں نے متنازع معاملے پر اپنی رائے کا اظہار کیا؛ مستقبل میں اس طرح کے تنازعات پر یہ آرا بہ طور دلیل پیش کی جا سکتی ہیں۔ گواہوں کے دلائل ہمارے یا ہمارے مخالفین کے حق میں، حقائق پر سوالیہ نشان یا ملزم یا مدعی کے کردار پر سوالیہ نشان ہوں گے۔ مدعی یا ملزم کے پاس دلائل عدم موجود ہوں یا ناکافی ہوں تو کم از کم اپنے آپ کو قابلِ اعتماد اور مخالفین و گواہان کو نا قابلِ اعتماد ثابت کرنے کے دلائل موجود ہونے چاہئیں۔ "معاہدے" بہ طور دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اگر معاہدے ملزم یا مدعی کے حق میں ہوں تو ان کی ساکھ کی اہمیت پر زور دینا اور مختلف ذرائع سے اس کی اہمیت کو ثابت کرنا مطلوبہ فیصلے تک پہنچانے میں معاون ہو سکتا ہے۔ برعکس ازیں، معاہدہ اگر مدعی یا ملزم کے خلاف ہے تو وہ اس کی ساکھ خراب کرنے اور اسے غیر قانونی ثابت کرنے کے حوالے سے ثبوت پیش کرے گا۔ "ٹارچر (دباؤ)" کے ذریعے گواہی لینا اور پھر اسے درست ثابت کرنے کے لیے ایسے دلائل دینا کہ اکثر لوگ حق کو چھپانے کے لیے یا اپنے مفاد کی خاطر بنا دباؤ کے جھوٹی گواہی دے دیں، ایسے لوگوں سے اعصابی و ذہنی یا جسمانی دباؤ کے ذریعے حقیقی گواہی لی جا سکتی ہے۔ برعکس ازیں، دباؤ میں لی گئی کسی گواہی کو غلط ثابت کرنے کے لیے اس طرح کے دلائل کو استعمال کیا جاتا ہے کہ سخت ٹارچر سے نجات یا بچاؤ کے لیے جھوٹی گواہی دی جاتی ہے۔ قائل کرنے کے غیر تکنیکی طریقوں کی آخری کڑی "حلف" ہے۔ اس کی چار صورتیں ممکن ہیں: ایک یہ کہ انسان بہ یک وقت حلف لے بھی اور دے بھی، دوسری یہ کہ

انسان حلف لے نہ حلف دے، تیسری یہ کہ انسان یا حلف لے یا حلف دے، چوتھی صورت یہ کہ انسان حلف لیتا ہے، مگر اپنے لیے کسی کا حلف نہیں قبولتا یا قبول کر لے مگر خود حلف نہ دے۔ مصنف نے ان چاروں ممکنہ صورتوں کو برتنے کے لیے دلائل دینے کا انداز اور طریقہ بتایا ہے۔ حلف دینے اور لینے کو دلائل کے ضمن میں پیش کرنے کے لیے متعلقہ نوعیت کے دلائل سے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہیے۔

## II۔ ریطوریقا-حصہ دوم

### 1۔ سامعین، تقریر اور جذبات

کتاب کے حصہِ ثانی میں مصنف جذبات (Pathos) کو موضوعِ گفت گو بناتا ہے۔ مختلف جذبات کے تحت انسانی فیصلوں اور سوچ کے زاویوں کی کیفیت اور نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا، مقرر کے لیے مختلف جذبات، ان کی وجوہات اور ان کے متاثرین کے بارے میں خاطر خواہ علم ہونا لازم ہے۔ اس علم کے بنا وہ سامعین کی نفسیات نہیں سمجھ سکتا۔ سامعین کی نفسیات کے ادراک و فہم کے بغیر وہ انھیں اپنے مقصد پر قائل نہیں کر سکتا۔ مقرر کا ذاتی کردار بھی اس کی تاثیرِ گفتار پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ "اچھا فہم، حسنِ اخلاق اور نیک نیتی" وہ پہلو ہیں، جو ایک مقرر کے لیے اپنے کردار پر اعتماد کا ذریعہ ہیں۔

> "Good sense, good moral characterand good will. . . It follows that any one who is thought to have all three of these good qualities will inspire trust in his audience."(۲۳)

خود اعتمادی مقرر کو حوصلہ اور بیان کا قرینہ عطا کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، خود اعتمادی ہی مقرر کو سامعین کے جذبات اور نفسیات تک رسائی میں مدد دیتی ہے۔

#### ا۔ غصہ

سب سے پہلے مصنف غصیلے جذبات، وقتِ غصہ ذہنی حالات، ان کے محرکات اور جن لوگوں پر غصہ آتا ہے ان کی کیفیات کی وضاحت کرتے ہیں۔ غصہ ایسی انتقامی تحریک ہے جو انسان اپنی یا اپنے کسی دوست کی بے وجہ تذلیل پر شدید تکلیف کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ غصے کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں: ایک انسان اس وقت غصے میں آتا ہے جب کوئی اس کی مخالفت کرے، اس کے خلاف کام کرے، اس کے لیے کام کرنے میں ناکام رہے، اسے الجھن میں ڈالے، اس کی تذلیل و تحقیر کرے یا غیر متوقع برے نتائج سامنے آئیں۔ علاوہ ازیں، بیماری، افلاس، محبت یا نارسا خواہشات غصے کے جذبات بھڑکاتی ہیں۔ بعد ازیں، مصنف نے ان لوگوں

کی نشان دہی کی ہے، جن پر عموماً غصہ آتا ہے۔ انسان کو ان لوگوں پر غصہ آتا ہے جو اس کا تمسخر اڑاتے ہیں، اس پر طنز کرتے ہیں، اسے تکلیف پہنچاتے ہیں، گستاخی، بے حرمتی، توہین، تذلیل، تحقیر اور کردار کشی کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر بھی غصہ آتا ہے، جو اس کی خصوصیات تسلیم نہیں کرتے، جن کا رویہ اچانک بدل کر تحقیر آمیز ہو جاتا ہے، احسان فراموش، بے جا مخالفت کرنے والے، اس سے کم تر مگر اسے بے عزت کرنے والے، اس کی بد نصیبی پر خوش ہونے والے، تکلیف دے کر بے حسی برتنے والے بھی اس کے غصے کا سبب اور شکار ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں، جو لوگ کسی انسان کی، اس کے مخالفین؛ جنھیں وہ سراہتا ہے، جن سے وہ سراہے جانے کی توقع کرتا ہے،، جن کی تعظیم کرتا ہے یا جو اس کی تعظیم کرتے ہیں، کے سامنے تذلیل کرتے ہیں، ان پر شدید غصہ آتا ہے۔ جو لوگ انسان کی سنجیدہ باتوں کا ازراہ تفنن جواب دیں، عزیز اور عزت مآب تعلقات کی تذلیل کریں، ایسے لوگوں پر بھی غصہ آنا انتہائی فطری امر ہے۔

## ۲۔ سکون / تحمل

غصے کا متضاد سکون و تحمل ہے۔ مصنف نے اس جذبے کے محرکات و اسباب اور سکون کا باعث بننے والی ذہنی کیفیات اور ان انسانوں کی بابت وضاحت کی ہے، جو سکون کا سبب بنتے ہیں۔ مصنف کے مطابق غصے کی شدت میں کمی یا غصے کا ٹھنڈا پڑنا "سکون" ہے۔ ان تمام اشخاص کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ایک انسان کے لیے باعثِ سکون ہوتے ہیں۔ عزت دینے والے، غلطی تسلیم کرنے والے، عاجزی کا اظہار کرنے والے، حمایت کرنے والے، سنجیدگی کے عالم میں سنجیدگی کا اظہار کرنے والے، مہربانی اور احسان کرنے والے، تحقیر اور کردار کشی نہ کرنے والے اور مذاق نہ اڑانے والے انسان سکون کا باعث بنتے ہیں۔ ان انسانوں کے برعکس انسان جو غصے کا سبب بنتے ہیں، باعثِ سکون ہوتے ہیں۔ بعد ازیں، مصنف نے ان تمام ذہنی حالتوں کو بیان کیا ہے، جو سکون افزا ہیں۔ تکلیف سے آزادی کا احساس انسان کو پُر سکون کرتا ہے۔ بے ضرر خوشی کا میسر ہونا باعثِ اطمینان ہے۔ مجرم کی سزا انسان کو تسکین دیتی ہے۔ وہ تمام ذہنی حالتیں جو انسان کو مشتعل کرتی ہیں، ان کی متضاد ذہنی کیفیات انسان کے لیے سکون اور تحمل کا باعث ہوتی ہیں۔

## ۳۔ دوستی اور عداوت

اس کے بعد، مصنف نے دوستی اور عداوت کے جذبات، ان کی وجوہات اور جن انسانوں کے لیے یہ جذبات محسوس کیے جاتے ہیں، ان کا تذکرہ کیا ہے۔ دوستانہ محسوسات یہ ہیں کہ کسی کے لیے خود اس کی خاطر، بغیر کسی طمع کے، ان چیزوں کی خواہش رکھنا، جنھیں انسان اچھا گردانے۔ انسان ان لوگوں کے لیے دوستانہ جذبہ محسوس کرتا ہے، جو اس کی خوشی میں خوش ہوتے ہیں، اس کا غم بانٹتے ہیں، اس کے خیر خواہ ہوتے ہیں، اس کے پسندیدہ انسانوں کو پسند اور ناپسندیدہ انسانوں کو ناپسند کرتے ہیں، جو معتدل مزاج اور انصاف پسند

ہوتے ہیں، جنھیں وہ سراہتا ہے یا جو اس کو سراہتے ہیں، جن کی صحبت خوش گوار ہوتی ہے، جو عیب چیں، بدمزاج، جھگڑالو نہیں ہوتے، جو زندگی کے معاملات میں صاف اور کھرے ہوتے ہیں، جو کینہ نہیں رکھتے، بھول چوک پر ملامت نہیں کرتے، غصے یا شدید جذبے میں دبانے کی کوشش نہیں کرتے، جو سنجیدہ احساسات رکھتے ہیں، حاسد نہیں ہوتے، جو کچھ اچھا پانے میں مدد کرتے ہیں، جو انسان کی غیر موجودگی میں بھی اس کے لیے دوستانہ جذبہ رکھتے ہیں اور جن سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ ارسطو نے دوستی کی مختلف اشکال "رفاقت، قربت اور خونی ناطہ" بیان کی ہیں۔ بعد ازیں، اسبابِ دوستی کی نشان دہی کی گئی ہے۔ "کہے، جانے اور جتائے بغیر مہربانی کرنا" دوستی کا سبب بنتا ہے۔ عداوت اور نفرت کے جذبات اور ان کے اسباب کا ادراک دوستی کے جذبات و محرکات کے برعکس پہلوؤں کے ذریعے ممکن ہے۔ یعنی جن وجوہ سے، جن انسانوں کے لیے دوستانہ جذبات رکھے جاتے ہیں، ان کی متضاد وجوہ اور انسانوں سے عداوت اور نفرت کے جذبات منسلک ہو جاتے ہیں۔

## ۴۔ خوف اور بے خوفی

ارسطو نے خوف، اعتماد اور ان کے محرکات و متعلقات کو بھی جامع انداز میں قلم بند کیا ہے۔ مستقبل میں کسی تباہ کن یا تکلیف دہ برائی کے تصور کی وجہ سے پیدا ہونے والی تکلیف یا خلل، خوف ہے۔ وہ چیزیں اور انسان کسی کے لیے خوف کا باعث ہیں، جو اسے تباہ کرنے یا نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ علاوہ بریں، غیر منصف طاقت ور، خود سے مضبوط تر مخالفین، ریاکار، بے ایمان اور سنگ دل لوگ خوف کا باعث ہیں۔ مصنف نے ان حالات کی نشان دہی بھی کی ہے، جن میں انسان خوف محسوس کرتا ہے۔ انسان اس وقت خوف محسوس کرتا ہے، جب اسے کسی تباہ کن یا نقصان دہ واقعہ کے رونما ہونے کی توقع ہوتی ہے۔ لوگ اس خوف کے زیر اثر خوف محسوس کرتے ہیں کہ مخصوص لوگ، مخصوص حالات اور مخصوص اوقات میں ان کے ساتھ کچھ بُرا کریں گے۔ سامعین کو خوف دلانا مقصود ہو تو مقرر کو چاہیے کہ ان کو غیر متوقع لوگوں، حالات اور اوقات میں پیش آنے والے خطرات سے خبردار کرے۔ "اعتماد" خوف کا متضاد ہے۔ لہٰذا اس کی تعریف، وجوہات اور حالات بھی خوف کے متذکرہ پہلوؤں کے برعکس ہیں۔ انسان مستقبل میں کسی اچھے واقعے کے رونما ہونے کی توقع سے پُر اعتماد ہوتا ہے۔ کام یابی کا یقین، خطرات سے نمٹنے کی طاقت، طاقت ور دشمن پر برتری اور مخالفین سے ہر میدان میں آگے ہونا انسان کو پُر اعتماد اور بے خوف بناتا ہے۔

## ۵۔ شرمندگی اور بے شرمی

مصنف نے "شرمندگی اور بے شرمی" کے جذبات کے ضمن میں بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔ ماضی، حال یا مستقبل میں بدنامی کا باعث بننے والی قبیح چیزیں شرمندگی ہیں، جب کہ بے شرمی انھی چیزوں سے متعلق

حقارت اور بے حسی ہے۔ ان چیزوں پر شرم محسوس ہوتی ہے، جو انسان کو اپنے یا اپنے محبوب لوگوں کے لیے غیر معزز لگتی ہیں۔ اخلاقی برائیاں، معزز اور قابلِ قدر چیزوں میں حصہ نہ لینا، اپنے درجے کے لوگوں کے بالمقابل کم صلاحیت ہونا، بدنامی اور بے عزتی والے کاموں میں ملوث ہونا، اپنے افراد یا مخالفین کے سامنے ہتھیار ڈالنا اور کم ہمت و بزدل ہونا اسبابِ شرمندگی ہیں۔ انسان ان لوگوں کے سامنے غلط کام سرزد ہو جانے پر شرمندگی محسوس کرتا ہے، جو اسے سراہتے ہیں، جنھیں وہ خود سراہتا ہے، جن سے سراہے جانے کی امید رکھتا ہے، جن کی رائے اس کے لیے باوقعت ہوتی ہے، جو اس کے بالمقابل ہوتے ہیں، جو اس جیسا بننے کے خواہاں ہیں، جو اسے قابلِ بھروسا سمجھتے ہیں۔ انسان نہیں چاہتا کہ اس کی بدقسمتی میں اسے ایسے لوگ دیکھیں، جو اس جیسا بننے کے متمنی ہیں، جو اس کے معترف ہیں اور جن کا وہ معترف ہے۔ اگر وہ اس کو بدقسمتی میں دیکھ لیں تو ایسے حالات میں وہ شرمندگی محسوس کرے گا۔ ایسے انسانوں کے سامنے مسلسل رہنا بھی باعثِ شرم ہوتا ہے جو اس کی ذلت سے واقف ہوں۔

## ۶۔ ہمدردی (مہربانی) اور ظلم (زیادتی)

ضرورت کے وقت کسی ضرورت مند کی بے لوث مدد خالصتاً اسی کی خاطر، اپنے مفادات سے بالاتر ہو کر کرنا، مہربانی ہے۔ اس کا محرکِ اصلی جذبہ انسانیت اور جذبہ ہمدردی ہے۔ ضرورت ہمیشہ فطری خواہش اور جبلی میلان کے باعث پیدا ہوتی ہے، ایسے میں کسی انسان کی تسکین کا باعث بننا مہربانی ہے۔ یہ ضرورت مالی، ذہنی یا اخلاقی کسی بھی قسم کی ہو سکتی ہے۔ مخالفین کو بے مروت ثابت کرنے کے لیے ان کی جانب سے کی گئی دوسرے انسانوں کے لیے مہربانیوں کو بدلہ یا اتفاقیہ عمل ثابت کیا جا سکتا ہے۔ نیز سامعین میں مہربانی کا احساس پیدا کرنے کے لیے ان کے اندر انسانیت اور ہمدردی کے جذبات کو بڑھایا جانا چاہیے اور دلائل کو اسی نہج پر ترتیب دینا چاہیے۔

## ۷۔ ترس

ایک انسان اس وقت کسی کے لیے ترس محسوس کرتا ہے، جب وہ اسے کسی ایسی مصیبت میں دیکھتا ہے، جس کا وہ مستحق نہیں ہوتا اور وہ محسوس کرتا ہے کہ یہ مصیبت خود اس پر یا اس کے عزیزوں پر بھی آ سکتی ہے۔ بالکل تباہ رسیدہ، بے حد بدقسمت، بے حد خوش قسمت اور متکبر لوگ ترس محسوس نہیں کرتے؛ اس کے برعکس لوگ دوسروں کے لیے ترس محسوس کرتے ہیں۔ تکلیف دہ، ناخوش گوار، تباہ کن اور اتفاقیہ مصائب اور بدقسمتی کے دیگر پہلو ترس کا موجب بنتے ہیں۔ حلقۂ احباب میں شامل لوگوں، ہم عمر، ہم عصر، ہم حیثیت و ہم کردار اور دل کے قریب لوگوں پر اگر کوئی مصیبت ٹوٹے تو رگِ ترس پھڑک اٹھتی ہے۔ لوگ عموماً ماضی کے واقعات اور مستقبل میں واقعات کے ہونے کے امکان پر زیادہ ہمدردی اور ترس محسوس نہیں کرتے۔

ارسطو کے مطابق مقرر اپنے اشارات، کیفیات اور تاثرات کی بہ دولت ماضی میں ہونے والے ناخوش گوار واقعات سامعین کے سامنے اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ وہ حال میں وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ اس طرح کی کیفیت کے بیان پر مہارت کی وجہ سے سامعین پر ترس کی کیفیت طاری کی جاسکتی ہے۔

## ۸۔ طیش (غضب)

مصنف کے مطابق ترس کا متضاد جذبہ طیش یا غضب ہے۔ کسی کی غیر معمولی خوش قسمتی پر مخصوص حالات میں کُڑھنا اور درد محسوس کرنا طیش یا غضب کہلاتا ہے۔ کسی کی ناحق کام یابی پر، نااہل لوگوں کے پاس عہدوں کی حاملیت پر، نو دولتے لوگوں کے عُجب، تمرد اور رعونت پر، غیر مستحق افراد کی کام یابی پر عموماً انسان خشمگیں ہو جاتا ہے۔ جب کوئی کم تر انسان کسی برتر انسان سے اپنا موازنہ کرتا ہے تو عموماً تندخو ہو جاتا ہے۔ ارسطو نے ان حالات کو بھی بیان کیا ہے، جن میں انسان غضب ناک ہو جاتا ہے۔ جب کوئی شخص انتہائی جدوجہد اور عرق ریزی سے اعلا مقام و منصب حاصل کرتا ہے تو کوئی ایسا شخص جو اس کے برابر نہ ہو، اسی عہدے اور منصب کو اپنے تعلقات کی بنا پر بغیر محنت کے حاصل کرتا ہے، ایسی صورت حال میں اول الذکر شخص طیش میں آئے گا۔ جب کوئی انسان کسی مقصد کو محنت سے حاصل کرنے کا خواہاں ہو، جب کہ دوسرے لوگوں کے پاس وہ بغیر محنت کے موجود ہو؛ جب انسان خود کو کسی شے کا مستحق سمجھے اور دوسروں کو غیر مستحق؛ ایسی صورت حال بھی طیش کو بڑھانے کا سبب بنتی ہے۔

## ۹۔ حسد

حسد وہ کرب ناک احساس ہے، جو اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب کوئی انسان ایسی اشیا کا حامل نہ ہو جو خوش قسمت لوگوں کو حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اپنے احساسِ تہی پر غضب ناک ہوتا ہے کہ یہ دوسروں کے پاس کیوں ہے۔ حسد کا مادہ وہاں پنپتا ہے، جہاں انسان اپنے برابر اور ہم عصر لوگوں کو خود سے ممتاز اور برتر دیکھتا ہے۔

## ۱۰۔ رشک

رشک ایک مثبت احساسِ درد ہے، جو دوسرے لوگوں کی اچھی قسمت کو سراہتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ انسان خود بھی اس اچھی قسمت کا مستحق بننے کا متمنی ہو جائے۔ یہ اچھی چیزیں حاصل کرنے کے لیے مہمیز دیتا ہے۔ مادی، روحانی، اخلاقی، دینی و دنیوی ہر طرح کی اچھی، معزز و ممتاز چیزیں قابلِ رشک ہوتی ہیں۔ حلقۂ احباب اور اعزہ و اقارب کے علاوہ ان جان اور اجنبی لوگوں کے پاس بھی معزز اور قابلِ ستائش چیزیں اور قسمت کے بہترین پہلو دیکھ کر رشک محسوس ہو سکتا ہے۔

ہر حصہِ عمر میں انسانی جذبات واحساسات کی کیفیت اور نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ مقررنے چوں کہ ہر عمر کے لوگوں سے مخاطب ہونا ہوتا ہے، اس لیے ارسطو نے مقررین کی آسانی اور سہولت کے لیے جوان، ادھیڑ عمر اور ضعیف العمر انسانوں کے جذبات کی نوعیت کو بیان کیا ہے، تاکہ ان کی جذباتی کیفیت کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکے۔

## 1.1۔ نوجوان اور جذبات

نوجوان عموماً مضبوط جذبہ اور عزم، ناپائیدار اور قابلِ تغیر خواہشات، گرم مزاج، غیر متحمل، غصیلے، عزت وثروت اور فتح وبرتری کے شوقین، جنسی خواہشات میں مضبوطی کے حامل، زندگی و مستقبل سے پُر امید اور پُر اعتماد، بے خوف اور بے باک اور بااصول ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، فائدے پر اعزاز کو ترجیح دینے والے اور آگے بڑھنے کی دھن میں مگن ہوتے ہیں۔ نیز، بزرگوں کے بالمقابل ہم عمر دوستوں کی صحبت کے شوقین، تمام امور کو انتہاؤں پر انجام دینے والے، یعنی افراط کا شکار، دوسروں کی توہین کی غرض سے ان کے ساتھ غلط کرنے والے ہوتے ہیں۔

## 1.2۔ بڑھاپا اور جذبات

ضعیف ونحیف لوگوں کے جذبات نوجوانوں کے جذبات سے برعکس ہوتے ہیں۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار، بے یقین، ترش رو، تمام امور میں تفریط کا شکار، محدود ذہن کے حامل، تمناؤں سے تہی، بخیل، بزدل، سرد مزاج، زندگی سے محبت کرنے والے، بے شرم، جنسی خواہشات میں کم زور یا تہی، اعزاز پر مفاد کو ترجیح دینے والے، ماضی میں زندہ رہنے والے، مایوس، ضبطِ نفس کے حامل اور کم زور ہوتے ہیں۔

## 1.3۔ ادھیڑ عمری اور جذبات

ارسطو نے ادھیڑ عمر کے لوگوں کے جذبات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ لوگ نوجوان اور ضعیف لوگوں کے بالمقابل جذبہ، خواہش، احساس، مزاج، افعال، مقاصد اور اہداف میں افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوتے، بلکہ معتدل اور میانہ رو ہوتے ہیں۔

## 2۔ انسانی کردار اور وہبی و کسبی خصائص

انسانی کردار کا جائزہ لیا جائے تو وہبی اور کسبی خصائص اس کی شخصیت میں مترشح ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگ جن میں وہبی خصائص نہیں ہوتے، وہ کسب کے ذریعے بہت سی خوبیوں کے حامل ہو جاتے ہیں۔ وہبی اور کسبی خصائص کے حامل اشخاص کے کرداری اوصاف میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً، ایسے لوگ جن کو خاندانی طور پر بہت سے خصائص بغیر کسی محنت اور کوشش کے مل جاتے ہیں، وہ معاشرے میں فطری طور پر پُر اعتماد ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات حد سے سوا اس بے باکی اور پُر اعتمادی کی وجہ سے اعلا نسل اور خاندان

کے لوگ بھی انحطاط کا شکار ہو جاتے ہیں، جب کہ کسبی خصوصیات کا حامل شخص اپنی مہارت اور محنت کے بل پر ممتاز رہتا ہے۔

دولت مندوں پر دولت کے اثرات کی وجہ سے ان کی شخصیت کے تغیرات اور ترجیحات کو بیان کرتے ہوئے ارسطو نے بتایا ہے کہ یہ سطحی کردار کے حامل، گستاخ، متکبر، عیاش، ریاکار، خود نما اور بے ہودہ ہوتے ہیں۔ ان کے لیے مسرت، محبت، فرحت، انبساط، مقام و مرتبے اور عہدے غرض ہر شے کا معیار دولت ہے، ان کے فہم کے مطابق ہر مطلوبہ شے دولت سے کشید کی جاسکتی ہے۔ وہ محض نفس کی تسکین کی خاطر دوسروں کے ساتھ بُرا کرتے ہیں۔ بہ سطر مختصر دولت اور دولت پر بھروسا صاحبِ ثروت اشخاص کے لیے باعثِ راحت و فرحت ہے۔

اقتدار سے بننے والے کردار دولت سے بننے والے کرداروں کے مماثل مگر نسبتاً زیادہ مستحکم اور پُرعزم ہوتے ہیں۔ وہ صاحبِ ثروت ہونے کے ساتھ مقبول بھی ہوتے ہیں، اس لیے اپنی ذمہ داری اور طاقت کو محسوس کرتے ہوئے اچھے اور نمایاں کام کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں، باوقار اور محترم ہوتے ہیں۔ اگر یہ کسی کے ساتھ برا کرتے ہیں تو اس کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہوتا ہے۔

ارسطو نے تمام بنیادی جذبات، ان کے محرکات و اسباب کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ خطیب نے چوں کہ مختلف مواقع اور موضوع کی مناسبت سے مختلف جذبات ارتجالاً سامعین میں پیدا کرنے ہوتے ہیں، اس لیے اسے مختلف انسانی مزاجوں، جذبوں، ان کے محرکات اور حالات کا علم ہونا چاہیے، تاکہ وہ ان سب امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے دلائل اور تقریری مواد ترتیب دے۔ نیز، وہ ویسی ہی کیفیت خود پہ طاری کرے، جس کا بیان مقصود ہو۔ اس کے اشارات، چہرے کی کیفیات سے اسی جذبے کا اظہار ہو جسے وہ بیان کر رہا ہے۔ اس سے سامعین پر نہ صرف اچھا تاثر پڑے گا، بلکہ زبانی بیان کے علاوہ مقرر کی شخصیت سے بھی موضوع کی ترسیل و تکمیل ممکن ہو گی۔ ارسطو نے ہر عمر کے لوگوں کے جذبات، نفسیاتی کیفیات اور ان کے اسباب و محرکات کو اجمالاً بیان کیا ہے، تاکہ ہر عمر کے شخص کے جذبات اور نفسیات مقررین پر واضح ہو جائیں۔ تقریر سے پہلے وہ اس بات کا اندازہ کر لے کہ کون سے طبقے کو کس طرح موثر انداز میں اپنا پیغام پہنچانا ہے۔ عموماً مقررین نے ہر طبقے، ہر شعبے اور ہر عمر کے افراد سے مخاطب ہونا ہوتا ہے، اس لیے ان کے جذبات اور نفسیات سے آگہی اور آشنائی ضروری ہے۔ اگر مقررین جذباتی کیفیات اور عمر کے اعتبار سے ان کی ترجیحات سے واقف ہو جائیں تو بڑی سہولت سے اپنے مقاصد میں کام یاب ہو سکتے ہیں۔

## 3۔ فیصلہ کُن تقریر کے عناصر

قائل کرنے والی (Persuasive) تقریر فیصلہ کن ہوتی ہے۔ فیصلہ کن تقریر تیار کرنے کے لیے مقرر کو تین عناصر درکار ہوتے ہیں۔ پہلا عنصر یہ کہ چاہے وہ ایک فرد سے مخاطب ہو یا پورے اجتماع سے، اس کو اپنا طرزِ استدلال ایسے ہی رکھنا چاہیے، جیسے وہ ایک بڑے مجمعے سے مخاطب ہے۔ دوسرا عنصر یہ کہ مخالفین اور ہم خیال لوگوں میں طرزِ استدلال ایک جیسا مستحکم اور مضبوط ہونا چاہیے۔ تیسرا عنصر یہ کہ سامعین کو اپنا جج یا منصف سمجھتے ہوئے تقریر کرنا چاہیے۔ خواہ ایک سامع ہو یا ایک سے زیادہ، مقرر کو ہر وقت محتاط رہنا چاہیے۔ انھی عناصر کو مدنظر رکھ کر ایک فیصلہ کن تقریر کی تیاری ممکن ہے۔

## 4۔ استدلال (Logos)

بعد ازاں، ارسطو نے ان عناصر کو موضوعِ بحث بنایا ہے، جن کی مدد سے ایک مقرر ہر قسم کی تقریر کے لیے اپنے دلائل کی تیاری اور استواری میں مدد لے سکتا ہے۔

### ا۔ ممکنات اور ناممکنات

ممکنات اور ناممکنات پر مقرر عقلی دلائل استوار کر سکتا ہے۔ اگر مقرر نے ناممکنات میں سے کسی ممکن پہلو کا اثبات کرنا ہو تو وہ اس کے متضاد پہلوؤں کے ممکن ہونے کے متعلق دلیل لا کر اس کا ممکن پہلو بھی بیان کر سکتا ہے۔ وہ متضاد پہلو اگر ماضی کے کسی گوشے میں وقوع پذیر ہوئے ہوں یا لمحۂ موجود سے مترشح ہو رہے ہوں یا مستقبل میں ان کے ہونے کی صریح توقع ہو، تو مقرر ان پہلوؤں سے دلائل کا اثبات کر سکتا ہے۔ وہ مطلوبہ پہلو، جسے مقرر بیان کرنے کا خواہاں ہے، یا ایسا پہلو جو مطلوبہ پہلو کے قریب ترین ہو، وہ اگر ماضی یا حال کے گم گشتہ گوشوں میں ممکن ہوا ہو تو تقریر کی تیاری اور دلیل کے اثبات میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ہر قسم کی تقریر میں زیرِ بحث چیز اچھائی کی کسی قسم سے تعلق رکھتی ہے، خواہ وہ افادیت ہو، شرافت ہو یا انصاف۔ یہ واضح ہے کہ ہر مقرر کو انھی ذرائع سے استدلال کا مواد حاصل کرنا چاہیے۔ اس سے آگے بڑھنا، عظمت اور برتری کے تجریدی قوانین کو قایم کرنے کی کوشش کرنا، کسی دلیل کے بغیر بحث کرنا ہے۔ عملی زندگی میں مخصوص حقائق عمومیت سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔ بعد ازیں، مصنف نے دلائل کی دو بنیادی اقسام "مثال" اور "قیاسِ استثنائی" بیان کی ہیں۔

### ۲۔ مثال بہ طور دلیل

"مثال" کو مزید دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا "ماضی کے حقائق پر مشتمل دلائل" اور دوسرا "حقائق پر مشتمل مقرر کے بنائے گئے دلائل"۔ "ماضی کے حقائق پر مشتمل دلائل" سے مراد ماضی میں رونما ہونے والے واقعات سے حالیہ واقعات میں مطابقت پیدا کرتے ہوئے دلیل دینا۔ "حقائق پر مشتمل مقرر کے

بنائے گئے دلائل" کی دو ذیلی اقسام ہیں، ایک قسم مدلل توضیح اور دوسری قسم افسانہ۔ مقرر کی اپنی بنائی گئی مدلل توضیح سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے مدعا کے مماثل حقائق اور دلائل کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرے اور ان سے اپنے نکتۂ نظر کے مطابق مستحکم اور مستند دلائل تیار کرے، جب کہ افسانہ یا کہانی سے مراد یہ ہے کہ پہلے سے موجود روایتی، اخلاقی، علامتی یا تجریدی قصے کہانیوں اور اپنے مدعا میں ربط اور مماثلت پیدا کر کے انھیں بہ طور دلیل پیش کرے۔ دوسری صورت یہ بھی ہے کہ وہ خود کسی اخلاقی و روایتی نکتے پر کوئی علامتی کہانی تخلیق کر کے اس کے مندرجات اور نتائج کو مطلوبہ صورت حال یا مدعا پر بہ طور دلیل منطبق کرے۔ سیاسی مقررین کے لیے ماضی کے حقائق پر مشتمل دلائل زیادہ موزوں ہیں، جب کہ رسمی تقاریر کے لیے افسانے پر مشتمل دلائل زیادہ پُر تاثیر ہو سکتے ہیں۔ مدلل توضیح عدالتی تقاریر کے لیے نتیجہ خیز ہو سکتی ہے۔ تاہم، یہ حتمی تقسیم نہیں ہے۔ یہ تینوں صورتیں ہر قسم کی تقریر میں یکساں طور پر استعمال کی جا سکتی ہیں۔

## ۳۔ کہاوتیں بہ طور دلیل

کہاوت ایک معروف عمومی بیان ہے، جس میں عمومی سچائی کو سادہ اور سہل انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ ان سے سبھی لوگ واقف ہوتے ہیں۔ کچھ کہاوتیں عالم گیر ہیں، جب کہ کچھ مخصوص معاشروں تک محدود ہوتی ہیں۔ مصنف کے مطابق کہاوتیں منطقی دلیل کی شکل ہے۔ مختلف کہاوتوں کی مثالیں دے کر مصنف نے وضاحت کی ہے کہ مقرر موضوع کی مناسبت سے کہاوت کو بہ طور دلیل پیش کر سکتا ہے۔ کہاوتوں کی مختلف اقسام کو ارسطو یوں بیان کرتا ہے"

> "There are four kinds of maxims. In the first place, the maxims may or may not have a supplement. Proof is needed, where the statement is paradoxical or disputable; no supplement is wanted where the statement contains nothing paradoxical . . . maxims that do have a supplement aattached, some are part of an enthymemes." (۲۴)

کہاوت کے استعمال میں مقرر کو سامعین کی ذہنی استعداد اور فہمی صورت حال کا ادراک ہونا چاہیے کہ وہ کس قسم کی کہاوتوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کہاوتیں چوں کہ عمومی بیان ہوتا ہے، اس لیے سامعین کا کچھ کہاوتوں کے بارے میں پہلے ہی سے ایک مخصوص موقف ہوتا ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ اپنے موضوع سے متعلق سامعین کی رائے اور چنیدہ کہاوت یا کہاوتوں سے متعلق سامعین کی آرا کو مد نظر رکھتے

ہوئے انھیں عمومی سچائی بنا کر پیش کرے، کیوں کہ سامعین اپنی آرا کو عمومی سچائی کی صورت میں دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں۔

عوامی اقوال سے متصادم کہاوتیں اس وقت بہ طور دلیل موثر ہوتی ہیں، جب وہ مقرر کے کردار کو سامعین کے سامنے بلند کریں یا مدعا کو مستحکم تاثر کے ساتھ منتقل کریں۔ کہاوت کے استعمال میں مقرر کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ کہاوت کا مقصد جزوی طور پر کہاوت کے الفاظ کے تتبع میں موجود ہونا چاہیے۔ مقولوں کا ایک اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ تقریر کو اخلاقی کردار کے طور پر موثر بناتے ہیں۔ ہر تقریر کے اخلاقی کرادر میں اس کا اخلاقی مقصد پنہاں ہوتا ہے اور کہاوت کا بیان چوں کہ اخلاقی اصولوں کے عمومی اعلامیے کے مترادف ہے، اس لیے وہ ہمیشہ اخلاقی تاثر پیدا کرتے ہیں۔ درست اور اچھی کہاوت کا بر محل استعمال مقرر کو اچھے کردار کے حامل شخص کے طور پر پیش کرے گا، نیز جلد سمجھ میں آجانے کے باعث سامعین کا انہماک اور فکر دونوں کو مہمیز دے گا۔

## ۴۔ منطقی دلیل (قیاس استثنائی)

قیاس استثنائی یا منطقی دلیل پر تقاریر کے دلائل تیار کرتے ہوئے مقرر کو دلائل کی نوعیت سادہ اور پختہ رکھنی چاہیے تاکہ سامعین کے لیے سریع الفہم ہوں۔ عام طور پر قبول شدہ آرا کے بجائے ایسی آرا پر مبنی دلائل سے تقریر کا آغاز کرے جو مقرر کی متعین کردہ ہوں، جنھیں جج یا بااختیار لوگ تسلیم کرتے ہوں۔ امکانات کے ساتھ تیقن پر دلائل استوار کرنے چاہئیں۔ مقرر کے لیے لازم ہے کہ اسے موضوع کے بنیادی اور اصلی حقائق سے متعلق مکمل یا خاطر خواہ علم ہو، کیوں کہ اس کے بغیر عمدہ اور پختہ دلائل تیار نہیں کیے جا سکتے۔ حقیقی اور خیالی حقائق پر دلائل کو منطقی و عقلی بنیادوں پر استوار کرنا بھی دلائل کے استحکام اور قائل کرنے میں آسانی کا موجب ہو سکتا ہے، البتہ تقریر کی ابتدا ہمیشہ اصلی اور بنیادی حقائق سے ہونی چاہیے۔

دلائل کی تیاری میں مقرر کو خاص طور پر ان ممکنہ سوالات کے جوابی دلائل تیار کرنے چاہئیں، جو موضوع سے متعلق عموماً یا خاص مواقع پر پوچھے جا سکتے ہوں۔ موضوع کے قریب رہتے ہوئے دلائل دینے چاہئیں۔ مقرر کو قیاسِ استثنائی کی دو اقسام کو مد نظر رکھ کر دلائل کو ترتیب دینا چاہیے، پہلی قسم "مثبت یا منفی تجویز" ہے جب کہ دوسری قسم "تردید" ہے۔ مثبت تجویز ہم آہنگ تجاویز کا امتزاج ہے، جب کہ تردید غیر آہنگ تجاویز کا امتزاج ہے۔ بعد ازیں، مدلل اور غیر مدلل بیانات کے درمیان تفاوت کو مد نظر رکھتے ہوئے منطقی دلائل کی وضاحت اور اعتراضات کی درجہ بندی کی گئی ہے۔

### ۴.۱۔ قیاس استثنائی پر اعتراضات کے لیے ممکنہ دلائل کی متنوع صورتیں

مصنف نے دلائل کی ان ممکنہ صورتوں پر مفصل بحث کی ہے جو قیاسِ استثنائی پر اعتراضات کے ضمن میں دیے جاسکتے ہیں۔

پہلی ممکنہ صورت یہ ہے کہ سوال میں موجود مختلف پہلوؤں کو دھیان میں رکھنے سے اعتراض کے لیے مثبت دلیل اخذ کی جاسکتی ہے، ایسے اصل بات کو جھٹلانا ممکن ہے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بنیادی لفظ یا الفاظ میں ردوبدل کر کے اعراض اٹھانا۔ تیسری صورت نسبت تصورات سے دلیلِ معترضہ بنانا ہے۔ چوتھی اور اہم صورت مُسکِت دلیل بنانا، یعنی ایسی حقیقت پر دلیل بنا کر اعتراض کرنا، جسے جھٹلانا ناممکن ہو۔ پانچویں صورت، معینہ وقت کے لیے طے کی گئی باتوں سے نکتۂ اعتراض بنانا۔ چھٹی صورت، ایسی دلیل جو دوسرے مقرر کے حق میں ہو، جب پہلا مقرر اس کے خلاف بولے، یعنی مدعاعلیہ سے سوال پوچھ کر جواب کو اپنے حق میں استعمال کرنا۔ ساتویں صورت، مقرر کی شرائط کی وضاحت سے دلیلِ اعتراض پیش کرنا۔ علاوہ ازیں، کثیر المعنوی لفظ کے استعمال، منطقی تقسیم پر مبنی، عقلی ربط وضبط کے ذریعے، استقرائی یا موضوع سے متعلق مماثل یا برعکس، پہلے سے کیے گئے فیصلوں پر مبنی دلائلِ معترضہ ترتیب دینا۔ مبینہ موضوع کو مختلف حصص میں منقسم کر کے کسی ایک حصے سے اعتراضی نکتہ بنالینا، ایک پہلو کے اچھے اور بُرے نتائج کو پیش کرتے ہوئے مطلوبہ موضوع کے حق یا مخالفت میں دلائل دینا، کسی واقعہ یا چیز کی حالت کے ممکنہ یا حقیقی محرک پر دلیل استوار کرنا، موقعے کی مناسبت سے دو باہم برعکس (مثبت اور منفی) طریقوں کے تحت کسی ایک طریقے سے کسی کی حوصلہ افزائی یا حوصلہ شکنی کرتے ہوئے دلائل برتنا۔ جو شے خفیہ طور پر قابلِ قبول ہوتی ہے، وہ عموماً کھلے عام ناقابلِ قبول ہوتی ہے، جیسے منصفانہ پہلوؤں کے بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دینا، مقرر قیاسِ استثنائی پر اعتراض اٹھاتے ہوئے مخالف کے خفیہ نکتۂ نظر پر دلیلِ معترضہ بنا سکتا ہے۔ اس حقیقت کے استعمال سے اعتراضی نکتہ بنانا کہ انسان بعد کے موقعے پر پہلے موقعے جیسا انتخاب نہیں کرتا۔ عدالتی اور ارادی تقاریر کے ضمن میں کسی عمل کے محرک یا عمل نہ کرنے کی رکاوٹوں کو زیرِ غور لا کر دلائل تیار کرنا اہم ہے۔ علاوہ بریں، ناقابلِ یقین نظر آنے والے حقائق پر دلیل تیار کر کے ثابت کرنا، مخالف کے کیس کو تواریخ، اعمال یا الفاظ کے تفرق وتضاد میں الجھا کر رد کر دینا، مخالف کے کردار کو متنازع بنا کر ناقابلِ اعتبار کرنا، مطلوبہ معاملے کی وجہ کے اثبات یا نفی میں دلائل دے کر اس کی حمایت یا مخالفت کرنا، ملزم کے عمل کے محرک پر غور کر کے دفاع یا الزام پر دلائل بنانا، ارادتاً کیے گئے اعمال کا ماضی کے عمل یا اعمال سے تصادم کی صورت میں دونوں کا اکٹھے مطالعہ کر کے اعتراضی نکتے بنانا اور سابقہ اغلاط کو الزام یا دفاع کی بنیاد بنا کر دلائل اور اعتراضات کی ترتیب و توضیح کرنا۔

قیاسِ استثنائی پر اعتراضات کی اساسی صورتوں کو بیان کرنے کے بعد مصنف نے وضاحت کی ہے کہ تردیدی قیاسِ استثنائی چوں کہ سریع الفہم ہوتے ہیں، اس لیے سامعین کے لیے پسندیدہ ہوتے ہیں۔ تاہم، ہر وہ منطقی دلیل پسندیدہ ہوگی جو سہل الفہم ہو، خواہ تردیدی ہو یا تعمیری۔

## ۴.۲۔ حقیقی نظر آنے والے غیر حقیقی قیاسات استثنائی

ایسے قیاسات استثنائی جو بہ ظاہر حقیقی ہوتے ہیں، مگر دراصل حقیقی نہیں ہوتے، ان کا سمجھنا مقرر کے لیے اہم ہے۔ ایک، وہ مخالفین کی طرف سے دیے گئے غیر حقیقی قیاساتِ استثنائی کو سمجھ کر بہ آسانی اعتراض اٹھا سکتا ہے؛ دوم، دلائل کی تیاری میں وہ خود ایسی غیر حقیقی منطق کے استعمال سے بچ سکتا ہے اور سوم، دلائل نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کا سہارا لے سکتا ہے۔ ایسے دلائل کی ممکنہ صورتیں یہ ہو سکتی ہیں:

مخصوص الفاظ کے استعمال سے دلائل تیار کرنا، مکمل بات کو اجزا میں توڑ کر یا منتشر اجزا کو ایک مکمل بات میں سمیٹ کر دلائل بنانا، پختہ دلیل کے بجائے غصے والی زبان کا استعمال کر کے خود کو حق بہ جانب ثابت کرنا، محض ایک علامت یا ایک مثال کو عمومی بنا کر بہ طور دلیل پیش کرنا، مظہر کی اتفاقیہ وجہ کو حقیقی وجہ بنا کر پیش کرنا، ظاہری نتائج سے دلیل بنانا، اتفاقیہ یا ظاہری اسباب کو حقیقی بنا کر پیش کرنا، وقت اور ماحول میں سے محض کوئی ایک پہلو اٹھا کر دلیل بنانا، جیسے آزاد آدمی پر حملے کو اشتعال انگیزی قرار دینا، جب کہ یہ صرف اس صورت میں اشتعال انگیزی ہے جب بلا وجہ ہو۔ علاوہ ازیں، جعلی منطق تشکیل دینا، جیسے غیر متوقع چیزیں ہو جاتی ہیں، اس لیے غیر ممکن چیزیں بھی ممکن ہو جاتی ہیں۔

## ۴.۳۔ تردید

مثبت یا منفی تجاویز کے علاوہ قیاسِ استثنائی کی دوسری قسم "تردید" ہے۔ تردید دو طرح سے ممکن ہے: ۱۔ جوابی منطق سے جو حقیقی منطق کی بنیادوں پر استوار کی جاتی ہے۔ ۲۔ اعتراض کے ذریعے تردید، اس کی چار بنیادی ممکنہ صورتیں ہیں۔ مخالف کے بیان پر براہ راست حملہ کر کے، مخالف کے بیان کے مماثل بیان پیش کر کے، بیانِ مخالف سے متصادم بیان پیش کر کے یا حالیہ صورت حال کے مماثل صورتوں میں گزشتہ کیے گئے فیصلوں کا حوالہ دے کر۔ قیاسِ استثنائی چار مبینہ حقائق پر مشتمل ہے: امکانات، مثالیں، یقینی علامات اور عمومی علامات۔ امکانات پر مبنی قیاسِ استثنائی "عمومی سچ کیا ہے یا عمومی سچ کیا سمجھا جاتا ہے" سے بحث کرتا ہے۔ مثال پر مبنی قیاسِ استثنائی "مماثل معاملات پر استقرائی طریقے سے ہوتے ہوئے عمومی تجویز قایم کرتے ہیں اور خاص استدلال سے استخراجی طریقے سے بحث" کرتے ہیں۔ یقینی علامات پر مشتمل قیاسِ استثنائی "اٹل اور ناقابلِ تغیر پہلوؤں سے بحث" کرتے ہیں، جب کہ عمومی علامات کے حامل قیاسِ استثنائی "عالم گیر یا مخصوص، درست یا غلط تجویز سے بحث" کرتے ہیں۔ قیاسِ استثنائی پر اعتراض اٹھانے کے لیے مقرر کو اس کی چاروں

صورتیں مد نظر رکھ کر پہلے قیاس استثنائی کی درست تفہیم کرنی چاہیے۔ بعد ازیں، پیش کردہ صورت کے مطابق اعتراض کو درست نہج پر تیار کرنا چاہیے، تاکہ اعتراض نتیجہ خیز رہے۔

مصنف نے یہ واضح کیا ہے کہ "وسعت اور فرسودگی" قیاسِ استثنائی کا لازمہ یا عنصر نہیں ہے، بلکہ "اچھا، برا" یا "جائز، ناجائز" کی طرح یہ بھی قیاس استثنائی کی ایک شکل ہے۔

## III۔ "ریطوریقا"۔حصہ سوم

### 1۔ تقریر کا انداز اور ترتیب و تنظیم

تقریری مواد کی ترتیب اور مختلف تقریری حصص میں منطقی ربط و ضبط کا ہونا تقریر کے ایسے نکات ہیں، جو مدعا و مقصد کی سریع ترسیل اور اثر انگیزی میں اضافے کا موجب و سبب بنتے ہیں۔ نیز، یہ نکات مقرر کے لیے تحفیظِ مدعا و دلائل میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ کتاب کے تیسرے حصے میں مصنف نے تقریر کے انداز و زبان اور ترتیب و تنظیم کو بحث کیا ہے۔

### 1.1 تقریر کا انداز اور زبان

#### ا۔ آواز کا اتار چڑھاؤ اور ردھم

"اندازِ بیان" موثر ترسیلِ مدعا میں سب سے اہم ہے۔ دلائل جس قدر بھی پختہ اور موضوع جس قدر بھی مدلل ہو، تب تک پُر تاثیر نہیں ہو سکتا، جب تک اس کو بیان کرنے کا انداز موثر نہیں ہو گا۔ تقریر چوں کہ بولنے سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اندازِ بیان میں سب سے اول عنصر "آواز اور لہجہ" ہے۔ موقعے اور موضوع کے مطابق آواز کے مناسب اتار چڑھاؤ، مطلوبہ گونج اور ردھم کا فطری استعمال مقرر کی بات کے اثر کو بڑھاتا ہے۔ لہجے کی سختی، نرمی اور میانہ روی کو مدعا اور دلائل کی نوعیت کے مطابق برتنا تاثیرِ تقریر کا باعث بنتا ہے۔ نیز، متعلقہ اشعار اور شعری زبان کا استعمال ترسیلِ مدعا کو زود اثر بناتا ہے۔ الفاظ انسان کے نمایندہ ہوتے ہیں، لہٰذا، اچھے، مناسب اور خوب صورت الفاظ کا استعمال تاثرِ تقریر کو فزوں کرتا ہے۔

#### ۲۔ واضح اندازِ بیان

مقرر کا طرزِ بیان واضح اور غیر مبہم ہونا چاہیے۔ عام فہم اور مروجہ الفاظ کا بر محل استعمال طرزِ ادا کو واضح اور سریع الفہم بناتا ہے۔ روایتی انداز کے برعکس تقریر کو نیا اور اچھوتا انداز دینا بھی وضاحت اور اثر کو بڑھاتا ہے۔ بیانِ مدعا میں لہجے کا تاثر فطری ہونا چاہیے، کیوں کہ فطری پن تحریک و ترغیب پیدا کرتا ہے۔ اجنبی الفاظ، مرکب الفاظ اور اپنے اختراع کردہ الفاظ کو موقعے اور سامعین کی مناسبت سے استعمال کرنا بھی مدعا کی وضاحت میں معاون ہوتا ہے۔ فحش زبان اور بدگوئی سے اجتناب مقرر کے کردار اور تقریر کی تاثیر کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ خوب صورت، مناسب، بر محل اور سریع الفہم استعارات کا استعمال اندازِ بیان کو

واضح اور خوب صورت بناتا ہے۔ مقرر کو کسی کی توصیف کے لیے مثبت اور تذمیم کے لیے منفی استعارات کا استعمال برتنے کا ہنر آنا چاہیے۔

> "The materials of metaphor must be beautiful to the ear, to the understanding, to the eye or some other physical sense."(۲۵)

### ۳۔ زبان کی بدمزگی

زبان و بیان میں بدمزگی تقریری تاثر اور مقرر کے کردار کو الجھا دیتی ہے۔ بدمزگی پیدا ہونے کی مختلف ممکنہ صورتیں ہیں۔ جیسے، مرکب الفاظ کا غلط استعمال، اجنبی الفاظ کا استعمال، طویل، بے محل اور بہ کثرت اسمائے صفت کا استعمال، غیر موزوں اور اجنبی استعارات کا استعمال تقریر کو سامعین کے لیے اجنبی، بے تاثر اور مبہم بنا دیتا ہے۔ لہٰذا، مقرر کو زبان و بیان کی فطری روانی اور خوب صورتی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

### ۴۔ تشبیہ کا استعمال

مصنف کے مطابق تشبیہ اور استعارے کے محض بیان میں معمولی تفاوت ہے، ورنہ دونوں ایک ہی جیسی ہیں۔ "وہ دشمن پر شیر کی طرح جھپٹا ہے" یا "وہ شیر دشمن پر جھپٹا ہے" دونوں میں بہادری پر شیر کی بہادری کا اطلاق کیا گیا ہے۔ اول الذکر تشبیہ ہے، موخر الذکر استعارہ۔ مصنف کے مطابق، تشبیہ شاعرانہ فطرت کی حامل ہے، اس لیے تقریر میں تشبیہ کو بھی استعارے کی صورت برتنا مناسب ہے۔

### ۵۔ زبان پر دسترس

مقرر کی زبان کا قواعد و انشا کے مطابق درست ہونا بے حد اہم اور ضروری ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے پانچ نکات کی نشان دہی کی ہے، جن کی درستی مقرر کی زبان کو درست اور موزوں بنانے میں معاونت کرتی ہے۔ حروفِ عطف کے درست استعمال اور فطری ترتیب میں تنظیم، اشیا کو مروجہ مخصوص ناموں سے پکارنے اور عمومی غیر مبہم ناموں سے پرہیز کرنے، مبہم الفاظ، تراکیب، مرکبات اور اصطلاحات کے استعمال سے گریز کرنے، اسما و اشیا کی درست تذکیر و تانیث کو ملحوظ رکھنے، کثرت، کمی اور جمع کی ادائیگی کے لیے درست الفاظ و مرکبات کا استعمال کرنے اور برمحل اوقاف کے ساتھ بولنے کا فن مقرر کے اندازِ بیان کو واضح اور پُرتاثیر بناتا ہے۔

### ۶۔ زبان کی تاثیر بڑھانے کے عناصر

زبان کی تاثیر کو بڑھانے کے لیے مصنف نے چند نکات کی نشان دہی کی ہے: غیر مہذب الفاظ کے استعمال سے اجتناب برتنا زبان کو پُرتاثیر بناتا ہے۔ کسی غیر مہذب نام کے بجائے اس کی وضاحت سے بات

سمجھانا یا وضاحت کے غیر مہذب ہونے کی صورت میں کسی مہذب اصطلاح کے ذریعے بات سمجھانا مناسب ہے۔ استعارات، اوصاف و علامات کو شاعرانہ تاثرات سے محفوظ رکھ کر بیان کرنا، واحد کے لیے جمع کا لفظ استعمال کرنا، موقعے، وقت اور موضوع کی مناسبت سے درست حروف عطف کا استعمال اور صفات و خصوصیات کا مناسب تذکرہ زبان و بیان کی تاثیر میں اضافے کا سبب و موجب بنتے ہیں۔

### ۶.۱۔ معقول زبان

زبان موضوع، جذبات اور کردار سے مطابقت رکھتی ہو۔ کیوں کہ زبان کی معقولیت ہی موضوع کو پُر اثر بناتے ہوئے سامعین کو قائل کر سکتی ہے۔ مدعا کو صداقت و اصلیت کی علامات میں ڈھال کر ثابت کرنے سے تقریر کے تاثر کے ساتھ ساتھ مقرر کی قدر و منزلت بھی بڑھتی ہے۔ سامعین کے امزجہ کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کو ایسی زبان کا استعمال کرنا چاہیے جو مجموعی طور پر ہر ایک کے لیے قابلِ فہم ہو۔ الفاظ کی نوعیت اور صحت کے مطابق مقرر کے لہجے اور اتار چڑھاؤ کا تناسب زبان کی معقولیت اور بیان کی تاثیر کا موجب ہے۔ نثری زبان میں ردھم اور موسیقیت اس کے وقار اور تاثر کو بڑھاتی ہے، تاہم یہ ملحوظ رہے کہ نثری زبان میں عروض کا عمل دخل اس کی صحت کو متاثر کرتا ہے، کیوں کہ عروضی زبان شاعری کا خاصہ ہے۔ موسیقیت نثر کا حُسن ہے جب کہ عروض اس کا قبیح پہلو ہے۔

### ۶.۲۔ زبان کی روانی

تقریر کی نثری زبان آزاد ہونی چاہیے، یعنی اس کی روانی میں غیر فطری رکاوٹیں اور ابہام نہیں ہونا چاہیے۔ موضوعِ تقریر بعض اوقات مختلف حصص میں منقسم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ہر حصہ مکمل و مدلل اور مناسب اوقاف میں بیان ہونا چاہیے، نیز حصوں کی منطقی ترتیب اور ربط کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ حصص ایک رکن پر مشتمل بھی ہو سکتے ہیں اور ایک حصہ یا کچھ حصص مختلف ارکان پر مبنی بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا، مقرر کو ہر حصے کی توضیح و تفصیل اس کی نوعیت اور ارکان کے مطابق کرنی چاہیے، ورنہ سامعین الجھاؤ اور ابہام کا شکار ہو کر اکتاہٹ محسوس کریں گے۔ تمہید اور اصل موضوع میں منطقی ربط کا خیال رکھنا بے حد اہم ہے، نیز مختصر اور جامع تمہید موثر تقریر کی بنیاد ہے۔ اینٹی تھیسز بیانات اور دلائل میں بھی یہ خصائص ملحوظ رکھتے ہوئے مواد کی ترتیب و تنظیم کرنی چاہیے۔

## ۷۔ متفرق خصائص

مصنف کے مطابق محولہ بالا خصائص فطری قابلیت یا متواتر مشق کے ذریعے پیدا اور پختہ کیے جا سکتے ہیں۔ سامعین کے لیے وہ الفاظ زیادہ قابلِ قبول ہوتے ہیں جو نئے افکار کی تفہیم و توضیح کرتے ہیں۔ اس مقصد

کے لیے منفرد مگر واضح استعارات اور تشبیہات کا استعمال موزوں ہے۔ تشبیہ، استعارہ، حقیقت اور اینٹی تھیسز میں ربط اور توازن ملحوظ رکھتے ہوئے دلائل کی ترتیب اور تقریر کی تنظیم ناگزیر ہے۔

زبان و بیان کی مختلف صورتوں سے سامعین کو قائل کرنا دو طریقوں سے ممکن ہے۔ اول، زبان یا استعارات کو اس انداز سے استعمال کرنا کہ جس صورت حال کو دکھانا مقصود ہو، وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا محسوس کریں۔ یعنی، الفاظ و تراکیب کا حسن و خوبی اور باہمی ربط ایسا ہو کہ مطلوبہ مقصد سامعین کے اذہان پر ان مٹ نقش کی طرح ثبت ہو جائے۔ دوم، زبان اور لب و لہجے کا ایسا مکمل امتزاج کہ سامعین پر موضوع اور مدعا کی اثر انگیزی مسلّم ہو جائے۔ اس ضمن میں مصنف نے تصویری (Graphic) استعارات اور نسبتی (Proprtional) استعارات کے استعمال پر زور دیا ہے۔ تصویری استعارات میں کسی بصری مظہر یا تصویر کو بہ طور استعارہ استعمال کر کے کسی خیال کی توضیح کی جاتی ہے، جب کہ نسبتی استعارے میں دو مظاہر کی نسبت سے استعارہ اخذ کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، بے جان چیزوں کو متحرک کرنے کے تاثر سے اور جان دار اشیا کے تحرک میں مبالغہ پیدا کر کے استعارات تخلیق کیے جاسکتے ہیں۔ تقریر کی زبان نثری ہے اور نثری زبان میں استعارات کا استعمال موجبِ تاثیر ہے، اس لیے تقریر میں مختلف، منفرد اور عام فہم استعارات کا استعمال بیان و مدعا کی ترسیل و تاثیر کو بڑھاتا ہے۔

متفرق اقسامِ خطابت مختلف اندازِ اظہار اور طرزِ بیان کی حامل ہوتی ہیں۔ تحریر و تقریر کے انداز باہمی تفاوت رکھتے ہیں۔ تحریر کے بعض محاسن تقریر کے ضمن میں معائب کا درجہ رکھتے ہیں، بعینہٖ کچھ تقریری خصائص تحریر کے ضمن میں معیوب ہو جاتے ہیں۔ تحریر کے دوران ہجوں اور الفاظ کی تحریری صورت کا درست ہونا اہم ہے، جب کہ تقریر میں درست تلفظ کے ساتھ موثر گفتار کا فن مقدم ہے۔ تحریر میں مفہوم کی ترسیل تدریجاً ہوتی ہے، لہٰذا ٹھہراؤ کے ساتھ ارتجالاً مدعا بیان کیا جاتا ہے۔ برعکسِ ازیں، تقریر میں فوری ترسیل کے پیشِ نظر زبان، لہجے، جذبات اور مدعا میں ایسا ربط و ضبط بنایا جاتا ہے جس سے فوری تفہیم و ترسیل ممکن ہو سکے۔ نیز، جذبات ابھارنے والے، شدت کے تاثر پر مبنی الفاظ اور جملوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے الفاظ اور جملوں کی تکرار سے ترسیل و تاثر کو مستحکم کیا جاتا ہے۔ الفاظ اور جملوں کی تکرار تقریر کی خوبی ہے، جب کہ بہ صورت تحریر یہی پہلو خامی بن جاتا ہے۔ تقریر میں مترادف الفاظ اور جملوں کے استعمال سے تاکید کی کیفیت پیدا کر کے فہمِ عامہ کو متوجہ رکھا جاتا ہے، جب کہ تحریر میں مترادفات کا کم استعمال خوبی کا درجہ رکھتا ہے۔ تقریر میں ایک انسان کے بارے میں بات کرتے ہوئے، اس کے نام کی تکرار سے تاثر پیدا کیا جاتا ہے، جب کہ تحریر میں اسمائے ضمائر کا استعمال مستحسن ہے۔

عوامی تقاریر میں جامع اور مختصر اختتام پُر تاثیر ہوتا ہے، جب کہ عدالتی تقاریر میں اعلا اور مفصل اختتام موثر ہوتا ہے۔ جن تقاریر میں فوری ترسیل مقصود ہوتی ہے، وہاں اعلا اختتام کے بجائے مقرر کی مستحکم اور پختہ آواز بہ طور اثر کام کرتی ہے۔ طوالت اور اختصار کے مابین معتدل انداز اپناتے ہوئے، معمولی و غیر معمولی الفاظ کے امتزاج، ردھم اور موثر انداز و الفاظ سے موزوں دلائل تیار کرنا ہر قسم کی تقریر کے لیے نہایت موزوں اور نتیجہ خیز ہے۔

## 2۔ تقریر کی ترتیب و تنظیم

تقریر کی ترتیب و تنظیم کے ضمن میں مصنف نے واضح کیا ہے کہ 'تعارف' کے بعد تقریر کے دو بنیادی حصے ہیں، ایک "بیان" اور دوسرا "دلائل (اثباتِ بیان)۔ علاوہ ازیں ہر قسم کی تقریر میں موضوع کے اعتبار سے بنیادی حصے مزید کئی ضمنی حصوں یا ارکان میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ جیسے، عدالتی تقاریر میں دلائل کا حصہ مزید "مخالف کے استدلال کے جوابی دلائل، مخالف کے اعتراضات کے جوابی بیانات، دفاعی دلائل" پر مشتمل ہو سکتا ہے۔ تقریر میں منطقی ربط اسی صورت میں ممکن ہے جب اس کے بنیادی حصوں کی ترتیب، تنظیم اور ہم آہنگی کو ملحوظ رکھا جائے۔ اختتام تقریر کا خلاصہ ہوتا ہے، یہ ہر تقریر کا لازمہ نہیں ہے، البتہ تقریر کے حسن اور تاثر کی افزونی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اختتام میں تقریر کے بنیادی نکتوں کو سمیٹنا چاہیے، تاکہ بنیادی مدعا صریحاً سامنے آجائے۔

### ۱۔ تمہید

مصنف کے مطابق پیچیدہ اور مشکل مدعا کی حامل تقاریر میں تمہید لازمی جزو ہے۔ اس کے برعکس تقاریر میں یہ اضافی ہے۔ یہ دراصل بیانِ مدعا کی وضاحت کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ تمہید کا مقصد چوں کہ سامع کو موضوع کے بیان سے پہلے اس سے آگاہ کرنا ہے، اس لیے یہ غیر مبہم اور واضح ہونی چاہیے۔

> "Give them a grasp of beginning, and they can hold fast to it and follow the argument." (۲۶)

تمہید اور اصل موضوع میں مطابقت لازم ہے۔ موضوع کی مناسبت سے تمہید میں تذمیم و تحسین، مشورے، اصلاحی یا سامعین سے اپیل کے پہلو رکھے جاسکتے ہیں۔ سامعین سے اپیل مطلوبہ معاملے پر اس کی سنجیدہ توجہ حاصل کرنا ہے، اس لیے تمہید میں سامعین کی نفسیات اور خواہشات کے مطابق پہلو شامل کیے جانے چاہئیں۔ تمہید مختصر، جامع اور پُرکشش ہونی چاہیے۔ ایسے مواد کو تمہید میں شامل کیا جانا چاہیے جو سامعین میں موضوع سے متعلق جاننے کی تشنگی بڑھائے۔

### ۲۔ بیان

عوامی یا رسمی تقریر میں بیان یک بارگی نہیں، بلکہ وقفوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ بیان کا ایک حصہ مدلل طریقے سے پیش کرنے کے بعد دوسرے حصے پر استدلال کیا جاتا ہے، اسی طرح بقیہ تمام حصص یکے بعد دیگرے دلائل کے ساتھ واضح کیے جاتے ہیں۔ مقرر کا بیان مختصر اور طویل کی بحث سے مبرا اور وضاحت کا آئینہ دار ہو۔ علاوہ ازیں، بیان میں شامل ہر بات سریع الفہمی صفت سے آراستہ ہو۔ بیان ایسا ہو، جس سے سامعین کا مقرر پر اعتماد پختہ ہو۔ بیان خطیب کے کردار اور اخلاقی مقصد کا اقرار ہونا چاہیے۔ بیان میں جذبات اور ان کے مقبول مظاہر ہونے چاہئیں، جو مقرر اور اس کے حریف کو ممیز کرتے ہیں۔ سیاسی تقاریر میں بیانیے کی گنجائش کم ہوتی ہے، کیوں کہ یہ مستقبل کے متعلق ہوتی ہے، لہٰذا جو کچھ ابھی ہوا نہیں، اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سیاسی تقاریر میں پیش گوئی ممکن ہے مگر بیان کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ مقرر کا فرض ہے کہ وہ جو بھی بیان دے اس کے اثبات کے لیے مستند دلائل و براہین سے سامعین کو مطمئن کرے۔ چوں کہ دلائل ہی تقریر کو موثر اور معتبر بناتے ہیں، لہٰذا مصنف نے یہاں دلائل، ان کے استعمال اور نوعیت کے متعلق بحث کی ہے۔

## ۳۔ دلائل (اثباتِ بیان)

مقرر کے تمام دلائل واضح ثبوتوں پر مبنی، مستحکم اور متذکرہ معاملے یا معاملات سے براہ راست متعلق ہوں۔ اثباتِ بیان میں مقرر کو مختلف قسم کے دلائل کی منطقی ترتیب اور باہمی ربط کا خیال رکھنا چاہیے۔ اگر مقرر دیگر مقررین سے پہلے تقریر کر رہا ہے تو بیان کے اثبات میں اس کے دلائل کی منطقی ترتیب یہ ہونی چاہیے۔ سب سے پہلے مقرر اخلاقی دلائل کا سہارا لیتا ہے اور اپنے بیان کی تفہیم و ترسیل میں مدد حاصل کرتا ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مقرر پر سامعین کا اعتماد اور تیقن بڑھ جاتا ہے۔ اخلاقی دلائل کے بعد وہ منطق پر مبنی دلائل سے اپنے بیان کو ثابت کرتا ہے، کیوں کہ منطقی دلائل کی تردید کرنا یا ان پر اعتراض اٹھانا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ منطقی دلائل کا استعمال عقلی طور پر سامعین کو مطمئن کرتا ہے۔ علاوہ ازیں، اپنے موقف کی تائید کے لیے تعمیری دلائل دیے جاتے ہیں۔ جب کہ موقف کی مخالفت میں اٹھنے والے اعتراضات کے جواب میں تردیدی دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔ مصنف کے مطابق تردیدی دلائل تعمیری دلائل سے بہتر ہیں، کیوں کہ وہ آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اختتام سے قبل بیان کے اثبات میں مقرر کو حکمت کے عمومی اصولوں اور کہاوتوں پر مشتمل متعلقہ دلائل پیش کرنے چاہئیں۔ اس سے مدعا مزید واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

اگر مقرر سے پہلے مخالف نظریات رکھنے والا مقرر یا مقررین موثر تقریر کر کے اپنے نظریے پر سامعین کو مطمئن کر چکے ہوں تو ایسی صورت میں مقرر کے اثباتِ بیان میں دیے جانے والے دلائل کی ترتیب و تنظیم اس طرح ہو گی: سب سے پہلے مضبوط آہنگ و انداز میں پختہ، مستند اور منطقی و اخلاقی جوابی دلائل کا

استعمال کرتے ہوئے وہ پہلے پیش کردہ نظریات یا ان کے بنیادی اور اہم نکات کی مستحکم تردید کرے۔ سامعین کے ذہن کو پچھلے نظریات سے غیر مطمئن کرنے کے بعد اپنے مدعا کے لیے ان کے اذہان و افکار میں جگہ بنائے۔ بعد ازیں، دلائل کی منطقی ترتیب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اخلاقی، عقلی و منطقی، حکمتی اصولوں اور کہاوتوں پر مبنی دلائل کو پیش کر کے سامعین و حاضرین کو اپنے موقف اور بیان پر مطمئن کرے۔

عدالتی تقاریر میں دیے جانے والے دلائل واضح، براہ راست معاملے سے متعلق، قیاس استثنائی پر مبنی، منطقی اور جامع ہونے چاہئیں۔ منطقی دلائل کا حدِ تعد دلازم ہے، کیوں کہ منطقی دلائل کی بے جا کثرت سے بعض اوقات دیے گئے دلائل آپس میں ایک دوسرے کی نفی کرنے لگتے ہیں؛ ایسی صورت حال مقرر کے لیے سنگین ہو سکتی ہے۔ لہٰذا، منطقی دلائل کے استعمال میں حزم و احتیاط برتنا ضروری ہے۔ علاوہ بریں، ہر نکتے پر قیاس استثنائی بنانے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے، اس سے فلسفے کا ماحول جنم لے گا، جو صورت حال کو پیچیدہ اور ناقابلِ فہم بنا سکتا ہے۔ کسی جذبے، احساس یا اخلاقی نکتے کے اثبات میں منطق کو استعمال کرتے ہوئے اس کی ہیت سے صرفِ نظر کرنا اور نوعیت کو مدنظر رکھنا اہم ہے، ورنہ اس کا تاثر زائل ہو جائے گا۔ عوامی تقاریر میں بیان کو عمدہ اور مفید ثابت کرنے کے لیے مثالوں، حکمت کے عمومی و خصوصی اصولوں، کہاوتوں، حکایتوں یا مروجہ اخلاقی و علامتی کہانیوں پر مبنی دلائل پیش کیے جانے چاہئیں۔ عوام کے لیے سادہ اندازِ بیان میں خیالاتِ نو کو سمجھنا، سیکھنا اور اپنانا زیادہ قابلِ قبول اور پسندیدہ ہوتا ہے۔

سیاسی تقاریر میں منطقی دلائل بھی موثر و مرسل ہوتے ہیں۔ تاہم، ان تقاریر میں مثالوں سے اثباتِ بیان زیادہ موزوں ہے۔ اس قسم کی تقاریر مستقبل سے متعلق ہوتی ہیں، اس لیے ماضی کے واقعات کا حالیہ اور مستقبل میں ممکنہ واقعات کے ساتھ منطقی، اخلاقی، زمینی یا زمانی ربط قایم کر کے دلائل پیش کرنا مدعا کو سریع الاثر اور قابلِ فہم بناتا ہے۔

تفتیش کے ذریعے اثباتِ دلائل عموماً عدالتی تقاریر میں موثر و موزوں ہیں۔ مصنف نے ان صورتوں کو بیان کیا ہے، جن میں تفتیشی ذریعہِ استدلال سے اثباتِ مدعا ممکن ہے۔ اول، ایسی صورت حال جب مخالف نے استفہام کا اس قدر جواب دیا ہو کہ ایک اور جواب اس کی دلیل کو لغو اور فضول ثابت کر دے۔ دوم، جب مخالف کی دلیل کا ایک نکتہ صریح حق ہو تو اس سے متعلق ایسا سوال اٹھانا کہ اسے اثبات میں جواب دینا پڑے، جو مقرر کی دلیل کی حمایت کرے۔ سوم، جب مخالف اپنے الفاظ یا عمومی حقیقت سے متصادم بات کرے۔ چہارم، جب مخالف جواباً منطقی دلیل تلاشتے ہوئے ٹال مٹول کرنے لگے۔ پنجم، جب مخالف جواباً الجھ کر بدحواسی کا شکار ہو جائے۔ متذکرہ صورت حال میں سے کوئی صورت پیدا ہو جائے تو مقرر تفتیشی استفہام کے ذریعے اپنے بیان اور دلائل کو سچ ثابت کر سکتا ہے۔ یہاں مصنف صریحاً یہ تنبیہ بھی کرتا ہے کہ اس کے علاوہ

دوسرے حالات میں تفتیشی طریقہ کار اپنانے سے اجتناب برتنا مناسب ہے، بہ صورت دیگر خود مقرر کو بُرا گردانا جائے گا۔

بعد ازیں، مصنف مقرر کو مخالف کے تفتیشی طریقہِ استدلال کا نشانہ بننے سے بچاؤ کے چند مفید نکتے بتاتا ہے۔ حریف اگر نتیجہ اخذ کرتے ہوئے سوال کی شکل میں سامنے رکھے تو مقرر کو اپنا جواب اور جواز مستحکم انداز میں پیش کرنا چاہیے، تاکہ حریف کو تفتیشی استدلال کا موقع نہ ملے۔ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد سوال پوچھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ حریف کے مزاح کو سنجیدگی میں ڈھال کر یا سنجیدگی کو مزاح کا رنگ دے کر اس کے دلائل کو کم زور کرنا بھی تفتیشی ذریعہِ استدلال سے محفوظ رہنے کی ایک صورت ہے۔

### ۴۔ اختتامیہ

تقریر کے اختتامیے کو ارسطو نے چار حصوں میں منقسم کیا ہے، یعنی، اختتامیے میں چار پہلو شامل ہونے چاہئیں۔ سب سے پہلے سامعین کا رویہ اپنے لیے مثبت اور مخالفین کے لیے منفی بنانا ہے۔ اس ضمن میں اپنے نظریات کی سچائی کے اثبات کے لیے ان کو سراہنا اور مخالف نظریات کے کذب کا تاثر دیتے ہوئے ان پر تنقید اہم ہے۔ بعد ازیں، نمایاں اور ثابت شدہ حقائق کی اہمیت کو بڑھانے یا گھٹانے کے ضمن میں بات کرنا۔ تیسرے حصے میں سامعین کے مطلوبہ جذبات کو مقصودہ حالت پر ابھارنا اور آخر میں اپنے بیان اور دلائل کا اجمالاً اور مستحکم تذکرہ کرنا تاکہ مدعا سامعین کے ذہن نشین ہو جائے۔ یہاں مخالف کے دلائل پیش کر کے اس کے بالمقابل اپنے نمایاں اور منطقی دلائل پیش کر کے بھی مدعا کی وضاحت اور تقریر کا اختتام ممکن ہے۔ ارسطو کے مطابق اختتام کے لیے زبان کا منقطع انداز مناسب ہے۔ یہ تقریر اور فصیح تقریر کے مابین فرق واضح کر دیتا ہے۔

> "I've done. You've heard me. The facts are before you. I ask for your judgement." (۲۷)

اپنے دلائل کو مستحکم اور مدعا کو قطعی انداز میں پیش کرنے کے بعد عاجزانہ رویہ اپناتے ہوئے فیصلہ سامعین پر چھوڑ کر انھیں خود انتخاب کا تاثر دینا، مقرر کے نظریے، مدعا، مقصد اور استدلال کو مستحکم کرتا ہے۔

# حوالہ جات


۱. وارث سرہندی، علمی اردو لغت جامع، علمی کتاب خانہ، لاہور، س ن، ص ۶۷۸۔

۲. وارث سرہندی، علمی اردو لغت جامع، علمی کتاب خانہ، س ن، ص ۴۵۸۔

۳. نور اللغات (جلد دوم)، حلقہ اشاعت، لکھنو، س ن، ص ۵۹۸، ۲۱۱۔

۴. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، مطبوعاتِ چٹان، لاہور، ص ۱۵۔

۵. محمد احتشام کٹونوی، فن خطابت، دی پرنٹ لائن، پٹنہ-۴، ۲۰۰۹ء، ص ۶۔

۶. سید کلب مصطفیٰ، فنِ خطابت، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، باراول، دسمبر ۱۹۵۸۷، ص ۱۶۔

۷. ارسطو طالیس، الخَطابة، الترجمة العربية القديمة، تحقيق و تعليق / عبد الرحمان بدوي، مكتبه النهفضه المصريه، القاہرہ، ۱۹۵۹، ص ۹۔

۸. احمد محمد الحو، فن الخَطابة، نہضة مصر، القاہرہ، ص ۵۔

9. https://www.merriam-webster.com/dictionary/rhetoric

10. https://plato.stanford.edu/entries/aristotle-rhetoric/

11. http://www.mesacc.edu/~bruwn09481/Syllabi/documents/htm/ArtRetoric/index.htm

12. https://rhetoric.sdsu.edu/resources/what_is_rhetoric.htm

۱۳. ابوالاعلیٰ مودودی، سید، سورہ الاعراف، آیت ۱۷۲، تفہیم القرآن (جلد دوم)، ادارہ ترجمان القران، ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۹۵۔

۱۴. محمد فیصل، ارسطو... ایک عہد، ایک شخصیت، مشتاق بک کارنر، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۱۸۔

۱۵. ابوالاعلیٰ مودودی، سید، سورہ النجم، آیت ۳، تفہیم القرآن (جلد پنجم)، ادارہ ترجمان القران، ستمبر ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۳۔

۱۶. سید کلب مصطفیٰ، فنِ خطابت، ص ۴۴-۴۷۔

۱۷. سید کلب مصطفیٰ، فنِ خطابت، ص ۴۹۔

۱۸. احمد ندیم قاسمی، محیط، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۸۶۔

۱۹. علامہ مرزا یوسف حسین لکھنوی (مترجم)، نہج البلاغہ، حیدری پریس، لاہور، دسمبر ۱۹۷۴ء، ص ۴۷۔

20. Aristotle, Rhetoric, Trnslated by W. Rhys Robert, CreateSpace Independent Publishing Platform, February 9, 2015, P7.
21. Aristotle, Rhetoric, Trnslated by W. Rhys Robert, P21.
22. As Above, P35.
23. As Above, P70.
24. As Above, P112.
25. As Above, P142.
26. As Above, P168.
27. As Above, P183.

## باب دوم

# اردو میں فنِ خطابت کی منتخب کتب پر ریطوریقا کے اثرات کا جائزہ

ارسطو کی معروفِ زمانہ تصنیف "ریطوریقا" چوں کہ فنِ خطابت کی کتب میں اولیت کی حامل ہے۔ بعد ازاں، اس موضوع پر جتنی کتب لکھی گئیں وہ شعوری یا لاشعوری طور پر اس سے ضرور متاثر ہوئیں، کیوں کہ اس کتاب میں مصنف نے اس فن کے مندرجات و متعلقات کو انتہائی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ متقدمین کی کتب کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ وہ کتابیں "ریطوریقا" کے اثر سے مملو ہیں اور متاخرین کی مذکورہ فن پر تصانیف بھی اس کے اثر سے تہی نہیں ہیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ حالات اور ترجیحات میں تغیر و انقلاب تو آیا، لیکن اس فن کے مبادی اور تقاضوں کی اساسی نوعیت اور اہمیت وہی ہے، البتہ اقتضائے حال اور سماج کے مطابق اس کی ترجیحات میں وسعت اور پھیلاؤ ضرور آیا۔ فنِ خطابت کے اردو مصنفین نے اساسی اعتبار سے "ریطوریقا" سے خوشہ چینی کی اور اس فن کے اساسی اور نوعی متعلقات کو عہدِ نو کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا، نیز اس کی وسعت اور رفعت کے نئے در وا کیے۔

### الف۔ "خطابت و تقریر" (از خواجہ شمس الدین احمد)- تجزیہ

"خطابت و تقریر" خواجہ شمس الدین احمد کی مرقوم کردہ کتاب، جسے انھوں نے مسلم اکیڈمی لکھنو کی تحریک پر انتہائی اختصار سے تالیف کیا۔ نیز، مذکورہ اکیڈمی کے اجلاس جو ۱۸ جولائی ۱۹۲۴ء میں منعقد ہوا، میں اسے پیش کیا۔

### 1۔ خطابت کا تعارف

اس کتاب میں انھوں نے فنِ خطابت کی تعریف، موضوع اور اس کی غایت کو قلم بند کیا۔ اس کتاب کی ابتدائی سطور بھی اس بات کی شاہد ہیں کہ انھوں نے فنِ خطابت کی سب سے پہلی کتاب "ریطوریقا" سے نہ صرف استفادہ کیا ہے، بلکہ اس کو بہ طور دلیل و برہان کے پیش بھی کیا ہے۔ علاوہ ازیں، علامہ ابن رشد کی "تلخیصِ خطابت" کا حوالہ بھی دیا ہے اور "ریطوریقا" سے خوشہ چینی کرنے والے معروف صاحبانِ علم کا بھی ذکر کیا ہے جن میں فارابی اور ابن سینا شامل ہیں۔ صاحبِ کتاب نے فنِ خطابت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "یہ اس کلام کا نام ہے جو دوسروں کو سمجھانے کے لیے بولا جائے۔ اصطلاح میں خطابت اس فن کو کہتے ہیں جس سے تمام اصنافِ گفتگو میں اپنی بات دوسروں سے منوائی جا سکے۔"(۱)

ارسطو کا حوالہ دیتے ہوئے تعارف میں ہی یہ مزید رقم کیا ہے کہ

"اور علوم کی طرح خطابت کا کوئی خاص موضوع نہیں ہے۔ کوئی مبحث یا کسی علم و فن کا کوئی مسئلہ، خطابت کا زور سب پر چلتا ہے اور کوئی ذہنی یا محسوس شے ایسی نہ ملے گی جو اس کے وسیع دائرۂ اثر سے خارج ہو۔"(۲)

شمس الدین نے اس کتاب میں فنِ خطابت پر مرقوم کتب و مضامین کا زبدہ اور ملخص پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابن سینا کے حوالے سے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ شاعری اور خطابت بھی منطق کی ذیل میں آتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ کہتے ہیں کہ شاعری کی مانند خطابت کی صلاحیت اور ملکہ بھی وہبی ہے لیکن سعی اور کوشش سے اس فن میں مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ مہارت کے حصول کے لیے مستند ذریعہ ارسطو کا تحریر کردہ رسالہ ہے۔

بعد ازاں، اس فن کے مقصد کو بھی "ریطوریقا" کے تناظر میں بیان کیا ہے کہ مقرر اپنی تقریر کے تاثر اور اثر سے سامعین کی توجہ نہ صرف اپنی جانب مبذول کرتا ہے، بلکہ اپنے مافی الضمیر کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی باتیں "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق ہو جاتی ہیں۔ گویا اقبال کی زبانی وہ یہ کہنا چاہتے ہیں:

"دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے　　پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے"(۳)

صاحبِ کتاب کے مطابق ایک خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی طبیعت، مزاج، اخلاق، قوموں کے احوال، سامعین کی صفات، کلام کے اثرات اور مجموعی تاثرات جو سننے والوں کے قلوب و اذہان پر مرتسم ہوتے ہیں، ان کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ و آشنا ہو۔ بعد ازاں، مصنف نے فنِ تقریر کے اصول و ضوابط کو بہ طریقِ احسن رقم کیا ہے۔ آدابِ تقریر کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تقریر کو موثر بنانے کے وسائل پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ علاوہ ازیں، اس موضوع کے علمی و فلسفیانہ مباحث کو بھی احاطۂ تحریر میں لایا ہے۔

## 2۔ فنِ تقریر کے اصول و ضوابط

"خطابت و تقریر" کے مطابق مقرر کو چاہیے کہ سب سے پہلے اپنے موضوع کی عام فہم تعریف و توضیح کرے اور جب مقرر تقریر کا آغاز کرتا ہے تو کوئی دعویٰ کرتا ہے، اب ضروری ہے کہ اس دعوے کے اثبات میں دلائل پیش کرے۔ دلائل کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا ہے؛ ایک قطعی اور ایک ظنی۔ ریطوریقا میں جس طرح ارسطو نے دلائل کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور ان کو تین حصوں "منطقی دلیل، مثال اور افسانوی دلیل" میں منقسم کر کے مقررین کے لیے بالکل واضح راہ متعین کی ہے، بعینہٖ، مذکورہ کتاب میں بھی دلائل کی تقسیم اسی بنیاد پر کی گئی ہے، تاہم مثال اور افسانوی دلیل کو ایک ہی قسم یعنی "ظنی دلیل" کی ذیل میں رکھا گیا

ہے، نیز ان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ جب مقرر دلائل کا ہنر آزمالے یا دلائل کے علاوہ تقابل کے ذریعے بھی اپنے دعوے کے ثبوت میں دو اشیا کے مابین مقابلہ کر کے واضح اور بین انداز میں اپنے موضوع کی تفہیم و تعلیم میں مدد حاصل کر سکتا ہے۔

> " کبھی خطیب کو اپنے دعوے کے ثبوت میں دو چیزوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، تاکہ اس کا موضوع روشن اور واضح ہو جاوے۔ کیوں کہ مقابلے سے ہر چیز آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔"(۴)

"ریطوریقا" میں ارسطو نے اثباتِ دعویٰ کے ضمن میں مقررین کی سہولت اور آسانی کے لیے قیاسات اور منطقی دلائل سے معاونت حاصل کرنے کی ترکیب بتائی ہے۔ بعینہٖ شمس الدین احمد نے بھی دعویٰ ثابت کرنے کے لیے اسی طرز پر قیاسات اور منطقی دلائل کے خطابت میں درست استعمال کو واضح کیا ہے۔ علاوہ ازیں، مقرر کو چاہیے کہ وہ تقریر کو موثر بنانے کے لیے مختلف قیاسات سے کام لے تاکہ اپنی بات کو مزید مستحکم کر سکے۔

> " دعوے کے اثبات میں خطیب کو قیاسات کی بھی ضرورت ہے، لیکن خطابت میں منطقی قیاسات سے کام نہیں لیا جاتا، منطقی قیاسات کی بنا یقینی مقدمات پر ہوا کرتی ہے اور خطابی قیاسات مقبولات اور مظنونات ہوا کرتے ہیں۔ یعنی وہ قیاسات جن میں عام لوگوں کے اعتقاد اور رائے کی بنا پر حکم لگایا جاتا ہے، جیسے فلاں شخص رات کو آوارہ گردی کرتا ہے، لہٰذا وہ چور ہے۔"(۵)

قیاسات کے سلسلے میں انھوں نے قیاسِ ذوحدین، قیاسِ خلف اور قیاسِ مرکب کو بیان کیا ہے۔ قسمِ اولیٰ اس قیاس سے متعلق ہے جو دو ایسی مختلف قسموں میں منقسم ہو جن کے درمیان کوئی واسطہ نہ نکل سکے اور دونوں سے مخالف دعوے کی تردید ہو جائے۔ جب کہ قسمِ ثانی سے مراد جس کے دونوں مقدمے ایسے منفی ہوں کہ اگر ان میں سے ایک باطل ہو جائے تو دوسرا مقدمہ، جو مطلوب ہے، وہ ثابت ہو جائے۔ قسمِ ثلاثہ کے نام سے ظاہر ہے کہ کئی قیاسوں پر مشتمل قیاس۔

بعض اوقات مقرر کو ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے کہ سامعین اس کی دی ہوئی دلیل کو رد کر دیتے ہیں، ایسی صورت میں مقرر کو چاہیے کہ وہ مدققانہ انداز اختیار کرے اور دلیل کو بدل دے:

> " کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خطیب کوئی معقول دلیل پیش کرتا ہے، مگر سامعین ناسمجھی سے اس کو رد کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں مصلحت یہ ہے کہ اس دلیل سے بالکل اغماز کر جائے اور دوسری دلیل ایسی صاف اور کھلی ہوئی پیش کرے جس کے رد کرنے کی ان کو مجال باقی نہ رہے۔"(۶)

خطیب کو اپنے دعوے کے اثبات میں جن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ان میں پہلا مرحلہ دعوے سے متعلق دلائل ہیں، جن کے بل بوتے پر وہ اپنی بات کو استحکام عطا کرتا ہے اور اپنے مدعا کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لیے انصرام کرتا ہے۔ مقرر جب اپنے مافی الضمیر کو بیان کر رہا ہوتا ہے تو اس وقت اسے حاضر جوابی سے اقتضائے حال کے مطابق فی البدیہہ مہارتوں کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے، کیوں کہ بہترین مقرر نہ صرف بات سے بات نکالتا ہے بلکہ اس کے پاس اپنی بات پر اٹھائے گئے ہر اعتراض کا معقول جواب بھی ہوتا ہے۔ جسے وہ صورت حال کے مطابق ڈھال کر اس طرح پیش کرتا ہے کہ مخالف فریق اس کو رد کر سکے نہ مزید کوئی دلیل دے سکے۔ لیکن بعض اوقات سامعین کی جانب سے اس کے دعوے کی تردید میں کچھ دلائل سامنے آتے ہیں، اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے "خطابت و تقریر" میں دلائل کو رد کرنے کی چند صورتیں بیان کی گئی ہیں:

> "۱۔ مخالف کے دعوے کو کسی دلیل کی بنا پر رد کرے۔ ۲۔ واقعے کی صحت کو مان لے، لیکن اس کے جرم یا خطا ہونے کو تسلیم نہ کرے۔ ۳۔ مخالف کے وہ عیوب ذکر کرے، جن سے اس کی حجت اور شہادت باطل سمجھی جاوے۔ ۴۔ مخالف کے شبہات کے مقابلہ میں دوسرے اسی طرح کے شبہات پیش کرے، تاکہ ان کا زور گھٹ جاوے۔ ۵۔ الزامی جواب دے، یعنی اسی کے دلائل سے اس کی تردید کرے۔ ۶۔ مخالف کے دلائل کو استہزا اور مزاح میں ٹال دے۔"(۷)

مزید برآں، دعویٰ و اثباتِ دعویٰ سے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر مقرر کا دعویٰ عقلی ہے تو اس سلسلے میں اسے عقلی دلائل سے مالا مال ہونا چاہیے اور اگر اس کا دعویٰ نقلی ہے تو اس کے پاس الہامی کتب، احادیث یا اس نوعیت کی دیگر کتابوں کے مستند حوالے اس سلیقے سے پیش کرنے چاہئیں کہ مخالف بغیر کسی تفکر اور تعطل کے قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ صورت حال اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے، جب مقرر طویل مشق اور تجرباتی لمحات سے گزر چکا ہو۔

> "خطیب کا دعویٰ اگر عقلی نہیں ہے بلکہ نقلی ہے تو اس کو کتبِ الہیہ، احادیث و سنن اور دوسری معتبر کتابوں سے سند پیش کرنی ہو گی۔ جو سند اس کی معید ہو، اس کی بڑائی دکھانے اور خلاف ہو تو اس کی تاویل کرے یا دوسری سند اس سے بڑی پیش کرے۔"(۸)

مقرر کے تمام دلائل ایجاز و اختصار، ضبط و ترتیب، خوش اسلوبی و انبساط کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیے جائیں اور کوئی ایسی دلیل نہ دی جائے جو لوگوں کی ذہنی سطح سے بلند ہو۔ ہاں، اگر وہ ایسے حلقے میں تقریر کر رہا ہے جہاں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی علمی، ذہنی اور فکری صلاحیت و استعداد بامِ عروج پر

ہو تو اس صورت حال میں ان کی ذہنی سطح کے مطابق دلائل دینے چاہئیں، تاکہ ایسے لوگوں کو سطحی دلائل اور معلومات سُن کر اکتاہٹ نہ ہو۔ خطابت ایسا فن ہے، جس میں وہی شخص نمایاں ہو سکتا ہے جو ہمہ جہت صفات سے متصف ہو۔ کیوں کہ خطیب کو بسا اوقات ایسے مراحل سے بھی گُزرنا پڑتا ہے جب وہ شبہات کا جواب دینے کے بجائے، اپنے ذاتی تعلقات اور احسانات ظاہر کرتا ہے۔ یہ تمام معاملہ اس طریقے سے سرانجام دیتا ہے کہ سامعین اس پر فریفتہ ہو جاتے ہیں۔

> "کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خطیب کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہ گزرتا ہے۔ وہ ان کے سامنے آکر پہلے شبے کا جواب نہیں دیتا۔ ان پر اپنے احسانات ظاہر کرتا ہے اور ان کے احسانات کا خود اعتراف کرتا ہے۔ جب ان کے دل اس کی تقریر سے گرویدہ اور اثر پذیر ہو جاتے ہیں، تب ان کے شکوک کا ازالہ کرتا ہے۔"(۹)

"ریطوریقا" کی طرز پر ہی "خطابت و تقریر" میں بھی عدالتی تقاریر کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اصول و ضوابط پیش کیے گئے ہیں، جو ایک وکیل کو دورانِ بحث اپنانے چاہئیں۔ وکیل جب عدالت میں پیش ہو تو تمام عدالتی آداب کو ملحوظِ خاطر رکھے۔ کسی قسم کی اہانت کا ارتکاب نہ کرے۔ نیز، اپنے مخالف کی بحث کے نکات کو انتہائی توجہ اور انہماک سے اس طرح سنے کہ اس کی پیش کردہ دفعات کی، قانونی طریقے سے اپنے موافق دفعات کی مدد سے، اس طرح تردید کرے کہ حق واضح ہو جائے اور مخالف اس دلیل کو سُن کر بے بس ہو جائے۔ علاوہ ازیں، اگر مخالف گواہان پیش کرے تو کچھ ضروری امور کی بنا پر انھیں بے وقعت اور بے کار ثابت کرنے کی کوشش کرے۔

> "۱۔ وہ معمولی طبقے کے کم عقل اور ناسمجھ لوگ ہیں۔ ۲۔ انھوں نے کسی امید یا خوف یا غصہ کی بنا پر گواہی دی ہے۔ ۳۔ ان کا بیان حالاتِ ظاہری، یا خود ان کے بیان یا دوسرے معتبر گواہوں کے بیان کے خلاف ہے۔ ۴۔ اگر انھوں نے رشوت لی ہے تو اسے ثابت کرکے دکھائے۔ ۵۔ ان کی گواہی تخمینی ہے، یقینی نہیں۔"(۱۰)

اصول و ضوابط کے ضمن میں تقریر کی ابتدا و تعارف کے علاوہ مواد، اندازِ بیان، دعویٰ اور اثباتِ دعویٰ سے متعلق بحث کی گئی ہے۔ وہ تمام نکات پیش کیے گئے ہیں جو دلائل کو نہ صرف استحکام عطا کرتے ہیں، بلکہ انھیں موثر بنانے میں بھی کارگر ثابت ہوتے ہیں۔

## 2۔ جذبات کی تحریک

ارسطو نے جذبات اور انسانی نفسیات کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے انتہائی تفصیل کے ساتھ مختلف انسانی جذبات، ان کی نوعیت اور محرکات و اسباب کو کتاب کے حصہِ ثانی میں تفصیلاً بیان کیا ہے، تاکہ مقرر موضوع اور موقعے کی مناسبت سے مطلوبہ جذبات کو مطلوبہ نوعیت کے مطابق ابھار سکے۔ شمس الدین

احمد نے بھی "ریطوریقا" کی طرح اپنی کتاب میں جذبات کی تحریک کی اہمیت کو بیان کیا ہے، تاہم "ریطوریقا" کی نسبت بجائے تفصیل کے اختصار سے کام لیا ہے۔

دورانِ خطابت مقرر کو اپنے دعوے کے اثبات میں پیش کردہ دلائل کے معاملے میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے، کیوں کہ خطابت میں دلائل کو پیش کرتے ہوئے نہ صرف مہارت درکار ہے، بلکہ اقتضائے حال کے مطابق دلائل کو ڈھالنا بھی ایک فن ہے۔ مقرر کو منطقی دلائل کا استعمال حتی المقدور نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ موقعِ محل کی مناسبت سے دلائل کا معیار اور انداز میں تغیر و تبدل پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اس لیے سامعین کی قابلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مقرر کو دلائل پیش کرنے چاہئیں۔

> "خطابت میں منطقی دلائل کی حاجت بہت کم ہوا کرتی ہے اور اس کے استدلال اور قیاس اس سے الگ ہوتے ہیں۔ بہت لوگ جو علم النفس سے ناواقف ہیں، دونوں میں فرق نہیں کرتے اور خطاب میں منطقی دلائل سے کام لیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ سخت غلطی ہے، منطقی دلائل اور مباحث افراد یا اہلِ علم و فضل کی جماعت کے مقابلہ میں کارآمد ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کی حالت اس سے جُداگانہ ہوا کرتی ہے۔ وہ بحث اور مناظرہ سے گھبراتے ہیں۔ اور دلائل کو سننے کی طاقت نہیں رکھتے، ان پر جن چیزوں کا اثر ہوتا ہے وہ جذبات اور خواہشیں ہیں۔"(۱۱)

منطقی دلائل سے احتراز اس لیے کرنا چاہیے کہ سامعین کی اکثر تعداد بہت زیادہ عملی استعداد نہیں رکھتی۔ ان کی ذہنی و فکری سطح کا منطق پر اس قدر عبور نہیں ہوتا کہ اس قدر دقیق علمی نکات اور مباحث پر فکری کمند ڈال سکیں۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ ایسے مقررین جو بہت زیادہ منطقی دلائل کا استعمال کرتے ہیں یا مختلف علمی کتب کے حوالے دیے چلے جاتے ہیں اور اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ ان کے سامعین ان کی پیش کردہ معلومات کو سمجھنے کے اہل بھی ہیں کہ نہیں۔ وہ اکثر سامعین پر اس قدر اثر نہیں کرتے جس قدر ایسے مقررین، جن کی تقریر میں عوامی جذبات و خواہشات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ان کی تقریر موثر ہوتی ہے۔

مقرر کو چاہیے کہ ایسے مواد کا استعمال کرے جو فوراً سننے والوں کی قلبی کیفیات کو بدل دے۔ اگر مقرر مجمعے میں کسی شخص کی محبت و الفت لوگوں کے دلوں میں بٹھانا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس شخص کی خوبیوں کو بیان کرے۔ اگر مقرر یہ چاہے کہ رنج و غم کے جذبات کو سامعین میں فروغ دے تو اسے چاہیے کہ وہ سراپا غم بن جائے۔ جب جرات و بہادری کے جذبات فروغ دینا چاہے تو سامعین کو اس قدر پُرامید اور پُرحوصلہ کر دے کہ وہ حصولِ مقاصد اور منزل تک رسائی کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ جب مایوسی اور بزدلی کے جذبات کو ترویج دینا چاہے تو اس صورت حال میں مستقبل کی ہولناکی، مصیبت اور مضرت کو اس طرح بیان کرے کہ سامعین میں امید کی رمق تک باقی نہ رہے اور وہ قنوطیت کی تصویر بن جائے۔ جب

رحم دلی کے جذبات پیدا کرنا چاہے تو نازل ہونے والے مصائب و آلام اور دکھوں کا ایسا مظلومانہ منظر پیش کرے کہ سامعین کے دل پسیج جائیں اور ان کی ہر ادا سے رحم دلی نچھاور ہوتی نظر آئے۔ جذبات کی یہی صورتیں مفصل انداز میں "ریطوریقا" میں بھی پیش کی گئی ہیں۔ جن کا مکمل تجزیہ باب اول میں کیا جا چکا ہے۔

## 3۔ تقریر کے حصص و ترتیب:

ارسطو نے تقریر کو چار حصوں "مقدمہ، مدعا، اثباتِ مدعا اور خاتمہ" میں منقسم کر کے ہر حصے پر مفصل، مدلل اور واضح بحث کی ہے، جب کہ مذکورہ کتاب میں مصنف نے نسبتاً اختصار سے کام لیتے ہوئے "ریطوریقا" کی طرز پر ہی تقریر کو تین حصوں "مقدمہ، اثباتِ مدعا اور خاتمہ" میں منقسم کیا ہے۔ اختصار اور طوالت کے تفاوت کے علاوہ یہاں محض اتنا فرق ہے کہ ارسطو مدعا اور اثباتِ مدعا کو علاحدہ بیان کرتا ہے جب کہ شمس الدین احمد دونوں کو ضم کر کے پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق وہی تقریر پُر اثر اور موثر ہوتی ہے جو اس طرح مربوط ہو، جیسے زنجیر کی ایک کڑی دوسری کڑی سے ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ہر اک بات اور دلیل کو اس کے مناسب مقام پر بیان کیا جائے، تاکہ سامعین کی دل چسپی بھی برقرار رہے اور مقرر اپنے دعوے اور دلائل کے ذریعے سننے والوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ مصنف کے مطابق:

> "تقریر کے تین حصے ہوا کرتے ہیں: مقدمہ، اثباتِ مدعا، خاتمہ۔ مقدمہ میں دو باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ ایک یہ کہ تقریر کی ابتدا ایسے انداز اور خوبی بیان سے کی جائے کہ سامعین اس کے سننے کی طرف مائل ہو جائیں، دوسرے یہ کہ ان کو تقریر کا مقصد اجمالی طور سے معلوم ہو جائے۔"(۱۲)

مقرر کو چاہیے کہ اپنی تقریر کی ابتدا اس طرح سے کرے کہ ہر شخص کی توجہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی جانب مبذول ہو جائے۔ اس سلسلے میں وہ چاہے تو ایسی انوکھی بات کہے، جس کا ہونا ناممکنات میں سے ہو یا کوئی ایسی کہانی بیان کرنا شروع کرے جو تمام تر سماعتوں کو اپنی جانب متوجہ کر لے۔ یہ مقرر پر منحصر ہے کہ وہ چاہے تو بغیر کسی تمہید کے مقصد کا بیان شروع کر دے یا اپنے مخالف کی کسی بات کو بنیاد بنا کر اظہارِ مدعا کرے۔ علاوہ ازیں، تقریر کا خاتمہ اتنا بہترین ہو کہ سامعین کے اذہان سے کبھی محو نہ ہو سکے، کیوں کہ خاتمے میں تمام تر تقریر کا خلاصہ اور زبدہ موجود ہوتا ہے۔ اختتام پر مقرر ایسے الفاظ کا چناؤ کرتا ہے، جو اس کے مقصد و مدعا کو انتہائی موثر و معتبر بنا کر امر کر دیتا ہے۔

## 4۔ آدابِ تقریر:

ارسطو نے "ریطوریقا" میں Ethos کے تناظر میں مقرر کے وہبی و کسبی اوصاف کو مفصل و مدلل قلم بند کیا ہے۔ یہ وہ خصائص ہیں، جن کے بل پر مقرر کے حلقۂ اثر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ شمس الدین احمد

نے بھی مقرر کے انھی اوصاف کو خصائصِ تقریر اور خصائصِ مقرر کی ذیل میں بیان کیا ہے۔ بعض اوقات معمولی قابلیت کا آدمی جو فنِ خطابت کے رموز و اسرار سے آشنا ہوتا ہے وہ اپنے مدعا و مقصد کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کا مصداق ٹھہرتا ہے، لیکن یہ مقام و مرتبہ آسانی سے حاصل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس فن کے آداب سیکھنے اور بحرِ خطابت میں تیرنے کے لیے سعیِ مسلسل اور جہدِ تواتر کی ضرورت ہوتی ہے۔

"یہ ایک بڑا فن ہے، جس کے لیے اصول مقرر ہیں اور جس کے واسطے برسوں مشق کرنے کی ضرورت ہے۔ تنہا علم و فضل اس کے لیے کافی نہیں ہیں۔"(۱۳)

مقرر کو جس مجمع میں تقریر کرنا ہو، اس کے مجموعی مزاج، عادات اور خصائل سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔ وہ اس بات کا اندازہ کر لے کہ وہ اس وقت کیا بات اور کس طرح سننے کے خواہاں ہیں۔ اگر وہ ان کے میلان و رجحان کو ملحوظ رکھ کر اپنے مدعا کو بیان کرے گا تو اس کی بات زیادہ موثر ہو گی۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ ہونا چاہیے کہ اس کو سننے والے مختلف طبقات، خیالات، احساسات اور جذبات کے لوگ ہیں۔

اقتضائے حال کے مطابق مقرر نہ صرف اپنے اندازِ بیان میں تغیر و تبدیلی لے کر آتا ہے بلکہ اپنے دلائل کا رنگ و آہنگ بھی بدل دیتا ہے، کیوں کہ وہ سامعین کے چہروں سے کیفیتِ حالات کو پرکھ لیتا ہے۔ صرف وہی مقررین کام یاب ہوتے ہیں، جو لکھی ہوئی تقاریر کرنے کے بجائے اپنی فنی مہارت، محنت اور مشق کے بل بوتے پر حالاتِ حاضرہ کے مطابق اظہارِ مافی الضمیر کرتے ہیں۔ مقرر کو چاہیے کہ وہ اچھی شہرت کا حامل ہو اور اس قدر راست باز ہو کہ کوئی بھی بات کہے تو لوگ اسے من و عن تسلیم کر لیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ اعلا اخلاق کا حامل ہو اور بدنام نہ ہو، اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ قول و فعل میں تضاد بے اثر بات کا سبب ہے۔ مقرر جب تقریر کا آغاز کرے تو اس کے وجود پر رعشہ طاری نہ ہو، دل کی دھڑکن تیز نہ ہو، مکمل اطمینان و تیقن سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرے۔ اگر کوئی شخص مضبوط دل کا حامل نہ ہو تو اسے خطابت کی جانب توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ جب وہ کسی مجمعے کے سامنے تقریر کرے گا تو اپنی اس کم زوری کے سبب ذلت کا سامنا کرے گا اور تقریر نہیں کر سکے گا۔

جب تک مقرر کو مکمل طور پر خود پر اعتماد نہ ہو، وہ فنِ خطابت میں کوئی کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دے سکتا۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے، جب مقرر سامعین کو خود سے برتر اور ارفع و اعلا نہ سمجھے۔ مقرر جس حد تک بے باک اور بے خوف ہو گا، اس قدر ہی اس کا مدعا و بیان معتبر اور موثر ہو گا۔ مقرر کے لیے قوتِ حافظہ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک مقرر نے ایک بڑے مجمعے کو نہ صرف اپنے مدعا و مقصد کی ترویج کرنا ہوتی ہے، بلکہ انھیں متاثر بھی کرنا ہوتا ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہے جب اس کے پاس ہر موضوع پر معلومات کا ذخیرہ ہو۔

مقرر کی آواز نہ اتنی پست ہو کہ سامعین کو سنتے ہوئے بات کی تفہیم نہ ہو اور نہ ہی اس قدر اچانک بلند ہو کہ ان کی سماعتوں پر گراں گزرے۔ کلام کی رفتار اتنی تیز نہ ہو کہ لوگ سمجھ نہ سکیں اور اس قدر سست نہ ہو کہ سننے والے اکتا جائیں۔ مقرر کو بر موقع و بر محل اشارے اور حرکات کرنی چاہئیں۔ اگر وہ مناسب وقت پر مناسب اشارہ نہیں کرے گا تو لوگ تمسخر ارائیں گے۔ اسی طرح بغیر ضرورت کے یا زائد کھانسنا اور کھنکارنا بھی اچھا تاثر نہیں چھوڑتا۔

اگر مقرر تقریر کرتے ہوئے اچانک خاموش ہو جائے اور طویل وقفے کے لیے کچھ نہ بولے تو سامعین پر یہی تاثر جائے گا کہ وہ اپنی تقریر بھول گیا ہے یا بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا ہے۔ اگر وہ دورانِ تقریر کوئی بات بھول جاتا ہے تو اسے مناسب طریقے سے اس صورت حال پر قابو پائے۔ بالکل خاموشی اختیار کرنے کے بجائے انتہائی سلیقے سے بات کو آگے بڑھائے۔

ظاہری شخصیت اور جسمانی حرکات و سکنات انسان کی تاثیرِ گفتگو پر براہِ راست اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لیے جب مقرر تقریر کرنے کے لیے سامعین کے روبہ رو ہوتا ہے تو تقریباً تمام لوگ اس کی شخصیت کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک تاثر قایم کر چکے ہوتے ہیں۔ مقرر کو چاہیے کہ وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو۔ بعض مقررین دورانِ تقریر غیر ضروری طور پر جھک جاتے ہیں، یہ مناسب نہیں۔ مقرر کی پشت اور کمر سیدھی ہو۔ اگر کوئی شخص دینی باتوں کی ترویج و تبلیغ کرتا ہے تو اس کا حلیہ اور وضع قطع دین و مذہب کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

مقرر کی تقریر پر اگر کوئی اعتراض کرے یا اس کے دعوے اور مدعا سے متعلق کوئی سوال کرے تو اسے اظہارِ برہمی نہیں کرنا چاہیے۔ اس صورت حال میں اسے انتہائی تحمل، خوش اسلوبی اور ذہانت سے جواب دینا چاہیے۔ مقرر کو چاہیے کہ اپنی بات کو اختصار کے ساتھ پیش کرے، کیوں کہ طولانی تقاریر لوگ نہ تو سننے کے متحمل ہوتے ہیں، بلکہ ان کا اثر بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ لیکن حد سے زیادہ اختصار بھی خامی کا درجہ رکھتا ہے، کیوں کہ بعض اوقات سامعین مقرر کو سننے کے مشتاق ہوتے ہیں۔

"برملا تم کہو، مختصر سا کہو　　جب کبھی کچھ کہو معتبر سا کہو"(۱۴)

زبان پر عبور تقریر کو موثر بناتا ہے۔ مناسب اور خوب صورت الفاظ کا چناؤ انداز و تاثر دونوں کو پر لطف بنا دیتا ہے۔ خطیب کو یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کس مجمعے میں کھڑا ہے اور وہاں کس طرح کے سامعین براجمان ہیں۔ اگر بڑی عمر کے لوگ ہیں تو ان کے ساتھ انتہائی تعظیم سے خطاب کرے۔ اگر کم تر درجے کے ہیں تو پھر بھی الفاظ کا چناؤ اور استعمال کا انداز ایسا ہو کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو اور مجمعے میں موجود کسی شخص پر کوئی بات گراں نہ گُزرے۔

مقرر کو چاہیے کہ وہ اپنی تقریر کے مندرجات کے لیے باقاعدہ تیاری کرے۔ موضوع سے متعلق معلومات کو لکھ کر محفوظ کر لے یا نکات تیار کرے۔ موضوع پر بھرپور گرفت ہی اس کے مدعا کو پر تاثیر بنا سکتی ہے۔ علاوہ ازیں، پیشتر تیاری رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر کبھی فی البدیہہ کوئی تقریر کرنا پڑ جائے تو شرمندگی کا سامنا نہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کے ادب کا مطالعہ کرے اور اپنا علم وسیع کرے۔

مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقتدر اور بااثر ہو۔ اگر اس میں دونوں میں سے کوئی ایک خوبی بھی پائی جائے تو لوگوں کے دلوں پر اس کی بات کا اثر زیادہ ہو گا۔ جب کہ کوئی معمولی شخص بہت اعلا تقریر کرے یا بہترین باتیں کہے تو سامعین اس کی باتوں پر نسبتاً کم توجہ دیتے ہیں۔ ذاتی اقتدار اور اثر و رسوخ سے کلام میں بھی تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

## 5۔ تقریر کی اقسام:

"ریطوریقا" میں تقریر کو تین حصوں "عدالتی، سیاسی اور عوامی تقریر" میں منقسم کر کے مختصراً واضح کیا گیا ہے۔ "خطابت و تقریر" میں بھی تقریر کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، لیکن "عوامی تقریر" کے بجائے "مذہبی تقریر" کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ "خطابت و تقریر" میں تقریر کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے: عدالتی تقاریر، سیاسی تقاریر اور مذہبی تقاریر۔

مذہبی تقاریر کو دینی خطبات سے موسوم کیا گیا ہے، نیز انھیں تین ذیلی حصوں میں منقسم کر کے زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ پہلی قسم جمعے اور عیدین کے خطبے، دوسری قسم مواعظ اور تیسری قسم میلاد ہے۔ جمعے اور عیدین کے خطبات سے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ ان میں مخصوص مضامین کی تکرار ہوتی ہے، جس کی وجہ سے عوام میں وہ دل چسپی پیدا نہیں ہوتی جو ہونی چاہیے اور نہ ہی اس کے دورس اثرات نکلتے ہیں، نہ ہی موجودہ حالات کے مطابق عوام کی رہ نمائی اور اصلاح کی جاتی ہے۔ مصنف کے مطابق خطبے کو مفید اور کارآمد بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کو موجودہ حالات کے مطابق ڈھالا جائے۔ خطبہ اتنا دل چسپ ہو کسی شخص کو اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔ اس میں اصلاح کرنے کی صلاحیت ہو۔ اگر کسی بات کی تکرار بھی کی جائے تو اس طرح ہو کہ وہ دل چسپی سے تہی نہ رہے، بلکہ نئے انداز و اسلوبِ بیان میں ڈھال کر پیش کیا جائے تاکہ تاثر اور کشش برقرار رہے۔ "خطابت و تقریر" کے مطابق یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب خطبا قابل، لائق اور ذہین و فطین ہوں، جدید و قدیم علوم پر دسترس رکھتے ہوں، معاشرتی تبدیلیوں، دنیوی تقاضوں، وعظ و نصیحت کی رموز و اسرار سے آشنا ہو۔ اس منصب کے حق دار صرف وہی لوگ ہیں جو فصاحت و بلاغت سے

معمور، اصلاح کے جذبے سے بھرپور اور خود دینی اعمال سے دور نہ ہوں۔ یعنی ہر عالم باعمل بھی ہو۔ دوسری قسم مواعظ کی ہے، جو کسی مکان یا مسجد وغیرہ میں دیے جاتے ہیں۔ واعظین پہلے قرآن کی کوئی آیت، حدیث، مثنوی مولانا روم کے اشعار سے اپنے خطاب کا آغاز کرتے ہیں۔ واعظین کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس موضوع پر بات کر رہے ہوں، وہ اپنی کیفیت کا اظہار اپنے چہرے سے کریں۔ مصنف نے میلاد جیسی محافل میں تقریر کرنے والوں کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ یہ لوگ رٹے ہوئے فقروں اور زبانی یاد کی گئی تقریروں سے کام لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں، فضائل کے ذکر میں اس قدر مبالغہ آرائی کرتے ہیں، یہاں تک کہ اقوالِ ضعیفہ کا سہارا بھی لے لیتے ہیں، جو شرعی تقاضوں کے منافی ہے۔ شاعرانہ تلمیحات اور عاشقانہ خیالات کو بیان کرنے میں متانت اور سنجیدگی کی حد سے گزر جاتے ہیں۔ یہ لوگ اصولِ خطابت سے بالکل نابلد ہوتے ہیں۔

"ریطوریقا" میں خطابت کی تاریخ و روایت تو نہیں ملتی، لیکن فنِ خطابت کے بیان کردہ تمام مبادی اس بات کے شاہد ہیں کہ ارسطو سے پہلے خطابت کی مستحکم روایت موجود تھی۔ زیرِ تجزیہ کتاب میں خطابت کی روایت کو باقاعدہ موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف نے خطابت کی روایت کو بہ طریق احسن طشت از بام کرتے ہوئے یونان، اہلِ روما سے لے کر ہندوستان کے خطبا کا تذکرہ کیا ہے۔

### 7۔ مشقِ خطابت:

"ریطوریقا" میں مشقِ خطابت کے ضمن میں کوئی طویل بحث نہیں ملتی، تاہم ارسطو نے جامعیت کے ساتھ محض دو جملوں میں یہ بات واضح کی ہے کہ مسلسل مشق مقرر کے لیے کسبی اوصاف کا حصول اور موثر تقریر پر دسترس ممکن بناتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے اس پر مدلل بحث کی ہے۔ مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقاریر کو لکھے، ازبر کرے، اقتضائے حال کے مطابق مطالعہ کرے، ہر طرح کے مقررین کی تقاریر کو سنے اور استفادہ کرے۔ تقریر کی ابتدائی مشق ہمیشہ مادری زبان میں کرے تاکہ تمام پیچیدگیاں دماغ و دل میں واضح رہیں۔

## ب۔ "فنِ تقریر"۔ تجزیہ

ادارہ ادبیات اردو کی مرتب کردہ کتاب "فنِ تقریر" کے دیباچے میں اس فن کی اہمیت کو بہ طریق احسن بیان کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، فنِ تقریر کی تاریخ کو اہلِ یونان سے آغاز کر کے اہلِ روما، اہلِ عرب،

انگریز، فرانسیسی اور اہلِ ہند کے حالیہ دور تک بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی فنِ تقریر کو سیکھنے کی اہمیت سے متعلق بنیادی مباحث قلم بند کیے گئے ہیں۔

## 1۔ خطابت-تعارف وروایت

"ریطوریقا" میں خطابت کا باقاعدہ مگر مختصر اور جامع تعارف پیش کیا گیا ہے، نیز خطابت کی روایت پر کوئی بحث نہیں کی گئی، جب کہ مذکورہ کتاب میں خطابت کا باقاعدہ تعارف نہیں دیا گیا، بلکہ براہ راست خطابت کی روایت اور ارتقا سے ابتدا کی گئی ہے۔

انسان کو قدرت نے مختلف قوتیں عطا کی ہیں، جو اسے دیگر خلائق سے ممایزت عطا کرتی ہیں۔ ان قوتوں میں ایک ایسی قوت ہے جو کسی اور مخلوق کے پاس نہیں، وہ گویائی اور مافی الضمیر کے اظہار کی قوتیں ہیں، جسے فصاحت کہتے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں صاحبِ تالیف نے اہلِ یونان و اہلِ روما، اہلِ عرب، اہلِ انگلستان و ہندوستان کے حوالے سے معروف مقررین اور ان کے محاسنِ تقریر کا مختصر تذکرہ کرتے ہوئے خطابت کی روایت کو بیان کیا ہے۔ "فنِ تقریر" میں خطابت کی ذیل میں فصاحت کو بنیادی جزو قرار دیتے ہوئے اسے انتہائی سہل اور عام فہم انداز میں متعارف کروانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے متعلق کہا گیا ہے:

> "فصاحت نہ تو رونے کا نام ہے نہ ہنسنے کا مگر ایک سحر کلام کا نام ہے جو سننے والوں کے دل پر ایک جادو کا سا اثر رکھتی ہو۔ نہ یہ آگ ہے اور نہ ایسی چیز ہے جو آگ پیدا کرتی ہو، مگر اس میں ٹھنڈے دلوں کو گرم کرنے اور گرم کیے ہوؤں کو شعلہ زن کرنے اور جلتے ہوئے سے دھواں نکال دینے کا وصف پنہاں ہے۔ نہ وہ تلوار ہے اور نہ جگر کو چھیدنے والا تیر ہے مگر ایک ایسی آب ہے جو کند زبان کی دھار کو تیز کرنے اور اس سے گہرے زخم کر دینے کی قابلیت رکھتی ہے۔"(۱۵)

"فنِ تقریر" کے مطابق قدرتی امور میں تبدیلی ممکن نہیں لیکن فنِ تقریر کو سیکھ کر خطابت میں مہارت اور جدت پیدا کی جاسکتی ہے۔ یہ فن گویائی کی قوت کو پیدا تو نہیں کرتا، مگر اسے نکھارنے، جلا بخشنے اور مستحسن کرنے میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ بہت سے ایسے نام ور مقررین ہوئے ہیں جنھوں نے انتہائی مشکل اور کٹھن مراحل سے گزر کر مہارت حاصل کی۔ ان مقررین میں ڈیماستھینز شامل ہے، جس نے لکنت کے باوجود اپنی جد وجہد اور سعی سے بالآخر ایک نام پیدا کیا۔ "فنِ تقریر" کے دیباچے کے آخر میں اس کتاب کو مرتب کرنے کی غرض وغایت کو طشت از بام کیا گیا ہے کہ یہ فن سیکھ کر لوگ بہت سے فوائد سمیٹ سکتے ہیں

اور اس فن سے نابلد اور نا آشنا لوگ بہت سے نقصانات کا سامنا کرتے ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو نے "فنِ تقریر" کو اس لیے انتہائی محنت اور جدت سے مرتب کیا، تاکہ عوام و خواص اس فن کو قدرے آسانی سے سیکھ سکیں۔

## 2۔ مقرر کے قدرتی اوصاف

"ریطوریقا" میں مقرر کے وہبی و فطری اوصاف پر مفصل بحث مرقوم ہے، بعینہٖ، "فنِ تقریر" کے پہلے باب میں مقرر کے قدرتی اوصاف اور ان کی اہمیت کو بیان کر کے اس بات کو اظہر من الشمس کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ مقرر میں فطری طور پر تقریری اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ فطری تقریری صلاحیت کا حامل مقرر ہی ممتاز اور ممیز مقام حاصل کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں پہلا وصف "زندہ احساس" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ مختلف اشخاص مختلف احساسات کے حامل ہوتے ہیں، جیسے استاد، معلم اور مقرر۔ ان تینوں کا اظہارِ خیال کا انداز، گفت گو کا آغاز اور اختتام، خیالات اور تصورات کا ارتباط، اپنے موضوع کے مالہ وماعلیہ کا انضمام و انضباط مختلف ہو گا۔ ان میں سب سے موثر اور معتبر اظہارِ خیال مقرر کا ہو گا۔

"فنِ تقریر" میں دوسرے جس وصف کو اہمیت دی گئی ہے وہ تیز فہمی ہے، یہ ایک قدرتی وصف ہے۔ اگر اس کو سنوارنے پر مزید محنت کی جائے تو ایک مقرر کو فی البدیہہ اور برجستہ تقریر کرنے، اپنے خیالات کو مرتب کرنے، ان سے متعلق حوالہ جات کو سرعت، مہارت اور جدت سے سامعین کو سمجھانے میں کام یابی حاصل ہو گی۔ اس کے بعد جس قدرتی وصف کی جانب توجہ دلائی گئی ہے وہ "فہمِ عامہ" یعنی کامن سینس (Common Sense) ہے۔ جس کی تعریف یہ گئی ہے کہ

> "یہ عقلِ سلیم کا وہ فعل ہے جس سے ایک شخص خیالات کی تیزی اور ایک قسم کے مذاق سے یہ معلوم کر لیتا ہے کہ خاص مقامات پر کون سی چیز واجب اور کون سی ناواجب ہے۔"(۱۶)

مقرر کے لیے نہایت ضروری ہے کہ اسے اس بات کا علم ہو کہ کون سی بات کہاں کرنی ہے، کس طرح کرنی ہے اور کن کن چیزوں سے اجتناب اور پرہیز لازم ہے۔ فنِ خطابت سے منسلک شخص کے لیے ایک نہایت ضروری وصف اداکاری یا اظہارِ تاثر ہے۔ جب تک وہ اس میں کمال حاصل نہیں کرتا، اس وقت تک اس کی بات میں اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس امر کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ جب مقرر سامعین کے سامنے کھڑا ہو گا تو ایک سرگرم دل والے شخص کی طرح اپنا اظہارِ خیال کرے گا۔ اپنے روح و دل اور جسم کو اپنی گفت گو میں مستغرق کر دے گا۔ مقرر کے فن کو جلا بخشنے والا اک اور وصف "زندہ تصور" ہے۔ جسے "فنِ تقریر" میں ایک

نہایت ضروری قوت گردانا گیا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی فی البدیہہ اور برجستہ تقریر کرتا ہے تو اس قوت کے بہ موجب وہ مطلب و مدعا اور مقصد کو اپنے دل میں قایم کرتا ہے اور مناسب لمحہ آنے تک اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا ہے۔ دورانِ تقریر اس کے تصور کے کینوس پر کئی رنگ اور تصویریں ابھرتی ہیں۔ اب وہ کانٹ چھانٹ کر کے انتخاب کرتا ہے اور پھر موزوں مقام پر اس کا اظہار کرتا ہے۔

"فنِ تقریر" میں مرقوم ایک اور وصف "مضبوط ارادہ" ہے۔ یہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہی شخص کام یاب، موثر، معتبر اور مقتدر ہوتا ہے، جس کا ارادہ مضبوط اور مستحکم ہو، دورانِ تقریر وہ کسی طرح کی بھی گھبراہٹ کا شکار نہ ہو۔ بزدل اور متذبذب شخص کبھی بھی بہترین مقرر ثابت نہیں ہو سکتا، کیوں کہ جب کوئی مقرر خوف میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کے الفاظ بہک جاتے ہیں، زبان لڑکھڑانے لگتی ہے، جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار اچھے طریقے سے نہیں کر سکتا۔ کتاب ہذا کے مطابق مقرر کے لیے اک ناگزیر وصف "کشادگیِ طبع" ہے۔ ایسا شخص جو سوشل نہ ہو، وہ کام یاب مقرر نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس کی طبیعت لوگوں تک اپنا مدعا پہنچانے میں رکاوٹ بنے گی۔ اس فن سے متعلق شخص کو زیرک، بے باک، کشادہ دل، راسخ العقیدہ اور مسرور الطبع ہونا چاہیے۔

فطری تقریری صلاحیت کو خطابت کا "جوہرِ ذاتی" کہا گیا ہے۔ فنِ تقریر بولنے کی مہارت، جدت اور ممارست کی راہیں تو ہموار کرتا ہے لیکن گویائی کی فطری صلاحیت اور قدرت پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ بولنے والے شخص کو قواعد اور علمِ بدیع یا علمِ معنی پڑھانے سے اسے بہتر بولنا سکھایا جا سکتا ہے، تاہم بلند پروازی، رفعتِ خیال اور اس فن میں اوجِ کمال فصاحت نہیں سکھلا سکتی، یہ اس کو فطری طور پر قدرت کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ سب سے اہم اور ضروری وصف جو "فنِ تقریر" میں بیان کیا گیا ہے، وہ "اخلاق اور نیکی" ہے۔ یہ بنیادی طور پر مقرر کا کردار اور اس کی نیک نامی ہے۔ بُری شہرت کا حامل یا بُرے اخلاق و کردار والا شخص کام یاب مقرر نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص ذاتی طور پر بُرا ہے اور برائی میں شہرت بھی رکھتا ہے تو عوام الناس میں اس کی کسی بات کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مقرر نہ صرف اچھی باتوں کا عامل ہو، بلکہ اچھی شہرت کا حامل ہونا بھی ضروری ہے۔

## 3۔ مقرر کے کسبی اوصاف

"ریطوریقا" میں مقرر کے کسبی اوصاف تفصیلاً درج کیے گئے ہیں، اسی طرح اس کتاب کے باب دوم میں "کسبی اوصاف" کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو محض مقرر کی ذاتی جستجو اور تگ و دو سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

"ریطوریقا" میں مرقوم خصائص کے علاوہ یہاں اقتضائے حال کے مطابق کچھ مزید کسبی اوصاف کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ جن کو اپنا کر مقرر اپنی فطری صلاحیتوں کو مزید بہتر کر سکتا ہے۔ پہلا وصف "تحصیلِ علم" ہے۔ مقرر کے لیے ذخیرہِ معلومات کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ جس قدر مقرر کے علم میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو گی اسی قدر اس کی تقریر موثر اور مزین ہوتی چلی جائے گی۔ "فنِ تقریر" میں اس حوالے سے سسرو اور سقراط کی آرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ جو اس حوالے سے مدد و معاون ہیں۔ سسرو کے مطابق مقرر ہونے کے لیے ایک شخص کو ہر ایک فن اور ہر ایک شے کا علم ہونا ضروری ہے، کیوں کہ مقرر کو مختلف موضوعات پر تقریر کرنا ہوتی ہے۔ اس لیے جب تک مختلف موضوعات پر اس کی گرفت مضبوط نہیں ہو گی، وہ خاطر خواہ کام یابی حاصل نہیں کر سکتا۔ سقراط کے مطابق کوئی شخص ایک مضمون پر گفت گو نہیں کر سکتا، جب تک کہ اس کا کامل علم نہ رکھتا ہو۔ علاوہ ازیں، اس حوالے سے کونٹلین اور ابی بوتین کی قیمتی آرا کو قلم بند کیا گیا ہے۔ جس کا مفہوم و مقصد یہ ہے کہ مقرر کے لیے لازم ہے کہ اسے مختلف علوم پر کامل دسترس ہو۔ لائق اور فاضل مقرر کے لیے مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ اگر وہ ترکِ مطالعہ کرتا ہے تو گویا وہ اپنا حلقہِ اثر بھی کم کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں جس قدر اس کے مطالعے کو وسعت ملتی جائے گی، اسی قدر اس کے خیالات اور بیانات ارفع و اعلا ہوتے جائیں گے اور اسے قبولِ عام حاصل ہو گا۔

"فنِ تقریر" میں اک اور کسبی وصف "محنتی ہونا" ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بلیئر کا قول نقل کیا گیا ہے کہ مسلسل اور سخت کام کے بغیر کسی چیز میں فضیلت حاصل کرنا ناممکن ہے۔ مقرر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ تواتر اور تسلسل کے ساتھ محنت اور جدوجہد جاری رکھے۔ اس ضمن میں کتاب ہذا میں مقرر یا متعلم ان پانچ امور کو اپنا کر اپنا کٹھن سفر بھی انتہائی سہل اور دل چسپ بنا سکتا ہے۔ اس کتاب میں درج ان پانچ نکات میں سے پہلا نکتہ "مطالعہ کرنا" ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہا گیا ہے کہ جب مطالعہ شروع کیا جاتا ہے تو ایک عرصے کے بعد مطالعہ کرنا پسندیدہ روش بن جاتی ہے۔ دوسرا نکتہ اس امر کی وضاحت کر رہا ہے کہ کٹھن اور دشوار مراحل میں مایوس ہونے کے بجائے کوشش اور جدوجہد جاری رکھنی چاہیے، کیوں کہ فطرت کامل مقرر بننے کی مانع نہیں ہے۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ فن میں کمال حاصل کرنے کے لیے جدوجہد اور سعی کی جائے۔ اپنی منزل کا تعین کیا جائے۔ پھر اس کے حصول کے لیے ہر حوالے سے کوشش کی جائے۔ چوتھا نکتہ یہ ہے کہ مقرر یا متعلم جس مقام تک پہنچنا چاہتا ہے، اس کے حصول کے لیے ہمہ وقت بے تاب، بے قرار اور مضطرب رہے، کیوں کہ سکینت ٹھہراؤ کا موجب ہے اور ٹھہراؤ حصولِ منزل میں رکاوٹ ہے۔ اس ذیل میں یہ بات کہی

گئی ہے کہ اگر مقرر یا متعلم یہ کہے کہ "میرے پاس کافی علم ہے، تو تم مر جاتے ہو، ہمیشہ بڑھاؤ، ہمیشہ چلو، ہمیشہ بڑھو، کبھی مت ٹھہرو، کبھی پیچھے مت ہٹو۔" پانچواں نکتہ انتہائی اہم اور ضروری ہے کہ دل ایک بنجر زمین کی مانند ہے۔ ایسی زمین کی اگر دیکھ بھال نہ کی جائے تو قابلِ نقصان جڑی بوٹیوں، جھاڑیوں کو تلف نہ کیا جائے اور زمینِ دل کو سیر اب نہ کیا جائے تو اس کی زرخیزی کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور منفعت کے بجائے مضرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

## 4۔ مقرر کی مشکلات اور ان کا حل

"ریطوریقا" میں اگرچہ فن اور اس کے متعلقات کو مفصل بیان کیا گیا ہے، مگر مقرر کو پیش آنے والی ممکنہ مشکلات کو علاحدہ بحث نہیں کیا گیا، تاہم تقاریر اور دلائل کے پیش کردہ اصولوں اور بنیادوں سے ان مشکلات کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ "فنِ تقریر" میں مقرر یا طالب علم کو پیش آیندہ مسائل و مشکلات کا نہ صرف تذکرہ کیا گیا ہے، بلکہ ان کا موثر حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ کونٹیلین کا حوالہ دے کر تنظیمِ وقت کے تحت صرفِ وقت کی بہتری کی طرف رہ نمائی کی گئی ہے کہ احتیاط اور باقاعدگی کے ساتھ وقت کو مطالعے کے لیے صرف کرنا چاہیے۔ لوگ غیر ضروری ملاقاتوں، گپوں اور بے کار باتوں، سیر تماشوں اور دعوتوں کے ضمن میں اپنے وقت پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ یہ تمام وقت جو فضول مشاغل کی نذر ہو جاتا ہے، اگر اسے تحصیلِ علم کے لیے مختص کیا جائے تو بہت نفع حاصل کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں، ضروری نیند کے علاوہ راتوں کو بھی کام میں لایا جا سکتا ہے۔

## 5۔ مقرر کی متفرق خصوصیات

"فنِ تقریر" میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ جو پیشہ بھی اختیار کیا جائے، انتہائی اخلاص، محبت اور محنت سے اس کی جزئیات کا مکمل علم حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ اگر کوئی مقرر بننا چاہتا ہے تو علم کی چند شاخیں ایسی ہیں، جن پر دسترس بے حد ضروری ہے۔ سب سے پہلی چیز "دنیا کا علم" ہے۔ مقرر کو اپنے مشاہدے کی قوت کو مستحکم کرنا چاہیے؛ جن سے اس نے مخاطب ہونا ہو، ان کی طبع، رجحان، طور و اطوار سے آشنا ہو۔ یہاں ایک مقدس عالم کے قول کا حوالہ دیا گیا ہے کہ

> "مقرر کو انسان کی نیچر، اس کے خاص مدعا، اس کی صحیح رغبتوں سے اور ان حصوں سے جن سے وہ مرکب ہے اور اس کے جسم اور دل اور اس کو خوش کرنے کے حقیقی ڈھنگ سے آگاہ ہونا چاہیے۔ اسی طرح مقرر کو انسان کے جذبات اور ان

باقاعدگیوں کو جو ان پر غالب ہیں اور ان پر حکومت کرنے کا فن سمجھنا چاہیے کہ کیوں
کر ان کو فائدہ مند طور پر اٹھایا اور نیک کام میں لگایا جا سکتا ہے۔"(۱۷)

یہاں محولہ بالا باتوں کی تصدیق اور تحقید کے لیے سسرو کے قول کو بھی نقل کیا گیا ہے۔

"مقرر کو چاہیے کہ انسانی زندگی کے واقعات کا امتحان کرے۔ غور اور بحث کرے
اور ان کو کام میں لائے۔"(۱۸)

مقرر نے چوں کہ اسی دُنیا میں بسنے والے انسانوں سے مخاطب ہونا ہوتا ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دُنیا کے حالات، واقعات، معاملات، تصرفات اور انسانی ترجیحات سے واقف ہو۔ زیرِ تجزیہ کتاب میں مقرر کے لیے اکتسابِ علمِ ادب کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور اس جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ مقرر مصنفین کے کلام کا مطالعہ کرے، اس سے اس کی زبان کی تطہیر اور تاثیر میں اضافہ ہو گا۔ علما کے اقوال اور معروف شعرا کے اشعار بر موقع و بر محل نوکِ زباں پر آجائیں گے، جس سے اس کی تقریر مستند اور معتبر ہونے کے ساتھ سامعین کے دل و دماغ پر اچھا تاثر چھوڑے گی۔ انگریزی مقررین اور طلبا سسرو اور ڈیما ستھنیز کے کلام اور انگریزی مقررین کی تقاریر سے مستفید اور مستفیض ہو سکتے ہیں۔ عام علمِ ادب کے بعد مقرر کے لیے جس لازمے کا ذکر کیا گیا ہے وہ منطق ہے۔ مقرر منطق کے اصولوں سے آگاہ ہو۔ ایک آزمودہ کار منطقی کے سامنے باقاعدہ زانوئے تلمذ طے کرے۔ تحصیلِ فنِ تقریر سے متعلق اشخاص منطق کے اصولوں سے محض واقف ہی نہ ہوں بلکہ عملی طور پر اس کی مشق کریں، جس سے علم آموز اور دل چسپ مضامین پر خیالات کی تقسیم اور ترتیب کے لیے عمدہ تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ ان میں زبان، اخلاق اور تاریخ کے موضوع پر تقاریر ہونی چاہئیں۔ مقررین کو کلام کے مختلف حصص، مثلاً مدارجِ ترتیب، اسباب، ثبوت اور ایسے ہی دیگر ضروری نکات جو ایک عمدہ مضمون کے لیے ناگزیر ہوں، ان کی مشق کرائی جائے۔ مقررین کے مابین مختلف مباحث کا تبادلہ کیا جائے، جو اس فن کی مشاقی میں اہم کردار ادا کرے گا۔ اس سے مقررین یا متعلمین اپنے موضوع کی تعریف کرنے، دلیل لانے اور حق نما باطل دلیل کا بطلان ثابت کرنے اور اصلیت ظاہر کرنے میں ماہر ہوں گے۔ جب متعلمین اور مقررین کے درمیان نامعلوم موضوعات پر مباحث کا انعقاد کیا جائے گا تو نہ صرف مقررین برجستگی کی صفت سے متصف ہوں گے، بلکہ سامعین بھی مستفید ہوں گے۔ بعض ان موضوعات سے متعلق دلائل کی تائید کریں گے اور بعض تردید۔ اس لیے، یہ عمل انتہائی مفید ہے۔

بعد از منطق "فنِ تقریر" میں جس امر کو مقرر کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے، وہ غور و فکر ہے۔ یہ وہ

خصوصیت ہے جس کو اپنا کر وہ غلط اور صحیح کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔ مقرر جب اپنی اس صفت کو مزید جلا بخشتا ہے تو انتہائی قلیل وقت میں بھی اس کی قوتِ فیصلہ مزید کارآمد ہو جاتی ہے۔ جس سے اسے دیگر مقررین پر برتری حاصل ہو جاتی ہے۔

ارسطو نے "ریطوریقا" تحریر کرتے ہوئے اپنے عہد اور زمانے کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ لہٰذا، اس نے اپنی بحث میں تحریری مشق یا مضمون نگاری کو موضوع نہیں بنایا، لیکن موجودہ عہد میں مضمون نگاری فنِ تقریر کی استواری میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس لیے "فنِ تقریر" میں "مضمون نگاری" کو مقرر کی صحتِ گفت گو کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ جب مقرر باقاعدہ مضمون نگاری شروع کرتا ہے تو اس کو خیالات کی ترتیب میں مدد ملتی ہے اور دورانِ تقریر انتہائی سرعت کے ساتھ اپنے خیالات کو منظم اور منضبط کرنے اور پھر ان کا برملا اظہار کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اگر کوئی مقرر چاہتا ہے کہ وہ برجستہ گوئی میں مہارت حاصل کرے تو اسے تحریری مشق تسلسل سے جاری رکھنی چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا مضمون نگار عمدہ مقرر بھی ہو، بہت سے لئیق و ذہین مضمون نگار اچھے مقرر ثابت نہیں ہوئے۔ البتہ مقررین نے اس صفت کو اپنا کر ممایزت حاصل کی۔

"ریطوریقا" میں بھی ارسطو نے مقرر کے قادرالکلام ہونے کو اہم قرار دیا ہے، کیوں کہ زبان ہی مقرر کے لیے ذریعہِ اظہار ہے، اس لیے مقرر کو زبان پر مکمل دسترس اور اس کے درست استعمال پر عبور ہونا چاہیے۔ زیرِ تجزیہ کتاب میں بھی اس امر کو اپنانے، پھر مناسب اور بامقصد مشق کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ یہ اس وقت ممکن ہے، جب انسان کا ذخیرہِ الفاظ انتہائی وسیع ہو۔ ہر صورت حال کو مناسب انداز میں بیان کرنے کے لیے مقرر کو برجستہ جملہ کہنے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ نام ور مقررین باقاعدہ لغات میں سے الفاظ تلاشتے اور پھر انھیں اپنی تقریر میں استعمال کرتے۔ مسٹر ہال کولپ اور کونٹیلن کا حوالہ دیتے ہوئے مقرر کو کتابی مواد کی زبانی دہرائی اور تقریر کی مسلسل زبانی مشق کا مشورہ دیا گیا ہے۔ مقرر جب تنہائی میں مشقِ تقریر کرے تو اسے تصور میں سامعین کا حصار اپنے گرد محسوس کرنا چاہیے۔ تاکہ سامعین سے سامنے کی صورت میں اسے کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا سامنا نہ ہو۔

جب بھی کوئی مقتدی کسی فن کو سیکھنے کی کوشش کرتا ہے، اسے مختلف النوع مشکلات اور دقائق کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال میں اسے مستقل مزاجی اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ "فنِ تقریر" میں کچھ نام ور مقررین کی ابتدائی مشکلات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جو ابتدائی ناکامی سے شکستہ دل ہونے کے

بجائے ڈٹ گئے۔ پہلے سے زیادہ محنت اور کوشش کی۔ جس کی وجہ سے وہ اس شعبے میں ممتاز ہوئے۔ ان مقررین میں شیریڈن، رابرٹ ہال، ارل آف بیکنس فیلڈ، ڈیماستھنیز کی مثالیں ملتی ہیں، جنھوں نے تسلسل اور تواتر سے محنت جاری رکھی اور بالآخر اس میدان میں ایسی مہارت کا مظاہرہ کیا کہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

فنِ تقریر میں مہارت حاصل کرنے کے لیے جہاں دیگر صفات اور خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہاں ایک اصطلاح "خاموش تقریریں" بھی ہے۔ اس ضمن میں مقرر دل ہی دل میں کوئی مضمون تجویز کرتا ہے اور اس سے متعلقہ خیالات کو پروتا چلا جاتا ہے۔ یہ ایسی مشق ہے جس سے مقرر اپنا مواخذہ کر سکتا ہے کہ کس موضوع پر اس کے پاس کتنی معلومات ہیں، تجویز کردہ موضوع پر وہ کتنی دیر بول سکتا ہے، مدعا و مقصد کے لیے کن الفاظ کا چناؤ مناسب ہے۔ یہ طریقۂ مشق مقرر میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔

جب مقرر کسی موضوع پر برجستہ تقریر شروع کرتا ہے تو اس وقت اس کا حافظہ ہی اس کا ساتھ دیتا ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ حافظے کی مناسب تربیت کی جائے۔ یہاں تھیسٹیا کلیز کی مثال دی گئی ہے کہ اس نے محض ایک سال کے عرصے میں فارسی زبان سیکھ لی تھی۔ متھریڈ ٹیسز جس کی حکومت کا دائرہ کار انتہائی وسیع تھا، بائیس اقوام پر حکومت کرتا تھا اور ان اقوام کی بائیس زبانوں پر اسے عبور حاصل تھا۔ اس کے علاوہ سائرس کی بابت کہا گیا ہے کہ اسے اپنی فوج کے ہر سپاہی کا نام ازبر تھا۔ یہ مثالیں مقررین کو برانگیخت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ ذاتی کوشش اور محنت سے اپنے حافظے کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق معلومات کو اپنی یاداشت کا حصہ بنا لیں۔ وہ لوگ جن کا حافظہ خراب ہوتا ہے، وہ درحقیقت توجہ اور تسلسلِ خیالات کی ممارست نہیں کرتے۔ اگر وہ باقاعدہ تربیتی عمل سے گزریں، تو اس ضمن میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

حافظے کی تربیت کے بعد جو اصطلاح "فنِ تقریر" میں سامنے آتی ہے، وہ حفظ یاد کرنا ہے۔ یہاں یہ باور کرانے کی سعی کی گئی ہے کہ اگر مقرر کسی موضوع پر کسی کلام یا تحریر کو ازبر کرنا چاہتا ہے تو اسے کئی حصص میں تقسیم کر لے اور پھر بالترتیب اسے حفظ کر لے۔ کسی کلام کو حفظ کرنے کا یہاں مناسب وقت رات سونے سے قبل کا بتایا گیا ہے، بشرطیکہ شکم سیر نہ ہوں اور دوسری صبح حفظ کیے ہوئے مضمون کو دہرا لیا جائے۔

دوسرے باب کے آخر میں مقرر کے اوصاف کو انتہائی جامع اور مختصر انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔ سسرو کے قول کو نقل کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ

"مقرر میں منطقی کی سی تیز فہمی، فلسفی کی سی دانائی، شاعر کی سی زبان، قانون دان کا سا

حافظہ، ایک عمدہ اداکار یعنی ایکٹر کی سی فصاحت اور حرکات ہونی چاہئیں۔"(۱۹)

ماضی کے اوراق پلٹ کر دیکھ لیجیے، انھی مقررین کو اوج، عروج اور دوام حاصل ہوا، جو ان تمام اوصاف سے متصف تھے۔ اگر حالیہ مقررین پر نظر ڈالی جائے تو انھی مقررین کو مقبولِ عام حاصل ہے، جن میں یہ تمام خوبیاں اعلا درجے کی مکمل حالت میں پائی جاتی ہیں۔ یہ صفتیں انھی مقررین کا مقدر بنیں جنھوں نے انتہائی محنت اور کوشش سے مسلسل مشق جاری رکھی۔

## 6۔ بیانِ مدعا کے تقاضے

"فنِ تقریر" کا تیسرا باب "مقصد کے ایک ہونے، مواد کی ترتیب اور اسلوبِ بیان" سے متعلق ہے۔ "ریطوریقا" میں مقصد کے ایک ہونے کے متعلق کوئی بحث نہیں ملتی، البتہ تقریر کی منطقی ترتیب اور اسلوبِ بیان پر الگ الگ مفصل اور واضح بحث موجود ہے۔ ارسطو منطقی ترتیب اور طرزِ اظہار کو تقریر کے موثر ہونے کی ابتدا قرار دیتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بھی یہی موقف اپنایا گیا ہے۔ تاہم ترتیبِ تقریر کے ضمن میں زیادہ تفصیل درج نہیں ہے، جب کہ اسلوبِ بیان کو "ریطوریقا" میں بیان کیے گئے خصائص کے ضمن میں ہی مفصل بحث کیا گیا ہے۔

مقرر جب بھی تقریر کرے ایک مقصد کے تحت ابتدا سے انتہا تک خیالات، واقعات اور حوالہ جات لے کر آئے، تاکہ سامعین کے قلوب و اذہان پر ایک اچھا تاثر قایم ہو۔ "مدعا و مقصد کا ایک ہونا" کے ذیل میں سسرو کا قول نقل کیا گیا ہے کہ "جو خیال تقریر کے خاص مدعا کو وسعت نہ دیتا ہو، وہ خارج ہونے کے قابل ہے۔"(۲۰) مقرر کو چاہیے کہ انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ اپنے مدعا و مقصد کے تحت تمام خیالات و افکار کو انتہائی دل چسپی کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کرے۔ بعد ازاں جس خاص وصف پر زور دیا گیا ہے، وہ ترتیب ہے۔ اگر تقریر میں خیالات کو مرتب نہ کیا جائے تو وہ تاثر اور سامعین کی توجہ اور انہماک سے تہی رہتی ہے۔ ترتیب کے بعد اندازِ بیان کی بابت مختلف حوالہ جات کے ساتھ بحث کی گئی ہے کہ مقرر ایسا اندازِ بیان اپنائے جو نہ صرف یہ کہ سہل ہو بلکہ دل چسپی کا حامل بھی ہو۔

تقریر اور تحریر کی زبان میں فرق ہے، مقرر جیسے جو کچھ پڑھتا ہے، ویسے ہی بیان کر دے گا تو ہو سکتا ہے عوام یا سامعین میں کچھ لوگ ایسے ہوں جو زبان و بیان کے حوالے سے کورے ہوں، اس لیے دورانِ تقریر ایسا اسلوب و انداز اپنایا جائے جو ہر ایک کی سمجھ میں آئے۔ ارسطو کے مطابق "زبان جس قدر عام فہم نہ ہو گی اسی قدر وہ اس مدعا کے حاصل کرنے میں ناکام ہو گی، جس کے لیے وہ استعمال کی جائے گی۔"(۲۱) اشعار

اور حوالہ جات بھی وہ پیش کیے جائیں جو عام فہم ہوں۔ اگر کوئی ایسا شعر پیش کر دیا جائے، جو عوام کی ذہنی سطح سے بلند ہو تو مقرر کو چاہیے کہ اس کا مفہوم انتہائی سہل انداز میں سامعین کے گوش گزارے۔ مجمعے کے مطابق زبان و بیان کی تبدیلی ضروری ہے۔ بعض اوقات مقرر کو انتہائی فہیم و ذہین سامعین سے مخاطب ہونا پڑتا ہے اور بعض اوقات سطحی ذہن کے مالک لوگوں سے خطاب کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اب اگر پہلی طرح کے سامعین کے سامنے علمیت سے تہی سطحی سی تقریر کی جائے تو وہ اس سے متاثر نہیں ہوں گے۔ اسی طرح دوسری قسم کے سامعین کے سامنے انتہائی عالمانہ انداز اختیار کیا جائے تو وہ سب باتیں ان کے لیے بعید از فہم ہوں گی۔

"ریطوریقا" میں مرقوم مدعا کی طرح مذکورہ کتاب میں بھی اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ مقرر کو اصطلاحات، تشبیہات اور استعارات کے معاملے میں انتہائی احتیاط برتنی چاہیے۔ اگرچہ بعض اوقات غم اور جوش بڑھانے میں استعارات و تشبیہات ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، بر موقع اور بر محل اشعار و اقوال تقریر میں نکھار پیدا کرتے ہیں۔ جو بات بھی کی جائے اس کی سند اور حوالہ پیش کیا جائے۔ تقریر کو سنوارنے میں اعتدال سے کام لینا چاہیے، مصنوعی آراستگی تقریر کو بے رونق بنا دیتی ہے۔ کتاب ہذا کے مطابق تقریر میں مزاح اور تمسخر ایک اچھا تاثر پیدا کرتے ہیں۔ اگر مضمون خشک ہو تو اس میں دل چسپی کا عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ تاہم اس ضمن میں خیال رکھا جائے کہ حد سے زیادہ مزاح بھی تقریر کو بے تاثر کر دیتا ہے اور سنجیدہ لوگ متنفر ہو جاتے ہیں۔ مقرر تقریر کرتے ہوئے اس بات کو ملحوظ رکھے کہ تقریر نہ اس قدر طویل ہو کہ سنتے ہوئے اکتاہٹ محسوس ہونے لگے اور نہ اس قدر مختصر اور قلیل ہو کہ مدعا کا بھی اظہار نہ ہو بلکہ وسطی صورت بہتر ہے۔

## 7۔ مختلف طریقہ ہائے تقریر

"ریطوریقا" میں ارسطو نے اپنے زمانے کے رجحان اور لوگوں کے میلان کے مطابق اپنے مباحث کے مندرجات منتخب کیے ہیں۔ اس کتاب میں تقریر کو تحریری اور زبانی طریقوں میں منقسم نہیں کیا گیا، جب کہ زیرِ تجزیہ کتاب میں اقتضائے حال کے موافق تقریر کو ان اقسام میں منقسم کیا گیا ہے۔ "فنِ تقریر" کے باب چہارم میں تقریر کرنے کے مختلف طریقوں پر بحث کی گئی ہے۔ اس ضمن میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ مقرر چار طریقوں میں سے کسی ایک کے تحت اپنی تقریر تیار کرتا ہے، اپنے مافی الضمیر کا باقاعدہ اظہار کرتا ہے۔ ان چار طریقوں میں سے پہلا طریقہ "لکھا ہوا پڑھنا"؛ دوم "اول لکھ لینا، پھر یاد کر لینا اور لکھا ہوا بغیر دیکھے تقریر

کر دینا"؛ سوم "مضمون کا خاکہ تجویز کر کے دل میں رکھ لینا اور ادا کرنے کے لیے وقت اور موقعے پر بھروسا کر لینا"؛ چہارم "دوسری اور تیسری تدبیر کو اس طرح ملانا کہ مضمون کے اہم حصص یاد کر لینا اور باقی کے لیے وقت اور موقعے پر بھروسا کر لینا"۔ مذکورہ بالا تمام طریقے مضرت اور منفعت کے حامل ہیں۔

ان میں سے سب سے آسان طریقہ پہلا ہی ہے۔ جو پند آمیز تقریر، تحقیقی و علمی تقاریر کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ اس کا مقصد محض اکسانا اور برانگیخت کرنا نہیں، بلکہ معلومات پیش کرنا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھی جائے کہ ایسے کاغذوں پر نہیں لکھنا چاہیے جنھیں بار بار الٹنے کی ضرورت ہو، بلکہ چند ضروری اور اہم نکات لکھے جانے چاہئیں۔ یہاں مشہور انگریزی مقرر مسٹر برائٹ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے؛

> "مجھ کو اپنی تقریریں لکھنے کی عادت نہیں ہے اور تیس برس سے میں نے کبھی نہیں لکھیں۔ لکھنے کی محنت بہت زبون ہے اور حفظ کرنے کی محنت ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ کافی ہے کہ مضمون زیر تقریر پر غور کیا جائے اور چند مختصر یاداشتیں لکھ لی جائیں لیکن سب سے پہلے اس مضمون کی ایک اصلی واقفیت درکار ہے۔ اس طرح مشق کرنے سے تقریر کرنا آسان ہو جائے گا۔"(۲۲)

اگر کوئی مقرر تمام کی تمام تقریر من و عن لکھ لیتا ہے تو جب عوام کے سامنے جاتا ہے اور اسے دیکھ کے پڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو ویسے ہی بوکھلاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اس موضوع سے متعلق اگر اس کے پاس ذخیرۂ معلومات نہیں ہو گا تو اس کے لیے بات کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اگر وہ مجوزہ موضوع سے متعلق پہلے سے معلومات رکھتا ہے اور اس موضوع کی ذیل میں چند نکات لکھ لیتا ہے تو اس کے لیے تقریر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں حافظے سے تقاریر کرنے کا رواج تھا۔ یعنی، تقریر کو لکھ کر مکمل یاد کر لیا جاتا تھا، اور یاد کی ہوئی تقریر سامعین کے سامنے پڑھ دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں، فی البدیہہ تقاریر بھی کی جاتی تھیں۔ لیکن فی البدیہہ تقریر کرنا ہر ایک مقرر کے بس کی بات نہیں، کیوں کہ حافظے کا ناکام ہو جانا یا نسیان کا سامنا کرنا انسانی وصف ہے۔ اس صورت حال میں مقرر کو سوائے ندامت اور شرمندگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا، جب کہ وہ مختصر یاداشتیں اپنے پاس لکھ کر محفوظ کر لے تو اس کی کامیابی بعید نہیں۔ یہاں معروف انگریزی مقرر بابو کیشب چندر سین کی مثال دی گئی ہے، جو اپنی تقاریر کو پیشتر یاد کیا کرتے اور سامعین کے سامنے اظہارِ خیال کرتے۔ "فنِ تقریر" میں کی جانے والی رہ نمائی محض کتابی یا غیر حقیقی نہیں ہے، بلکہ تجرباتی ہے۔ اس لیے،

نو آموز مقررین کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقریر کے لیے پہلے تو مجوزہ موضوع سے متعلق معلومات حاصل کریں، پھر انھیں ترتیب دے کر چند نکات کی صورت میں ڈھال کر تیار کر لیں اور یوں اپنی تقاریر کا آغاز کریں۔ تاکہ دورانِ تقریر نسیان سے بچا جا سکے اور اپنے مدعا و مقصد کو بہ طریق احسن ادا کیا جا سکے۔

بعد ازاں، "برجستہ تقریر" کی ذیل میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ طریقہ سب سے بہتر اور موثر ہے۔ اس میں پہلے پہل موضوع سے متعلق دل میں سوچا جاتا ہے اور مرتب کر لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں، مناسب مقام پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ جو مقرر اس طرح تقریر نہ کر سکے اور برجستگی کی صفت سے تہی ہو، وہ مقرر کے خطاب کا ہر گز مستحق نہیں۔ برجستگی مقرر کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ جس طرح ایک تیراک اپنے بازوؤں کے بل بوتے پر تیرتا ہے، اسی طرح مسلسل مشق اس فن میں ظاہر ہونی چاہیے۔ اردو زبان میں برجستہ تقریر کرنے والے پہلے مقرر "سر سید احمد خاں" تھے۔

ایک چوتھا طریقہ جو تقریر کے لیے مستعمل ہے، وہ دوسرے اور تیسرے قاعدے کو باہم مدغم کرنا ہے، لیکن اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ برجستہ تقریر میں حفظ شدہ حصہ اس مہارت و جسارت سے شامل کیا جائے کہ سننے والے کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ پہلے سے یاد کی ہوئی بات دہرائی جا رہی ہے۔

## 8۔ حرکات و اشارات ذریعۂ ترسیل

"ریطوریقا" میں حرکات و سکنات اور اشارات کو موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا جب کہ مذکورہ کتاب میں باب پنجم کی ذیل میں "حرکات کے اہم اصول" بیان کیے گئے ہیں، کیوں کہ دورانِ تقریر مقرر کی حرکات و سکنات اس کے مدعا و مقصد کی تفہیم و تاثیر میں اضافہ کرتی ہیں۔ جب مقرر سامعین کے سامنے آتا ہے اور اظہارِ خیال شروع کرتا ہے تو محض ساکت ہو کر کھڑا نہیں رہتا بلکہ اپنی تقریر کے مطابق ہاتھوں اور بازوؤں کے ذریعے اشارات اور حرکات کرتا ہے۔ اگر کوئی مقرر عام مجمعے میں کھڑے ہو کر ڈرامائی اثر پیدا کرنے کی خاطر خواہ مخواہ اور بے تکے اشارے کرے گا تو وہ نشانۂ تمسخر بنے گا۔ لہٰذا، ضروری ہے کہ جو بات کی جا رہی ہو، اس کے موافق ہی کوئی حرکت کی جائے، ہاتھوں اور بازوؤں کو ہلایا جائے۔ "فنِ تقریر" کا وصف یہ ہے کہ اس میں باقاعدہ تصاویر کے ذریعے حرکات و سکنات کو واضح کیا گیا ہے، تاکہ مقرر غیر فطری حرکات سے گریز کرے۔ اس ضمن میں یہاں کوئن ٹیلین کی بات نقل کی گئی ہے کہ

> "ہاتھوں سے ہم مانگتے ہیں، انکار کرتے ہیں، وعدہ کرتے ہیں، دھمکاتے ہیں، رد کرتے ہیں، طلب کرتے ہیں اور نفرت، خوف، شبہ، انکار، طلب، اثبات، نفی، خوشی، غم،

اقرار اور معذرت ظاہر کرتے ہیں۔ ہاتھوں ہی کی حرکت سے ہم وقت، مقام اور کسی شے کے حالات ظاہر کرتے ہیں۔ اوروں کو جوش دلاتے ہیں اور ان کو ٹھنڈا کرتے ہیں، تائید یا ناموافقت کرتے ہیں، اجازت دیتے ہیں یا ممانعت کرتے ہیں، تعریف کرتے ہیں یا تحقیر کرتے ہیں۔۔۔"(۲۳)

چوں کہ ہاتھ کی مختلف حرکات و اشارات کے ذریعے بات کی منتقلی میں مدد ملتی ہے، لہٰذا دورانِ تقریر موضوع کی مناسبت سے ہاتھ کی حرکات تفہیمِ مدعا کے لیے مفید ہو سکتی ہیں۔ انگلیوں کی حرکات کے بھی معنی ہیں۔ علاوہ ازیں، کھڑے رہنے کے بھی مختلف انداز ہیں جنھیں وہ اپنی ضرورت کے تحت اپناتا ہے۔ اسی طرح مقرر کا چہرہ اور چہرے کے تاثرات اس کے دلی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ مقرر کا چہرہ اس کی تقریر کے مطابق بعض اوقات سرخ ہو جاتا ہے، جس سے غصے کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح زردی سے خوف اور شرم کا تاثر ابھرتا ہے۔ خوشی سے باچھیں کھل اٹھنا، ناک پر بل پڑنا، آنکھوں میں اشک بھر آنا، آنکھیں نیم وا ہونا اور ابروؤں کے بادل کی طرح آنکھوں پر جھک جانا، یہ تمام تاثرات مقرر کے چہرے پر ابھرتے رہتے ہیں۔ اس کی آنکھیں اس کے جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہیں، اس کے دل کی مختلف کیفیات کا اظہار ہوتا ہے۔ خوشی کا تاثر ابھرنے پر آنکھیں چمک اٹھتی ہیں؛ غمی کے تاثر پر آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں؛ غصے اور نفرت کے وقت ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں میں شعلے لپک رہے ہوں۔ اس لیے چہرے اور آنکھ کی حرکات پر مقرر کو بے حد توجہ دینے کی ضرورت ہے، کیوں کہ چہرہ ایک آئینے کی مانند ہے، جس میں اس کے دل کے تمام جذبات دیکھے جاسکتے ہیں اور آنکھیں ان جذبات کی تصدیق و تائید کرتی ہیں۔

چھٹا باب "خلاصے" کے عنوان سے معنون ہے، جس میں "فنِ تقریر" کے تمام مباحث کی انتہائی سہل انداز میں تلخیص پیش کی گئی ہے۔ مضمون کا انتخاب، مواد کا جمع کرنا، مواد کی ترتیب، مضمون کا انشا، طرزِ بیان اور حرکات و سکنات وہ خصائص ہیں جنھیں اپنا کر ایک مقرر اپنی تقریری صلاحیتوں کو مستحکم کر سکتا ہے۔ کیوں کہ اگر مقرر مذکورہ صفات میں سے کسی ایک سے بھی تہی ہو گا تو اس کی تقریر میں توازن برقرار نہ رہے گا۔ اس کی تقریر ارفعیت کے بجائے سطحیت کے درجے پر رہے گی، جب کہ مقرر اہتمام کے ساتھ ان چھ لوازم کو اپنالے تو فنِ خطابت کے میدان میں دیگر مقررین سے برتر اور اعلا مقام حاصل کر سکتا ہے، لیکن متواتر مشق شرط ہے۔

## ج۔ "رموزِ خطابت" از نذیر الدین احمد - تجزیہ

"رموزِ خطابت" نذیر الدین احمد کی تصنیف ہے۔ جس میں فنِ تقریر کے اسرار و رموز کو طشت از بام کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے تحریر کیا۔ جس میں انھوں نے اس بات کی جانب توجہ دلائی ہے کہ قوموں کی ترقی اور تنزل کا دارومدار فنِ تقریر پر ہے۔ انسان کو دیگر مخلوقات سے اعلاو ارفع کرنے والی شے نطق ہے اور فنِ تقریر نطق کے استعمال کی معراجی منزل ہے۔ اگرچہ اردو ادب میں اس موضوع پر بہت کم لکھا گیا، لیکن خوش آیند بات یہ ہے کہ اب اس موضوع کی جانب محققین اور مصنفین راغب ہوئے ہیں۔ نذیر الدین احمد نے بھی اس کتاب کو تب مرتب کیا جب انھوں نے اس موضوع کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو اور انگریزی کی اعلا و ارفع کتب سے رہ نمائی حاصل کی۔

### 1۔ خطابت کی اہمیت و افادیت

"ریطوریقا" میں فنِ خطابت کے جملہ اسرار و رموز کو جس طرح بیان کیا گیا ہے، اس سے اس فن کی عظمت و رفعت اور وسعت و اہمیت مترشح ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اختصار و جامعیت سے اس فن کی معاشرے اور علم کے میدان میں افادیت و اہمیت کو بیان کیا گیا ہے، اسی کے تتبع میں نذیر الدین احمد نے بھی اپنی تصنیف "رموزِ خطابت" میں اس فن کی اہمیت کو جامعیت کے پیرائے میں اجاگر کیا ہے۔ باب اول میں نذیر الدین احمد نے خطابت کی اہمیت، افادیت و سحر کاری، تقریر اور مشق کے طریقے، فنِ تقریر اور ریاضت، علاوہ ازیں مقرر اور صحتِ جسمانی؛ ان پانچ نکات کو بڑی مہارت اور جدت سے بیان کیا گیا ہے۔ باب اول کے نکتے "خطابت کی اہمیت، افادیت و سحر کاری" کی ابتدا ڈاکٹر سیگمڈ فرائیڈ کے اس قول سے کی ہے کہ

> "آپ اور ہم جو کچھ کرتے ہیں، اس کے دو محرک ہیں۔ اولاً، خواہشِ نفسانی کی پیروی؛ ثانیاً، ذاتی عظمت کی ہوس۔" (۲۴)

محولہ بالا قول اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان کی فطری کمزوری سطحیت سے ارفعیت کی جانب اڑان ہے۔ مختلف حیلوں اور بہانوں سے اوج اور عروج تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے ڈیل کارنیگی اور ریمزے میکانلڈ کی مثال دی ہے، جنھوں نے انتہائی عسرت کے عالم میں غیر معمولی مزاولت اور ممارست کی بہ دولت ممایزت اور ارفعیت حاصل کی۔ مذکورہ مقررین کی محنت اور تگ و دو نے

انھیں چہار دانگ عالم شہرت دی اور فنِ خطابت کے افق پر نمایاں ستاروں کی طرح ابھرے۔ فنِ تقریر ایسا فن ہے جس کی بہ دولت ہر ملک، قوم اور زمانے میں امتیاز حاصل رہا ہے۔ سار جنٹ کے بہ قول "مقررین نے ہر ملک اور ہر زمانے میں امتیاز حاصل کیا ہے۔"(۲۵) صاحبِ کتاب نے مقدونیہ کے معروف بادشاہ فلپ ایلفوس کی مثال اور مشہور فلسفی مسٹر لاک کی رائے کے ذریعے فنِ تقریر کی اہمیت و افادیت اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس شخص کے لیے کامیابی کا حصول آسان ہو جاتا ہے، جو اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں مہان ہو۔ یہ ایسی قوت ہے، جو اپنے معاصرین میں انسان کو نمایاں کرتی ہے، ناممکنات کو ممکنات میں تبدیل کرنے پر قدرت رکھتی ہے، قوموں کی قسمت کا فیصلہ بھی مقررین کرتے ہیں۔ نذیر الدین احمد نے مقرر کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"مقرر حقیقت میں شیرازہِ زندگی ہے، جو عصر کے کاغذ پر اپنا دل و دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ جس میں حرکت اور ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔"(۲۶)

ماضی میں فنِ خطابت کے کرشمات اس وقت ظاہر ہوتے، جب کسی قوم و ملک کو جوش و انقلاب کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اس وقت یہ ضرورت محض مقررین ہی پوری کرتے، جو اپنے خیالات، افکار اور قوتِ گفتار سے ایسی انقلابی تحریک چلاتے کہ قوم کے ہر طبقے کے لوگ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ایسے متحرک ہوتے کہ اپنی جان کی بازی تک لگانے سے گریز نہیں کرتے۔ اس ضمن میں "رموزِ خطابت" میں جنرل ڈیر پورا کی مثال دی گئی ہے، جو عوام کے قلوب و اذہان پر حکومت کرتا تھا۔ اسے جب کسی محاذ پر جانا ہوتا تو وہ محض تقریر کے ذریعے سے فوج اور عوام کا اس حد تک ابھارتا کہ اس کی مرضی اور منشا کی تکمیل ہو جاتی۔ فاضل مصنف نے تقریر کی اہمیت کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ جس کا مطالعہ کر کے ایک نو آموز مقرر بغیر کسی تعطل کے فنِ تقریر کو سیکھنے اور عملی زندگی میں اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے از خود تیار ہو جاتا ہے۔

ایک قابل مقرر کی تقریر کا اثر یہ ہوتا ہے کہ سامعین کی آرا بدل جاتی ہیں۔ کیوں کہ ایک ماہر مقرر اپنے مدعا و مقصد کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ اس کی باتیں لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ انقلابِ امم میں مقرر کی زبان نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یونان، روم، عرب، ہندوستان، فرانس اور اہلِ فرنگ نے اس فن میں جدت و مہارت پیدا کی اور اس فن کی بہ دولت ہی دیگر اقوام میں نمایاں ہوئے۔ کتابِ ہذا میں اس بات کو بھی اظہر من الشمس کیا گیا ہے کہ خطیب اور مقرر سے تہی قوم گونگی ہے۔ اردو زبان کو دیکھا جائے تو اس کی ابتدا مذہبی کتب سے ہوتی ہے، اسی طرح تقریر بھی مذہب کی آغوش میں پلی بڑھی۔

## 2۔ خطابت کی روایت

"ریطوریقا" میں فنِ خطابت کے تمام لوازمات اور متعلقات کو بہ طریق احسن بیان کیا گیا ہے، لیکن خطابت کی روایت کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ بر عکس ازیں، مذکورہ کتاب میں خطابت کی روایت پر بھی چند اں روشنی ڈالی ہے۔ یونان اور روم کی سرزمین علوم و فنون کا مخزن اور گہوارہ تھی۔ وہاں کے مقررین کے کارناموں پر غور کیا جائے تو ان کی داستانیں پوری دنیا میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ یونان میں فیلکوس، ڈیماستھینز، لی سیاس، پالی ٹریٹس، پریکلیسز، کلی زون، السی بے ایڈز، کرسٹی اکس اور سقراط کے علاوہ اخلاقی دروس اور تقاریر میں آئسا کریٹنیز نے اپنی خطیبانہ صلاحیتوں سے ایک عالم کو متاثر کیا۔ اہلِ روما میں سسرو، عرب میں قبائل عمان، بنو تمیم، بنو شعبان کے ساتھ یزید بن، کعب بن نوی ارضیاء بیعۃ الرائے، سعد بن عبادہ، جبیر، عبد اللہ بن عامر، ابو تمیر، مصحب بن عمر، ابراہیم بن تیار النظام، ابراہیم بن جبلہ، حضرت محمد ﷺ اورانؐ کے خلفا و اصحاب میدانِ خطابت میں معروف ہوئے۔

انگلستان میں پندرھویں صدی کے اختتام علم و دانش وری کو عروج حاصل ہوا۔ انگلستان کے معروف مقررین میں بالڈون، گلیڈ اسٹون، شریڈن، جان برائٹ، اڈمن، فاکس، برکس، مسٹر چرچل، بیون، اینتھونی ایڈن اور اٹیلی شامل ہیں۔ ہندوستان میں یہ فن مذہب کی ترویج میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ مہاتما بدھ اور مہابیر جی اس حوالے سے مثالی شہرت کے حامل ہیں۔ ہندوستانی زبان میں سب سے پہلے تقریر کرنے والے کا نام "لالہ بھگوان داس" ہے۔ بعد ازاں، اس منظرنامے پر کئی دیگر مقرر بھی ابھرے، جن میں بار کیشب چندر سین، دادا بھائی نوروز جی، محسن الملک، سر سید احمد خان، نذیر احمد، دیش بندھو داسی، گھوکھلے، لوکمانیہ تلک، مولانا محمد علی، موتی لال نہرو، سر علی امام، سر سپرو، گاندھی جی اور قائداعظم محمد علی جناحؒ، سر ینواس شاستری، نواب بہادر یار جنگ، سروجنی نائیڈو، سید عطا اللہ شاہ بخاری،، ابوالکلام آزاد، ستل واڈا، سر راما سوامی مدلیار اور سر ظفر اللہ خاں، شامل ہیں۔ "رموز خطابت" میں خطابت کی تاریخ اور روایت کو مختلف اقوام کے تذکرے اور معیار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ فنِ خطابت کی تعلیم کی تحصیل کا شوق رکھنے والوں کی نہ صرف دل چسپی برقرار رہے، بلکہ ان سب اقوام کی فنِ خطابت میں مہارت اک نئے مقرر کو کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لیے برانگیخت کرتی ہے۔

آخر میں صاحبِ کتاب نے قدرے افسوس کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ بعض مقررین اپنی پُر تاثیر اور سحر آفریں خطیبانہ صلاحیتوں کو معاشرے میں فرقہ واریت اور منفیت پھیلانے کے لیے استعمال

کرتے ہیں۔ تاہم، وہ ایسے خطبا سے پُر امید ہیں، جو سماجی اصلاح کے لیے سر گرمِ عمل ہیں اور اپنی قادرالکلامی و فصاحت کو معاشرے کے بگاڑ اور برائیاں دور کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

## 3۔ فنِ تقریر اور مقرر

ارسطو نے "ریطوریقا" میں تقریر کا تحریری و تحفیظی طریقہ ہائے کار متعارف نہیں کروایا، البتہ یہ ضرور بتایا ہے کہ موضوع پر مقرر کی گرفت لازمی ہے، نیز موضوع سے متعلق خاطر خواہ علم بھی مقرر کے لیے ناگزیر ہے۔ "رموزِ خطابت" میں تقریری طریقوں کو مذکورہ پہلوؤں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ صاحبِ کتاب نے بغیر کسی الجھاؤ اور پیچیدگی کے سہل اور مختصر انداز میں ان طریقوں کی وضاحت کی ہے۔ سب سے پہلا طریقہ یہ ہے کہ مقرر لکھے ہوئے مضمون کو سامعین کے سامنے من و عن پڑھ لے۔ دوسرے طریقے میں مضمون کو حفظ کر کے تقریر کی شکل دینا ہے جب کہ آخری طریقے کے مطابق مقرر موضوع سے متعلق چند اہم نکات مرتب کرے اور پھر ان کی مدد سے تقریر کرے۔

مصنف کے مطابق لکھے ہوئے مضمون کو وہی لوگ پڑھتے ہیں، جو اعلا درجے کے قلم کار ہوں۔ یہ تقاریر خطبہ صدارت، استقبالیے یا علمی و تحقیقی حوالے سے تو موثر ہو سکتی ہیں، لیکن عوامی تقاریر میں یہ طریقہ کار گر ثابت نہیں ہوتا۔ کیوں کہ وہاں جوش و خروش کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ لکھی ہوئی تحریر کو پڑھنے سے جوش پیدا نہیں ہوتا۔ حفظ شدہ تقاریر میں یہ احتیاط برتی جائے کہ سامعین کو یہ احساس نہ ہو کہ مقرر یاد کی ہوئی یا رٹی ہوئی تقریر کر رہا ہے۔ کیوں کہ اس سے فطری تاثر زائل ہو جاتا ہے اور بناوٹی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ صاحبِ کتاب نے یہاں تقریر یاد کرنے کے متفرق طریقے بھی بتائے ہیں۔ یاد کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ تقریر کے مختلف حصے کیے جائیں اور ان حصص کو یاد کر لیا جائے۔ یہاں ڈاکٹر بلیر کے قول کا حوالہ دے کر یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مقرر تقریر کی تیاری کے لیے پہلے اسے خود لکھے، اس کے خاص حصص یاد کرے اور اہم ترین نکات پر غور کرے اور اس حد تک کوشش کرے کہ ان نکات کا حافظے سے محو ہو جانا ناممکن ہو جائے۔ "رموزِ خطابت" کے مصنف نے یاداشت کی مدد سے تقریر کرنے کے عمل کو مستحسن قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف خطبا کا حوالہ دے کر یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ یاداشت یا حافظے کی مدد سے تقریر کرنا مقرر کے لیے سہل ہے۔ اس سے سامعین پر ایک اچھا تاثر پڑتا ہے۔ اس طریقے کو ایک مقرر اس طرح اپنائے کہ وہ تقریر سے پہلے ایک کاغذ اپنی تقریر کا تمام خاکہ مرتب کرے، اس خاکے سے متعلق جملہ معلومات کے نکات تیار کرے اور ان کو اپنے حافظے میں محفوظ کرنے کی کوشش کرے۔

## 4۔ مشق کے طریقے:

"ریطوریقا" میں مسلسل مشق اور مشق کے مختلف طریقوں کے بارے میں کوئی باقاعدہ رہ نمائی نہیں کی گئی، تاہم یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ مقرر مسلسل مشق سے ہی کسبی اوصاف اور مہارتِ تقریر کی تحصیل کر سکتا ہے۔ جب کہ زیرِ نظر کتاب میں "مشق" کے ضمن میں تقریر کرنے کے مختلف طریقوں سے متعلق بات کرنے کے بعد مشق کے طریقے رقم کیے گئے ہیں۔ یہاں مصنف نے عالمی شہرت یافتہ مقررین کی مشقی ممارست کا تذکرہ کیا ہے، جن میں ڈیل کارنیگی، چارلس فاکس، ڈین کروان، ڈیما تمینز سسرو، ہورسٹس، لارڈ بیکیفیلڈ اور ڈسرائیلی، رابرٹ ہال شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خلیفہ سوم حضرت عثمان کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ وہ خطبا ہیں جن کو ابتدا میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کی کام یابی محض تین حروف میں مضمر ہے۔ یہ حروف م ش ق یعنی مشق ہیں۔ مصنف نے مقررین کی مشق کے لیے پانچ نکات بیان کیے ہیں، جن پر عمل کر کے ایک مقرر اپنے فن میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ مقرر اگر فنِ تقریر میں نمایاں مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی متعین موضوع پر دل میں اظہارِ خیال کرے اور اس عمل کو دُہراتا رہے۔ دوسرا نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی کتاب کے صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد اسے اپنے الفاظ میں بیان کرے۔ بعد ازاں، مطالعے کو وسعت دے اور بعینہٖ اپنے الفاظ میں اظہارِ خیال کرتا رہے۔ اس سے بھی اس کے فن کو تقویت ملے گی۔ تیسرا نکتہ "کونٹیلس" کا حوالہ دے کر بیان کیا گیا ہے کہ کسی فصیح و بلیغ شاعر کے کلام کو اتنی توجہ سے پڑھا جائے کہ اسے بہ آسانی نثر میں تبدیل کر کے اپنے خیالات کے اضافے کے ساتھ تقریری صورت میں بیان کرے اور یہ سلسلہ جاری رکھے۔ تقریر کی مشق کا چوتھا طریقہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تقریر کو مختلف حصص میں منقسم کیا جائے؛ پہلا حصہ تمہید، دوسرا دعوی، تیسرا دعوے کے اثبات میں دلائل و براہین، چوتھا دلائل کی روشنی میں نتیجہ اخذ کیا جائے، پانچواں طریقہ یہ ہے کہ نام ور خطبا کی تقاریر کو انتہائی غور سے سنا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ تقریر کے مختلف مدارج کو کس طریقے سے پیش کیا گیا ہے، مقرر سامعین کے سامنے کس طرح آیا اور دورانِ تقریر اس نے کیا انداز اپنایا؛ اس نے مقررین کو ابتدا سے انتہا تک کن وجوہات کی بنا پر اپنی تقریر میں محور رکھا۔ ان اصولوں اور طریقوں کا جاننا اور انھیں اپنانا نو مشق خطیب کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ مذکورہ طریقے تجرباتی ہیں، جن کو اپنا کر ایک نو آموز مقرر بھی فنِ تقریر میں امتیازی حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔

مقررین کو چاہیے کہ ابتدائی مشکلات کو نظر انداز کرتے ہوئے انتہائی محنت اور کوشش کرتے رہیں، تاکہ اس فن میں نمایاں مقام حاصل کریں۔ یہاں مصنف نے ڈیما نستھینز کی ابتدائی مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے

کہ اس کی آواز میں دم خم نہ تھا۔ اندازِ تقریر مناسب نہ تھا، علاوہ ازیں لکنت اس کی تقریر میں مزید بگاڑ پیدا کرتی۔ تاہم، وہ ثابت قدم رہا۔ اپنی لکنت اور سانس کی خرابی دور کرنے کے لیے منہ میں چھوٹے کنکر بھر کر تسلسل سے لمبی نظمیں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی سمندر کی موجوں سے مخاطب ہوتا، کبھی پُر سکون پہاڑیوں پر مشق کرتا، الغرض اس نے ان مشکلات پر قابو پایا۔ اس کے علاوہ، وہ اپنے کندھوں کو تھوڑے سے وقفے کے بعد بار بار اچکایا کرتا، یہ نقص بھی اس کے کام یاب مقرر بننے کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ اس کو دور کرنے کے لیے وہ ایک تنگ کٹہرے میں کھڑا ہوتا، جس میں جسمانی حرکت کی گنجائش نہ ہوتی۔ وہاں تقریر کرتا۔ بعد ازاں، اس نے چھت پر نیزوں کی طرح کے دو ہتھیار لٹکائے، جو اس نے اپنے کندھوں کے عین اوپر نصب کیے۔ اب اگر اس کے کندھے اچکتے تو زخمی ہو جاتے۔ یوں اس نے انتہائی محنت سے اپنے تمام نقائص کو دور کیا۔ یہ ایک طویل جدوجہد تھی، جس نے اسے ایک ناقابلِ تسخیر مقرر بنایا۔ اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پسندیدہ مصنفین کی کتب کو آٹھ مرتبہ اپنے ہاتھ سے نقل کیا۔ ان کی یہ مشقت، ریاضت، محنت اور ممارست ہی تھی جس کی بہ دولت وہ محض یونان کا ہی نہیں بلکہ دنیا کا ایک لاثانی مقرر ثابت ہوا۔

مصنف نے ان کے علاوہ ڈاکٹر بلیئر، مسٹر چرچل، ٹویں، شریڈن اور جے گولڈ کا حوالہ دے کر نو آموز مقررین کو محنت کے لیے ابھارنے اور نام ور مقررین کو اپنے فن کو مزید نکھارنے کی کام یاب سعی کی ہے۔ یہ حوالہ جات تشویق و تحریک کا بہترین سبب ہیں۔

مقرر کے لیے جسمانی طور پر صحت مند ہونا انتہائی ضروری ہے۔ مصنف نے یہاں ایک ماہرِ اقتصادیات کے قول کا حوالہ دیا ہے کہ

> "جو شخص دُنیا میں اعلا مقاصد کے حصول کا متمنی ہے، اسے اپنی ذات سے اچھا سلوک کرنے کا ڈھنگ سیکھنا چاہیے۔"(۲۷)

صاحبِ کتاب نے مقررین کو یہ تنبیہ کی ہے کہ وہ محض اپنی معلومات بڑھانے، تقریری صلاحیتوں کو نکھارنے اور اپنے فن کو سنوارنے ہی کی سعی میں مگن نہ ہوں، بلکہ اپنی جسمانی صحت کا بھی دھیان رکھیں، جسمانی اور دماغی نشو نما کے بہترین طریقے اپنائیں۔ اچھی خوراک کے ساتھ ساتھ جسم کو چست اور تندرست رکھنے کی بھی کوشش کریں۔ اگر مقرر جسمانی صحت کا خیال نہیں رکھتا تو اس کی ذہنی و فطری قوتیں آہستہ آہستہ دھیمی پڑ جاتی ہیں۔ عقلی و دماغی صلاحیت کی چمک دمک ماند پڑ جاتی ہے۔ شگفتگی اور زندہ دلی جاتی رہتی ہے۔ لہٰذا، مقرر اپنی صحت پر بھی باقاعدہ توجہ دے۔

## 5۔ موثر تقریر

نذیر الدین نے باب دوم کو موثر تقریر کے الفاظ سے معنون کیا ہے۔ اس باب کے دو بنیادی حصے ہیں۔ پہلا حصہ تقریر کے ان بنیادی اجزا پر مشتمل ہے، جو اسے موثر بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، جب کہ دوسرا حصہ تقریر کرنے والے (مقرر) کی ان نمایاں شخصی و کرداری خوبیوں پر مشتمل ہے، جو تقریر کو پُر تاثیر بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

### ا۔ تقریر کے بنیادی اجزا

حصہِ اولیٰ میں تقریر کے وہ تین ضروری اجزا بتائے گئے ہیں جو تقریر کو موثر و معتبر کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ "ریطوریقا" میں بھی اندازِ بیان کو موثر تقریر کا لازمہ قرار دے کر مفصل و مدلل بحث کی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب میں بھی تاثیرِ تقریر کے ضمن میں پہلا جزو "انداز، بیان" ہے۔ اندازِ بیان تقریر کو موثر بنانے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اندازِ بیاں کی بہ دولت ہی مقرر اپنے معاصرین سے نمایاں ہوتا ہے۔ اگر اس کا اندازِ بیان پُر کشش اور متاثر کن نہ ہو تو وہ فنِ خطابت کی دُنیا میں غیر نمایاں ہو جاتا ہے۔ جذبات و خیالات کا اظہار ہر شخص اپنے اپنے اسلوب میں کرتا ہے؛ یہی اسلوب اس کی پہچان بن جاتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے معروف مقررین مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، نواب بہادر یار جنگ اور عنایت اللہ خان مشرقی کے اسالیبِ بیان کا ذکر کیا ہے اور پھر ان معروف خطبا کی تقاریر کے چند نمونے اقتباسات کی صورت میں پیش کیے ہیں۔ تاکہ اندازِ بیان کی اہمیت واضح ہو سکے۔ مصنف کا یہ خیال ہے کہ "طرزِ بیان ہی وہ خصوصیت ہے جو کسی بھی موضوع، واقعے میں دل چسپی پیدا کرتی ہے۔ وہی مقررین بہت جلد امتیازی حیثیت حاصل کر لیتے ہیں، جو یا تو بالکل روایت شکن ہوتے ہیں یا جدت و قدامت کے حسین امتزاج سے اپنی تقریر کو موثر بناتے ہیں۔ یہاں مصنف نے مولانا شبلی نعمانی کا قول نقل کیا ہے۔ "اردو تقریر میں اصل مضمون کی خوبی سے زیادہ طرزِ ادا کی خوبی کا لحاظ ہونا چاہیے۔"(۲۸)

"ریطوریقا" میں موثر تقریر کا ایک بنیادی خاصہ تقریری مواد کے مختلف حصوں کا منطقی ربط ہے۔ بعینہٖ، زیرِ تجزیہ کتاب میں بھی موثر تقریر کا دوسرا بنیادی جزو "ربط و تسلسل" ہے، جو تقریر میں نکھار پیدا کرتا ہے۔ مقرر اپنی تمام تر تقریر کو ایک مدعا اور مقصد کے تحت پیش کرتا ہے۔ تقریر کے تمام حصص ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح منسلک ہوتے ہیں، جس طرح ایک زنجیر کی تمام کڑیاں ایک دوسرے میں ضم

ہوتی ہیں۔ مصنف کے مطابق تقریر بھی انسانوں کی طرح جسم اور روح کی حامل ہے۔ الفاظ جسم ہیں، جب کہ معانی روح۔ مقرر کو چاہیے کہ وہ اپنی تقریر کو اپنے موضوع کے مطابق و موافق آگے بڑھائے۔ اس ضمن میں دل نشیں الفاظ، خوب صورت تشبیہات و استعارات، نادر و اچھوتی تراکیب، منفرد اسلوبِ بیان کی وجہ سے مقرر اس کوشش میں کام یابی حاصل کر لیتا ہے کہ وہ سامعین کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مدعا کی ترویج بہ طریق احسن کر سکے۔ اگر تقریر ربط و تسلسل سے تہی ہو جائے تو سامعین کی دل چسپی بھی زائل ہو جاتی ہے۔

"ریطوریقا" میں مصنف نے مواد کی صحت، ہیت اور نوعیت کے بارے میں مفصل بتایا ہے کہ کیسا مواد ترسیلِ مدعا، تفہیمِ مقصد اور تاثیرِ گفتار میں معاونت کر سکتا ہے۔ تاہم اس کے حصول کے طریقوں پر بات نہیں کی گئی۔ برعکسِ ازیں، نذیر الدین احمد نے مذکورہ کتاب میں مواد کی صحت کی نوعیت کے ساتھ اس کے حصول کے مختلف طریقے بھی قلم بند کیے ہیں۔ یہاں موثر تقریر کے تین بنیادی اجزا کی آخری کڑی "مواد" ہے۔ مصنف نے مواد کی بابت یہ تحریر کیا ہے کہ تقریری جدوجہد میں کام یابی و کامرانی اس میکانکی اصول کے تحت حاصل کرنا آسان ہو جاتی ہے کہ مقرر محض ایک نکتے پر اپنی تمام تر صلاحیت اور قوت کو صرف کرے۔ ایک تجربہ کار اور ماہر فن کار مقرر اپنے تقریری مواد کو اس طرح مرتب کرتا ہے کہ اس کا ہر جزو اور حصہ دوسرے حصے کا جزوِ لاینفک ہوتا ہے۔ مصنف کے مطابق مقررین کے لیے اچھا یا بُرا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور بُرے مقررین ہوتے ہیں۔ ان کی اچھائی اور برائی کا دارومدار ان کے کردار، شخصیت، انتخاب، گفتار، بیان اور مواد پر ہے۔

## ۲۔ حصولِ مواد کے ذرائع

### ۲.۱۔ غور و فکر

نذیر الدین احمد نے حصولِ مواد کے جو ذرائع بیان کیے ہیں، ان میں پہلا ذریعہ اور راستہ غور و فکر ہے۔ گوشۂ عُزلت یا لمحاتِ فراغت میں مقرر کو دماغ کی سرزمین میں غور و فکر کے بیج بو کر ان کی آب یاری کرتے رہنا چاہیے تاکہ ایک لہکتا کھیت تیار ہو سکے۔ بہترین مقررین اس معاملے میں انتہائی حساس ہوتے ہیں، جب کبھی بھی اب کے دماغ میں کوئی خیال ابھرتا ہے، تو کسی نہ کسی سُرخی کے تحت اسے فوراً قلم بند کر لیتے ہیں۔ تاکہ کوئی اچھا، موثر اور منفرد نکتہ ان کی غفلت کی بہ دولت حافظے سے محو نہ ہو۔ مصنف نے غور و فکر کی افادیت کو اظہر من الشمس کیا ہے تاکہ مقررین اس وصف کو اپنانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں اور اس خوبی سے اپنے فن کو جلا بخشیں۔

### ۲.۲۔ مشاہدہ

دنیوی معاملات میں مشاہدے کی اہمیت مسلم ہے۔ بالخصوص مقرر کی قوتِ مشاہدہ انتہائی قوی ہونی چاہیے۔ اسی قوت کی بہ دولت ہی وہ سامعین کے جذبات کو اکسانے اور انھیں حقائق سے آشنائی میں کام یابی حاصل کرتے ہیں۔ مشاہدہ ایک ایسی طاقت ہے جس کی وجہ سے ایک مقرر حالاتِ حاضرہ پر اپنی گرفت مضبوط کر سکتا ہے۔ اس کے ادراک اور شعور کو تقویت ملتی ہے۔ وہ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کی تہ تک بہ آسانی پہنچ جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مقرر انتہائی سہولت سے اپنے مدعا و مقصد کو سامعین کے قلوب و اذہان میں اتارتا ہے اور اسی قوت کی بہ دولت اپنی تقریر میں زور پیدا کر کے نئے فکری در وا کرتا ہے۔

### ۲.۳۔ قوتِ متخیلہ

قوتِ متخیلہ وہ قوت ہے جو خیالات و جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر دل نشیں جملوں کی صورت میں منصہِ شہود پر لاتی ہے۔ مصنف کے مطابق جس طرح ایک کسان اچھی فصل کے حصول کے لیے زمین کو بہترین انداز میں کھودتا اور بیج بوتا ہے، تو اس کا نتیجہ ثمر آور ہوتا ہے۔ جس قدر زمین کو گہرا کھودا جاتا ہے، بیج کی پرورش اتنی ہی عمدہ ہوتی ہے۔ اسی طرح مقرر کی سوچ و فکر میں جتنی گہرائی و گیرائی ہو گی، اتنے ہی اس پر سربستہ راز منکشف ہوں گے۔ جس طرح ایک غواص سمندر میں غواصی کے ذریعے بہترین گُہر تلاشتا ہے، بعینہٖ مقرر قوتِ متخیلہ کو بروئے کار لا کر نئے نئے مضامین اور نکات تراشتا ہے۔

### ۲.۴۔ بحث و مباحثہ

نذیر الدین احمد کے مطابق بحث و تمحیص سے علم و فکر کے نئے در وا ہوتے ہیں۔ خیالات و افکار کا تبادلہ ہوتا ہے۔ مختلف پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھتی ہیں۔ نئے علمی نکات اور خیالات سامنے آتے ہیں۔ مصنف نے بحث و تمحیص کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے سنسکرت کے عالم کا ایک قول نقل کیا ہے: "جس علم کو دہرایا نہ جائے، وہ مردہ ہے۔ " اس لیے بحث مباحثہ مقررین کی فکری اور علمی استعداد کو بڑھانے کے لیے ناگزیر ہے، کیوں کہ اس سے ان کی تقاریر مزید مستحکم اور مستحسن ہوتی ہیں۔

### ۲.۵۔ کتب بینی

کتب بینی کے ذریعے ہر موضوع کے حوالے سے معلومات اکٹھی کی جا سکتی ہیں۔ مقررین کے لیے یہ مشغلہ انتہائی مفید ہے۔ مصنف کے مطابق وہ لوگ جو فنِ تقریر سے وابستہ ہیں، ان کے لیے کتب بینی وہی حیثیت رکھتی ہے، جو چراغ کے لیے تیل۔ اس فن سے متعلق لوگوں کو شعرا اور ادبا کی کتب کا مطالعہ ضرور

کرنا چاہیے۔ کچھ نو آموز مقررین یہ شکایت کرتے ہیں کہ یہ وقت کی قلت کا دور ہے، لہٰذا مطالعے کو وقت نہیں دیا جا سکتا۔ مصنف نے مختلف حوالوں سے یہ بات ثابت کی ہے کہ وقت کا استعمال ہم پر منحصر ہے۔ اگر ہم چاہیں تو مطالعے کے لیے وقت نکال کر اپنی علمی استعداد کو بڑھا سکتے ہیں۔

مصنف نے مقررین میں تشویقِ مطالعہ کے لیے مولانا سلیمان ندوی کے مضمون "علمائے سلف کا شوقِ کتب بینی" سے کچھ واقعات نقل کیے ہیں۔ یہ واقعات کتب بینی سے وابستہ سربر آوردہ شخصیات کے ہیں، جن میں اڈورڈ گبن، لیٹز، زبیر بن بکاوا، ثعلب شیبانی، صاحب بن عبادہ اور ابن رشد شامل ہیں۔ ان کا تذکرہ کر کے مصنف نے تحریکِ مطالعہ کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ وہی شخصیات مقتدر اور معتبر ہوئیں، جنھوں نے کتابوں سے اپنا رشتہ جوڑا اور علم کے رسیا بنے۔ مقررین کے لیے تسلسلِ مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ انھوں نے ہر موضوع سے متعلق تقریر کرنا ہوتی ہے۔ جب تک ان کے پاس ہر موضوع سے متعلق مواد نہیں ہو گا، اس وقت تک یہ سامعین کو متاثر کر سکتے ہیں نہ اپنے مدعا و مقصد کی ترویج کر سکتے ہیں؛ بلکہ محنت اور کوشش سے حاصل شدہ مقام بھی گنوا دیتے ہیں۔

### ۲.۶۔ اصولی مطالعہ

نذیر الدین احمد نے مقررین کو اس بات کی سختی سے تلقین کی ہے کہ انھیں کتب بینی اور کتاب کی خریداری میں احتیاط برتنی چاہیے۔ انھیں ایسے مصنفین کی کتب خریدنی چاہئیں جن سے وہ واقف ہوں۔ اس ضمن میں "بابائے اردو مولوی عبدالحق" کی یہ بات نقل کی گئی ہے کہ "کتاب اور مصنف ہر دو سے ناواقف رہتے ہوئے کتاب کا خریدنا مجنونانہ فعل ہے۔"(۲۹) اصولی مطالعہ میں مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ بغیر مقصد کے مطالعہ نہ صرف کارِ فضول ہے، بلکہ فکری یکسوئی اور شیرازہ بندی کے لیے مضر بھی ہے۔ مصنف نے یہاں چند مصنفین کی کتب کا مطالعے کو ناگزیر اور مستحسن گردانا ہے۔ ان میں مولانا محمد علی، ابوالکلام آزاد، جمال الدین افغانی اور ابوالاعلا مودودی شامل ہیں۔

مصنف نے ان علوم کی نشان دہی کی ہے جن کا جاننا مقرر کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ اس سلسلے میں سقراط کی یہ بات نقل کی گئی ہے کہ "صرف علم کی انھی شاخوں اور شعبوں کا علم حاصل کرنا چاہیے جو مقرر کے لیے بہت ضروری ہیں۔" ادبی مقررین، سیاسی مقررین اور واعظین کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ علمِ نفسیات، منطق، اپنی زبان کے ادب اور قواعد کا مطالعے کے علاوہ علوم و فنون کے موٹے موٹے اصولوں سے آگہی اور آشنائی حاصل کریں۔ علاوہ ازیں، انھیں اپنے خاص فن میں مہارتِ تامہ حاصل کرنی چاہیے۔ وہ خاص فن،

فنِ خطابت ہے۔ لارڈ چیسٹر فیلڈ کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحت بھی مصنف نے اپنی بات کی تصدیق میں پیش کی ہے کہ "اچھی تقریر کو شغل بنانا چاہتے ہو تو وسیع مطالعہ کو اپنی تفریح کا ذریعہ سمجھو۔"

محولہ بالا تمام سطور اس امر کی جانب توجہ دلا رہی ہیں کہ مطالعہ مقرر کے لیے کتنا ضروری ہے۔ مطالعے کے اصول وضوابط کو اپنا کر وہ کس طرح اپنی تقریری صلاحیت نکھار سکتا ہے۔

**-مطالعے کے دوران کن باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے**

مقرر جب کسی کتاب کا مطالعہ کرے، اس میں ایسے الفاظ جو مقرر کے لیے بالکل نئے ہیں، انھیں اپنے پاس محفوظ کر کے یاد کرے۔ اس مقصد کے لیے اسے الگ کاپی یا رجسٹر تیار کرنا چاہیے، جس میں نئے الفاظ کو محفوظ کیا جاسکے اور لمحاتِ فرصت میں انھیں حفظ کرے۔ علاوہ ازیں اپنے ذخیرہ الفاظ میں سے پسندیدہ الفاظ کے مترادفات تلاش کرے، انھیں اپنے حافظے میں محفوظ کرے۔ تاکہ کسی کیفیت کو بیان کرنے کے لیے اس کے پاس متنوع الفاظ ہوں۔ کیوں کہ کسی موضوع پر اظہار الفاظ کے بغیر ممکن نہیں۔ ذخیرہِ الفاظ اور ان کا بر موقع وبر محل استعمال قادر الکلامی کو مزید مستحسن کرتا ہے۔ دورانِ مطالعہ اگر کوئی ایسا اقتباس یا جملہ ملے، جو مقرر کو متاثر کرے تو مقرر کو اسے اپنے پاس تحریری صورت میں محفوظ کر لینا چاہیے تاکہ وہ آیندہ کسی تقریر میں استعمال کیا جاسکے۔ اس طرح شعرا کے کلام کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ اس سے مقرر کو تشبیہات، استعارات اور علامات کو بر موقع برتنے کا علم ہوتا ہے۔

## ۳۔ تقریر کو موثر بنانے کے عناصر

### ۳.۱۔ قوتِ ارادی وخود اعتمادی

"ریطوریقا" میں اوصافِ مقرر کو بڑی عرق ریزی، مہارت، گہرائی و گیرائی سے منصہِ شہود پر لایا گیا ہے۔ اسی ضمن میں مقرر کی قوتِ ارادی، خود اعتمادی اور حساس ہونے اور تقریر پر ان اوصاف کے اثرات کا مفصل تذکرہ کیا گیا ہے۔ جب کہ "رموزِ خطابت" میں موثر تقریری عناصر کے ضمن میں مقرر کے ان اوصاف کو احاطہِ تحریر میں لایا گیا ہے۔ تقریر کے بنیادی اجزا کو بحث کرنے کے بعد مصنف نے ان پہلوؤں کو مفصل قلم بند کیا ہے جو تقریر کو موثر بنانے میں معاونت کرتے ہیں۔ ان پہلوؤں میں مقرر کے شخصی و کرداری اوصاف اور تقریر کی ہیت کے کچھ خصائص شامل ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا وصف "قوتِ ارادی اور خود اعتمادی" ہے۔ مصنف نے قوتِ ارادی اور خود اعتمادی جیسی صفات کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس بات پر زور دیا ہے کہ مقرر یہ خیال ذہن سے نکال دے کہ اس کے سامعین علمی و فکری حوالے سے کامل و

اکمل ہیں، بلکہ ہمیشہ یہ خیال کرے کہ اس کے سامعین اس سے برتر اور اعلا نہیں ہیں۔ جب تک مقرر خود کو سامعین سے برتر نہیں سمجھے گا، اس وقت تک وہ کام یاب مقرر نہیں بن سکتا۔ یہ وصف صرف اور صرف خود اعتمادی کی بہ دولت ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی مختلف حوالہ جات کی مدد سے خود اعتمادی جیسے وصف کو نکھارنے کے ذرائع بتائے گئے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے معبد بن طوق عنبری، ایاس، بکسٹن اور جنرل گرانٹ جیسے نام ور مقررین کی قوتِ ارادی اور خود اعتمادی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بات باور کرانے کی کوشش ہے کہ بڑے بڑے مقررین اور خطبا کی کام یابی کا راز انھی دو صفات میں مضمر ہے۔

### ۳.۲۔ سمجھو اور محسوس کرو

مصنف نے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ خطیب جو بات کہے، وہی کیفیت خود پر بھی طاری کرے۔ جب تک مقرر اپنے موضوع کی مکمل تفہیم اور بعد ازیں اپنی حسی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اظہار نہیں کرتا، اس کی تقریر تاثیر سے تہی ہوتی ہے۔ مصنف نے لارڈ ارسکن کا ایک قول نقل کیا ہے:

> "خود ہمارا دل ہی چشمۂ بلاغت و خطابت ہے۔ بہت سے خطیب جو اس فن میں ناکام رہ جاتے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں، وہ خود محسوس نہیں کرتے۔"(۳۰)

علاوہ ازیں، عامر بن عبد القیس کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس کے مطابق "جو بات دل سے نکلتی ہے، وہ دل میں گھر کر لیتی ہے اور جو بات زبان سے نکلتی ہے، وہ کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔" مقرر کو دورانِ تقریر مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ غم کو بیان کرے تو غم کو محسوس کرتے ہوئے غم کا بیان کرے اور خود سراپا غم نظر آئے۔ اگر خوشی کو بیان کرے، تو خوشی کو اس طرح محسوس کرتے ہوئے بیان کرے کہ اس کے سراپے سے خوشی چھلکتی ہوئی دکھائی دے۔ گویا دورانِ تقریر مقرر کو اداکاری کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔

### ۳.۳۔ تمہید و اختتام:

"ریطوریقا" میں تمہید اور اختتام کو الگ الگ انتہائی تفصیل سے تمام گوشوں، حصوں، ضابطوں اور تقاضوں کو بیّن کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔ تمہید اور اختتام کی ذیل میں ان تمام طریقوں کو بھی بذریعہ امثلہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے، جو موثر تقریر کا پیش خیمہ ہو سکتے ہیں۔ "رموزِ خطابت" میں تمہید و اختتام" کو بیان کرتے ہوئے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ یہ دونوں حصص تقریر کی تاثیر پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ تمہیدی کلمات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مضمون کس نوعیت کا ہو گا۔ مصنف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ

تمہید ایسی ہو کہ سامعین بے اختیار مقرر کی جانب متوجہ ہو جائیں۔ یہ مقرر پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح اپنی تقریر کا آغاز کرتا ہے۔ چاہے تو کسی مقولے، اچھوتے اور نرالے شعر، کسی مختصر کہانی کا سہارا لے کر اپنی تقریر کا آغاز کرے۔ یہ سب کچھ مقرر کی فکری استعداد، تقریری مہارت اور تجربے کی بہ دولت ممکن ہے۔ مقرر کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ کن لوگوں کے سامنے بات کر رہا ہے۔ مجمعے میں کس عمر کے لوگ موجود ہیں۔ ان کے علمی مراتب کا دھیان رکھے اور فکری استعداد اور ان کے شایانِ شان تقریر کرنے کی کوشش کرے۔

تقریر کے خاتمے کا انحصار اس کی نوعیت پر ہے۔ سیاسی تقاریر، ادبی تقاریر، انعامی تقاریر، نشری تقاریر اور مذہبی تقاریر میں تقریر کے اختتامی مراحل میں تفاوت ہے۔ مذہبی تقاریر کا اختتام عموماً دعا پر ہوتا ہے۔ سیاسی تقاریر کے خاتمے پر مقصد کے لیے برانگیخت کیا جاتا ہے۔ انعامی تقاریر کے آخر میں دل چسپ اشعار موضوع کی مناسبت سے پیش کیے جاتے ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ تقریر کا خاتمہ کام یاب ہونا چاہیے۔ اگر اختتامی مراحل میں مقرر فنی مہارت کا ثبوت نہیں دیتا تو اس کی تقریر کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات مقررین تقریر کی ابتدا تو بہت اچھی کرتے ہیں، لیکن خاتمے تک وہ تاثر برقرار نہیں رکھ پاتے جو ابتدا اور وسط میں ہوتا ہے۔ اس معاملے میں مقرر کو محتاط ہونا چاہیے۔

### ۳.۴۔ الفاظ کی اہمیت اور ان کا استعمال

"ریطوریقا" میں اندازِ بیان کے تحت الفاظ کے درست استعمال اور ان کے اثرات کو مختلف امثلہ کے ذریعے الفاظ کے امزجہ کو بیان کرے ک یہ بتایا گیا ہے کہ مقرر کو نہ صرف الفاظ پر کامل دسترس درکار ہے، بلکہ ان کے درست اور برموقع و برمحل استعمال پر بھی مقرر کی مہارت ضروری ہے۔ اسی پر تقریر کی تاثیر کا کام یابی انحصار ہے۔ نذیر الدین احمد نے بھی الفاظ کی اہمیت اور ان کے درست استعمال کی وقعت کو تقریر کا اہم بنیادی عنصر قرار دیا ہے۔ الفاظ کی اہمیت مسلم ہے۔ جس مقرر کے پاس الفاظ کا ذخیرہ اور ان کے استعمال کا بہترین وتیرہ ہو، وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ الفاظ ہی خیالات کے اظہار کا وسیلہ ہیں۔ مصنف نے یہاں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب "اردو کے اسالیبِ بیان" کا حوالہ دیتے ہوئے معروف نقاد رسکن کا قول پیش کیا ہے: "خوب صورت اور کامل لفظ یاد رکھنا بہت ہی قابلِ قدر اور بہترین عقل مندی ہے۔" (ص ٦٦) اس لیے مقرر اپنا ذخیرہِ الفاظ بڑھائے اور ان کے برمحل استعمال کی مشق کرے۔ مصنف نے مارون کی کتاب "دی لیونگ پاسٹ" اور ڈایونی سنس کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ محض بھاری بھر کم الفاظ و

تراکیب، خوب صورت استعارات و تشبیہات، متنوع محاورات و ضرب الامثال کا ذخیرہ اور زبان سے خوبیِ تلفظ کے ساتھ ادائیگی ہی کافی نہیں ہے بلکہ الفاظ کا حسنِ ترتیب اور موقع و محل کی مناسبت سے برتے جانا انتہائی اہم بلکہ کلیدی ہے۔

الفاظ کے استعمال کے ضمن میں نذیر الدین احمد نے ڈاکٹر زور کی کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ ابن خلدون، مولانا حالی کے اقوال نقل کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ مطالب اور معنی محض الفاظ کے تابع ہیں۔ ہر آدمی کے ذہن میں الفاظ کا ذخیرہ تو موجود ہوتا ہے، لیکن ان کے سلیقۂ استعمال سے ہر ایک آشنا نہیں ہوتا۔ جو لوگ اس نکتے سے واقف ہیں کہ الفاظ و معنی کی ہم آہنگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کس طرح کرنا ہے، ان کی باتیں اور اظہارِ خیال کا تاثر تادیر قایم رہتا ہے اور وہ اپنے مقصد میں کام یاب ہوتے ہیں۔ مصنف نے مضامینِ شبلی جلد دوم کے ایک اقتباس، جو الفاظ کی اقسام سے متعلق ہے، اس کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ دراصل الفاظ مختلف اصوات اور آوازیں ہیں۔ بعض آوازیں لطیف و شیریں اور دل آویز ہوتی ہیں، مثال کے طور پر بلبل، طوطی، کوئل وغیرہ کی آوازیں۔ اور کچھ آوازیں بھدی اور ناگوار ہوتی ہیں، مثلاً گدھے اور کوے کی آوازیں۔ اسی طرح الفاظ بھی دو حصوں میں منقسم ہیں؛ کچھ الفاظ شستہ و شگفتہ، شیریں و دل نشیں اور بعض بھدے، ناگوار اور ثقیل ہوتے ہیں۔ یہاں بیان کردہ الفاظ کی پہلی قسم فصیح الفاظ کے، جب کہ دوسری قسم غیر فصیح الفاظ کے زمرے میں آتی ہے۔

حسنِ کلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ مضمون کی نوعیت کو مد نظر رکھتے ہوئے الفاظ برتے جائیں۔ لفظ آواز ہی کی ایک نوع ہے اور آواز کی مختلف اقسام ہیں، مثلاً پُر رعب، سخت، مہیب، لطیف، شیریں اور نرم الفاظ۔ بعض الفاظ وزن اور صورت کے لحاظ سے شیریں اور لطیف ہوتے ہیں، بعض سے سطوت، شان و شوکت اور جلالت ٹپکتی ہے، بعض سے حزن، رنج، ملال اور درد چھلکتا ہے اور کچھ غیض و غضب کے اظہار کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ اظہارِ جذبات و تاثرات کے لیے درست الفاظ کا استعمال ہی تقریر میں ربط و تاثر پیدا کرتا ہے۔ ارسطو کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف مقرر کو تشبیہات اور استعارات کے ذریعے اپنے مقصد اور دلائل کی وضاحت دینے کی تلقین کرتا ہے۔ تاہم، تشبیہ اور استعارے کے استعمال کی باقاعدہ مشق ضروری ہے، تاکہ غلطی اور ابہام سے بچا جا سکے، نیز ان کا بر محل استعمال ممکن ہو سکے۔ کیوں کہ ان کا بر موقع اور درست استعمال ہی بات میں وزن و تاثر اور دلیل میں استحکام و تاثیر پیدا کر سکتا ہے۔

مصنف کے مطابق ان کے علاوہ مقرر کے لیے چند معمولی مگر اہم ترین باتوں کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مقرر جب سامعین کے روبہ رو آئے تو مکمل اعتماد کے ساتھ، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سٹیج پر کھڑا ہو۔ آواز مستحکم، جسمانی حرکات میں اعتماد ہو۔ اس کی کوئی جنبش ایسی نہ ہو جس سے تقریر کا اثر زائل ہو، بلکہ وہ ایسے اعتماد اور مہارت سے اپنی تقریر شروع کرے کہ ہر انسان اس کی مہارت کا قائل ہو جائے۔ دورانِ تقریر غلط معلومات، باتوں کی تکرار، غیر ضروری حرکات سے تقریر کا اثر زائل ہوتا ہے۔ جب کہ عمدہ لطائف، دل چسپ قصص، ضرب الامثال کا بر موقع استعمال تقریر کو موثر بناتا ہے۔ مقرر کو دورانِ تقریر طے شدہ وقت کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ معروف مقررین کی تقاریر کو انتہائی غور سے سننا چاہیے۔ اس ضمن میں مصنف نے گریتھم، ہارٹے اور امرسن کا حوالہ دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مقرر کو کل وقتی طالب علم ہونا چاہیے۔ وہ جس شخص سے ملے، اس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی خامیاں دور ہو سکیں۔

### ۳.۵۔ مقرر اور کردار:

ارسطو نے مقرر کے کردار کے ان تمام پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا ہے، جو ممکنہ طور پر تقریر پر اثرانداز ہوتے ہیں، جو مقرر کی شخصیت کے لیے ناگزیر ہیں۔ جب کہ زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے بہ طور مجموع مقرر کے کرداری و شخصی اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے تقریر پر اثرات کا مجمل احاطہ کیا ہے۔ مصنف کے مطابق مقرر کے لیے باکردار ہونا انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ اس سے مقرر میں جرات اور خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو تقریر کو پر تاثیر اور اعلا بناتے ہیں۔ وہ انتہائی بے خوفی اور بے باکی سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتا ہے۔ اگر وہ کردار کا پختہ نہیں ہے تو وہ پُرعزم اور ثابت قدم نہیں رہ سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ بدکردار مقرر کو سننا پسند کیا جاتا ہے نہ اس سے متاثر ہوا جا سکتا ہے۔ مقرر کے لیے حلقۂ اثر کو وسیع کرنے کے لیے نیک نامی اور نیک چلنی ناگزیر ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے امرسن کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے اپنی بات کی سند پیش کی ہے۔

### ۳.۶۔ مقرر اور مضمون نگاری

ارسطو کے مطابق تحریر و تقریر دو مختلف شعبے ہیں۔ دونوں کے خصائص بعض اوقات ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اچھا مضمون نگار اچھا مقرر بھی ہو۔ جب کہ مذکورہ کتاب کے مطابق مضمون نگاری مقرر کی خوش گفتاری کو جلا بخشتی ہے۔ جب کوئی مقرر باقاعدہ کسی موضوع پر لکھنے کی مشق کرتا ہے تو اس کے خیال و فکر کے بند دریچے کھلنے لگتے ہیں، قرطاسِ فکر پر مضامینِ نو کے رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔

ربط و تسلسل بر قرار رکھنے کا قرینہ و سلیقہ آتا ہے۔ جب مضمون نگاری کی مسلسل مشق کی جائے، تو مقرر کے لیے فی البدیہہ تقریر کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ یہاں مصنف نے تحریری و تقریری صلاحیتوں کی ہم آہنگی کی افادیت کو واضح کرنے کے لیے لاطینی زبان کے شہرہ آفاق خطیب "کونٹیلس" کا حوالہ دیا ہے۔ "قلم فنِ خطابت کا بہترین معلم ہے۔"(۳۱)

## ۳.۷۔ تقریر مختصر ہو یا طویل

"ریطوریقا" اور مذکورہ کتاب میں تقریر کے اختصار اور طوالت کے بارے میں دونوں کا بنیادی نکتہِ نظر ایک جیسا ہے کہ موضوع اور حاضرین کی مناسبت سے تقریر کو طویل یا مختصر کرنا چاہیے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے مقاصد و خیالات کو اختصار کے ساتھ پیش کرے۔ لیکن یہ اختصار اس قدر بھی نہ ہو کہ اظہارِ مدعا تشنہ رہ جائے۔ اس ذیل میں ارسطو نے اپنے عہد کے معروف مقررین کی امثلہ سے اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے۔ بعینہٖ، یہاں بھی مصنف نے عبداللہ بن مسعود، نپولین، سلطان محمد، غازی مصطفیٰ کمال کا ذکر کر کے تقریر کے اختصار کی بہ دولت پیدا ہونے والے نکھار اور اثر کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ تقریر وہی بہتر ہے، جو مختصر اور وضح ہو۔ تاہم، محض مختصر تقریر، جو فنی خصائص سے تہی ہو، وہ پُر اثر نہیں ہو سکتی۔

## ۳.۸۔ ظرافت

"ریطوریقا" میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مقررین کی خوشی اور خواش گواریت کو ملحوظ رکھا جائے، ایسا ماحول فراہم کیا جائے، جو ان کی طبیعت و طینت کو فرحت بخشے تاکہ سامعین کی دل چسپی اور دل بستگی مدعا و مقصد کے ساتھ بر قرار رہے۔ اسی طرح مذکورہ کتاب میں بھی تقریر کی دل چسپی بر قرار رکھنے کا ایک عنصر ظرافت قرار دیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق، ظرافت وہ خوبی ہے، جو تقریر میں دل چسپی کے عنصر کو بڑھا دیتی ہے۔ یہی وہ وصف ہے، جس کی بہ دولت ماہر مقررین خشک مضامین کے بیان کے دوران میں بھی سامعین کی توجہ اور انہماک کو بر قرار رکھتے ہیں۔ طنز اور ظرافت کے پہلو میں اتنی طاقت اور قوت ہے کہ یہ قوی استدلال کے اثر کو بھی زائل کر دیتا ہے۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ طنز اور ظرافت بر موقع اور بر محل ہو۔ اس سلسلے میں مصنف نے مولانا محمد علی، معروف وکیل مسٹر پٹرسن اور مسٹر جارج کا ذکر کر کے تقریر میں ظرافت کی اہمیت کی وضاحت کی ہے۔ مقررین کو اس خوبی کے بہترین استعمال کی باقاعدہ مشق کر کے اپنے فن کو مستحکم کرنا چاہیے۔

## ۳.۹۔ حاضر جوابی

"ریطوریقا" میں حاضر جوابی وہ وصف ہے جو مقرر میں ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اس سے اس کا مدعا مزید مستحکم ہوتا ہے، نیز یہ وصف اسے نہ صرف شرمندگی سے بچاتا ہے، بلکہ اس کی شہرت کو بڑھاتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں حاضر جوابی کا وصف مقررین کی نام وری میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ دوران تقریر بعض اوقات مقررین سے ان کے موضوع کی مناسبت سے سوال کیا جاتا ہے یا مخالفین مقرر کی نیک نامی کو خراب کرنے اور اس کے حلقہ اثر کو متاثر کرنے کے لیے جان بوجھ کر ایسے سوالات اٹھاتے ہیں جن سے مقرر کی تضحیک ہو، اس صورت حال میں اگر مقرر حاضر دماغی سے طنز و مزاح کا سہارا لے کر ایسا جواب دے جو نہ صرف مخالفین کا منہ بند کر دے بلکہ سامعین کو بھی حیران و ششدر کر دے تو مقرر کو نہ صرف داد و تحسین ملتی ہے بلکہ اس کی شہرت میں بھی اصافہ ہوتا ہے۔ اس لیے مقرر کو لازماً حاضر جواب ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں مصنف نے زیڈ-اے بخاری، لائیڈ جارج کا ذکر کر کے حاضر جوابی کی اہمیت اور افادیت کو بین کی ہے، تاکہ مقررین اس صلاحیت کو نکھار کر اپنے فن میں مزید پختگی اور شائستگی پیدا کریں۔

## ۳.۱۰۔ مقرر اور لباس

"ریطوریقا" کے برعکس مذکورہ کتاب میں مقرر کی شخصیت پر اثرانداز ہونے والے ایک ظاہری وصف کو موثر تقریر کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق یہ دُنیا تصنع اور بناوٹ کا گہوارہ ہے۔ یہاں ظاہری آب و تاب، شان و شوکت، صولت و سطوت کو تو اہمیت دی جاتی ہے، لیکن فکری صلاحیت اور جوہر اس لیے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ رواجِ زمانہ کے تصنع سے تہی ہے۔ اگر کوئی شخص بہترین مقرر ہے اور اس کا ظاہری حلیہ اور لباس اقتضائے حال کے مطابق نہیں ہے تو سامعین اس کو سننا پسند نہیں کرتے ہیں، اس کی بات کو اہمیت نہیں دیتے، اس کی معمولی وضع قطع کو دیکھ کر اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب تک مقرر ظاہری حلیہ موجودہ رواج اور عوامی مزاج کے مطابق نہیں بناتا اور اپنی ظاہری شخصیت کو جاذب نظر اور پُرکشش نہیں بناتا تو سامعین میں اس کی مقبولیت ممکن نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، مصنف نے مقرر کے ظاہری حلیے کو اہم قرار دیتے ہوئے اس کے تقریر میں مدد و معاون عناصر میں دانتوں کے عمل دخل کا ذکر کیا ہے۔ کیوں کہ جب مقرر بولتا ہے تو اس کی اواز کو موثر بنانے میں ہونٹ، دانت اور زبان اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر مقرر باقاعدگی سے دانتوں کی صحت و صفائی کا خیال نہیں رکھتا تو اس سے سامعین پر اچھا تاثر نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ جب دانت گر جاتے ہیں تو ادائیگیِ الفاظ ٹھیک سے نہیں ہو پاتی۔ اس لیے مقررین کے لیے دانتوں کی

حفاظت ضروری ہے۔ یہاں نذیر الدین احمد نے زید بن جندب کا حوالہ دے کر یہ بتایا ہے کہ وہ اک اچھا خطیب تھا لیکن اس کے دانت زرد تھے، تو اس وقت کے عرب سامعین اسے ناپسند کرتے تھے، جس کی وجہ سے وہ اعلا خطیب نہیں بن سکا۔ اسی طرح، جب حضرت امیر معاویہ کے دانت گر گئے تو انھوں نے تقریر کرنا ترک کر دی۔ عرب کے معروف مقرر عبد الملک کے دانتوں میں جنبش پیدا ہو گئی تھی، تو اس نے تاروں سے اپنے دانت اس لیے بندھوائے تا کہ دورانِ تقریر کوئی خلل واقع نہ ہو۔

### ۳.۱۱۔ آواز

"ریطوریقا" میں مقرر کی مستحکم آواز اور موقع و موضوع کے مطابق مناسب صوتی اتار چڑھاؤ کو موثر تقریر اور سامعین کے تحرک کے لیے اہم عنصر قرار دیا گیا ہے۔ آواز کے ضمن میں مذکورہ کتاب کا بنیادی نکتہ بھی یہی ہے۔ آواز وہ نعمت ہے جس کے ذریعے ہمارے خیالات اور جذبات بہ آسانی دوسروں تک پہنچتے ہیں۔ اگر مقرر کے پاس محض الفاظ کا ذخیرہ ہو اور پُر شکوہ اور پُر تاثیر آواز نہ ہو تو وہ فنِ خطابت میں نمایاں مقام نہیں حاصل کر سکتا۔ مصنف نے آواز الر آف ڈربی، گلیڈ اسٹون، وبسٹر اور جان ایڈم کا تذکرہ کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ مقررین اپنی بہترین آواز کی بہ دولت نمایاں اور ممتاز تھے۔ فنِ خطابت کی دُنیا میں امر ہو گئے۔ دورانِ تقریر آواز کے زیر و بم سے تقریر کے حسن اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے۔ موقع و محل کی مناسبت سے ماہر مقرر کبھی اپنی آواز پست کرتا ہے، کبھی بلند اور کبھی انتہائی جوشیلا انداز اختیار کرتا ہے۔ اگر کوئی مقرر بالکل پست اور منحنی آواز میں تقریر کرتا ہے اور صوتی اتار چڑھاؤ کا خیال نہیں رکھتا تو بجائے تاثر کے تمسخر پیدا ہوتا ہے۔ مقرر کو گلے کی صحت کا خیال رکھنا چاہیے۔ ایسی خوراک کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے جو اس کے حلق میں سوزش اور خرابی پیدا کرے۔ یہ احتیاط مقرر کی آواز کو مزید مستحکم کرنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔

مقرر کی آواز کا محض مستحکم ہونا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ آواز کا فن کارانہ استعمال اس کی تقریر درجہِ کمال تک پہنچا دیتا ہے۔ مصنف نے مقررین کو یہ تنبیہ کی ہے کہ وہ آواز کے استعمال کو باقاعدہ سیکھیں تا کہ اپنی تقاریر کو موثر و معتبر بنا سکیں۔

### ۳.۱۲۔ ایکشن کی اہمیت

"ریطوریقا" میں مقرر کے اشارات اور جسمانی حرکات کو زیرِ بحث نہیں لایا گیا، اس کے برعکس نذیر الدین احمد نے موقع محل کی مناسبت سے تقریر میں اشارات کی اہمیت کو عیاں کیا ہے۔ جب مقرر اپنے مافی الضمیر کا اظہار شروع کرتا ہے تو وہ فطری طور پر کچھ اشارات اور حرکات کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ یہ اشارات

و حرکات مقرر کی تقریر کو نہ صرف مکمل کرتے ہیں بلکہ موثر بھی بناتے ہیں۔ مقرر محض مقرر ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جزوقتی اداکار بھی ہوتا ہے۔ مصنف نے ابو شمر، ٹیرئین اور امیر معاویہ کے زمانے کے ایک خطیب کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ کس طرح تقریر کو زیادہ موثر بنایا جا سکتا ہے۔ یہاں اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ مقررین کوئی ایسا اشارہ یا حرکت نہ کریں جو غیر فطری محسوس ہو۔ علاوہ ازیں، وہ جس کیفیت کو بیان کر رہا ہے وہی کیفیت اس کے چہرے کے خدوخال سے بھی عیاں ہو۔ گویا، دوران، تقریر محض مقرر کی زبان، دانت اور ہونٹوں کی جنبش ہی کافی نہیں ہے بلکہ یوں محسوس ہو کہ اس کی روح اور جسم بھی سراپا تقریر ہے۔ یعنی، تقریر کے مطابق مقرر کے فطری اشارات اور جسمانی حرکات مدعا کو پُر تاثیر بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔

## ۳.۱۳۔ نفسیات

"ریطوریقا" میں سامعین کے جذبات اور نفسیات کی بابت پورا ایک حصہ صرف کیا گیا ہے۔ تاکہ مقررین پر سامعین کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیات کی آگہی بیّن ہو سکے۔ کتاب ہذا میں بھی مقررین کے لیے سامعین کی نفسیات سے آشنائی کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ مقرر کے لیے انسانی فطرت اور نفسیات کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ اسے اپنے سامعین کے مزاج سے مکمل طور پر آشنا ہونا چاہیے، کیوں کہ اگر مقرر سامعین کی نفسیات کے برعکس تقریر کرے گا، تو سامعین اسے پسند کریں گے نہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا۔ کسی مجمعے میں جانے سے قبل اس مجمعے کی نفسیات کا جاننا مقرر کے لیے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ فصل کی زرخیزی کے لیے آب یاری اہم ہے۔

بعض نو آموز مقررین یہ غلطی کرتے ہیں کہ سامعین کے درمیان پہنچتے ہی اپنی ستائش شروع کر دیتے ہیں جو غلط ہے اس سے سامعین پر اچھا تاثر نہیں پڑتا بلکہ یہ عمل نہ صرف مقرر کی کم ظرفی کا ثبوت ہے بلکہ اس کے استہزا کا باعث بنتا ہے۔ مقرر اگر کسی مخالف مجمعے میں تقریر کر رہا ہے تو اس کو ایسی آوازوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جو مقرر کو مقہور کرتی ہیں اس صورت حال میں مقرر کو دلائل و براہین کا استعمال کرتے ہوئے انتہائی حاضر دماغی اور خوش اسلوبی سے جواب دے۔ اس دوران میں اگر غصہ آ بھی جائے تب بھی مطمئن نظر آنے کی بھرپور کوشش کرے اس سے سامعین پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں مجمعے کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی تعریف بھی کرے۔ کیوں کہ یہ فطری بات ہے کہ ہر شخص اپنے تعریفی کلمات سننا پسند کرتا ہے۔ بالفرض اگر مجمعے میں سے کوئی شخص ایسی حرکت کرے جو مقرر کے شایانِ شان نہ ہو تب بھی مقرر اپنی خفگی اور خشمگیں ہونا چہرے سے ظاہر نہ کرے۔ اس ضمن میں مصنف نے مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب

"فلسفہِ جذبات" کا حوالہ دے کر نفسیات اور چہرے کے تاثرات کی اہمیت کو واضح کر کے مقررین کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ غیر مناسب صورت حال میں بھی اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون ہو۔ محولہ بالا بیان کردہ اوصاف اور احتیاطی نکات پر عمل پیرا ہو کر مقرر اپنے فن میں امر ہو سکتا ہے۔

## تقاریر کی اقسام

ارسطو نے فنِ خطابت میں تقریر کو بنیادی طور پر تین اقسام "سیاسی، عدالتی اور عوامی تقاریر" میں منقسم کیا ہے۔ جب کہ اس کتاب کے مصنف نے تقاریر کو بنیادی طور پر دو اقسام میں منقسم کیا ہے: سیاسی تقاریر، غیر سیاسی تقاریر۔ بعد ازیں ان تقاریر کو متعدد ذیلی اقسام میں منقسم کیا ہے۔

### ا۔ سیاسی تقاریر

سیاسی تقاریر کو مصنف آٹھ ذیلی اقسام میں منقسم کرتا ہے۔ سب سے پہلی قسم "انتخابی تقریریں" ہے۔ انتخابی تقاریر کا مقصد اپنی جماعت کا حلقہِ اثر وسیع کرنا، مخالفین کے خلاف پراپیگنڈہ کرنا اور ان کے معتقدین کے اذہان میں انتشار پیدا کرنا ہے۔ اس قسم کی تقاریر عام فہم، مختصر اور پُر مزاح ہوتی ہیں۔ دوسری قسم "سیاسی رہ نما کا یومِ پیدائش یا تاریخی دن" ہے۔ سیاسی رہ نماؤں کے کارناموں کو دُہرا کو نئی نسل کو ان کی شخصی خوبیوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ مصنف نے "جلسہِ عام" کا عنوان قایم کر کے اس کو مزید تین اقسام میں منقسم کیا ہے، "سیاسی جلسہِ عام، ادبی جلسہِ عام اور مذہبی جلسہِ عام"۔ جلسہِ عام میں تقریری نوعیت کی ذیل میں مصنف نے دو ذیلی اقسام کا تذکرہ کیا ہے، ایک "خطبہِ استقبالیہ" اور دوسری "خطبہِ صدارت"۔ خطبہِ استقبالیہ کسی بھی جلسہِ عام کی افتتاحی تقریر ہے، جس میں مقرر جلسے کا مقصد، حاضرینِ مجلس کے جذبات کی تعریف و تحسین، صدرِ مجلس کا تعارف اور دیگر مقررین اور مہمانوں کا تعارف پیش کرتا ہے اور ان کی آمد کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ دوسری قسم "خطبہِ صدارت" ہے، جس کا مقصد جلسے میں آنے والے عوام و خواص کو خوش آمدید کہنا، ان کی آمد پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے تحسینی کلمات پیش کرنا اور تشویق و تحریک کے فروغ کے لیے مقصد کو دُہرانا ہے۔

سیاسی تقاریر کی چوتھی قسم "رپورٹ" ہے۔ یہ ایسی کارروائی ہے جو آیندہ بہتری لانے کے لیے ناگزیر ہے۔ رپورٹ کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، جیسے سالانہ، شش ماہی، سہ ماہی، ماہانہ، پندرہ روزہ اور ہفت روزہ۔ معتمدین جلسوں کی رپورٹ تیار کرتے ہیں اور آیندہ جلسوں میں اسے پیش کیا جاتا ہے۔ اس رپورٹ میں پانچ

باتوں کو بین انداز میں پیش کیا جاتا ہے، صدارت، جلسے کی تاریخ، وقت، مقامِ جلسہ اور نوعیتِ جلسہ۔ سیاسی تقاریر کے ضمن میں پانچویں قسم "تحریکات" ہے۔ کوئی متعین شخص اپنا خیال یا عوامی خیال کے موافق کوئی تحریک تحریری صورت میں پیش کرتا ہے اور عوام کو مطمئن کر کے اس تحریک کی بابت تائید حاصل کرتا ہے۔ ہر قسم کے جلسوں کے اختتام پر حاضرینِ محفل، منتظمینِ محفل، صدرِ محفل، مہمانانِ گرامی اور دیگر مقررین کا شکریہ ادا کیا جاتا یہ شکریہ خلوص اور عجز سے سرشار ہوتا ہے۔

## ۲۔ غیر سیاسی تقاریر

تقریر کی دوسری قسم "غیر سیاسی تقاریر" کے زمرے میں مصنف نے مزید چار اقسام شامل کی ہیں، جن میں "مذہبی، ادبی، اصلاحی اور سماجی تقاریر" شامل ہیں۔ مذہبی تقاریر کو مصنف نے تین حصوں میں منقسم کیا ہے، تقریر، واعظ اور ذکر۔ مذہبی اجلاس اس لیے منعقد کیے جاتے ہیں کہ مذہبی اقدار کو فروغ ملے۔ مذہبی احکام اور مسائل کے بارے میں لوگوں کو آشنائی اور رہ نمائی حاصل ہو۔ مذہبی تہواروں پر مذہبی رہ نما واعظ اور ذکر کا اہتمام کرتے ہیں۔ مذہبی تقاریر عام تقاریر سے مختلف ہوتی ہیں۔ اندازِ بیان ایسا اپنایا جاتا ہے جو تاثر اور تحرک سے معمور ہو؛ شائستگی و دل بستگی سے بھرپور ہو۔

ادب سے تعلق رکھنے والی تقاریر ادبی تقاریر کہلاتی ہیں۔ مصنف نے ان تقاریر کو بہ اعتبار مقصد مختلف حصوں میں منقسم کیا ہے۔ جن میں تقریر، توسیعِ تقریر اور مباحثہ وغیرہ شامل ہے۔ مختلف ادبی انجمنیں عنوانات متعین کرتی ہیں، جن کی بابت ادبا و نقاد اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ادبی تقاریر میں ایک قسم مباحثہ ہے۔ تربیت کی غرض سے منعقدہ مباحثے، تربیتی مباحثے کہلاتے ہیں۔ مباحثوں میں حاضر جوابی کو بڑا عمل دخل ہے۔ مقرر کو دورانِ مباحثہ محتاط رہ کر مخالفین کے دلائل کا خوش اسلوبی سے جواب دینا چاہیے۔ انعامی مباحث اور عام مباحث میں فرق یہ ہے کہ عام مباحث کی نسبت انعامی مباحث میں وقت کا باقاعدہ تعین کیا جاتا ہے۔ متعین وقت کے مطابق ہی موضوع سے متعلق دلائل پیش کرنا ہوتے ہیں۔ مقرر کو چاہیے کہ وہ ہر قسم کے مباحث میں مخالف کے قابلِ گرفت دلائل کے نکات ایک کاغذ پر یا حافظے میں محفوظ کر لے اور ترتیب وار ان دلائل کا جواب دے۔ غیر سیاسی تقاریر کی ایک اہم قسم "سماجی تقاریر" کی چار ذیلی اقسام ہیں۔ ضیافتی، سپاس نامے، الوداعی اور تعزیتی تقاریر۔ عشائیے، ظہرانے اور عصرانے کی دعوتوں میں کی جانے والی تقاریر ضیافتی تقاریر کہاتی ہیں۔ ان تقاریر میں اختصار، موقع شناسی، بزلہ سنجی اور رنگیں بیانی مطمحِ نظر ہوتی ہے۔ سپاس نامہ وہ تقریر ہے، جس میں محسنوں کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ انتہائی مختصر، معتبر الفاظ، تراکیب

اور جملوں کا حامل ہوتا ہے۔ الوادعی تقاریر میں رخصت ہونے والوں کو خلوص و محبت کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اور ان کی جدائی پر اظہارِ غم کیا جاتا ہے اور آخر میں دعاؤں سے نوازا جاتا ہے۔ تعزیتی تقریر سے مراد وہ تقریر ہے جو کسی مرنے والے شخص کی وفات پر کی جاتی ہے۔ مصنف نے اس قسم کی تقریر کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے، "تمہید، اعترافِ خدمات، اظہارِ تعزیت، پسماندگان کو تسلی اور دعا"۔

مصنف کے مطابق غیر سیاسی تقاریر کی ایک قسم "نشری تقاریر" ہے۔ ریڈیو پر کی جانے والی تقاریر نشری تقاریر کہلاتی ہیں۔ مصنف کے مطابق نشری تقریر میں آواز، طرزِ بیان، تلفظ اور رفتار قابلِ غور ہے۔ موضوع کی کیفیت کے مطابق آواز کا زیر و بم نشری تقریر کو موثر بناتا ہے۔ نشری تقریر میں آواز اس لیے بھی اہم ہے، کیوں کہ اس میں مقرر کی ظاہری شخصیت دکھائی نہیں دیتی، بلکہ آواز اور صرف آواز ہوتی ہے۔ نشری تقریر کے خصائص میں زبان کی شائستگی اور شستگی، سہل اور عام فہم الفاظ کا استعمال شامل ہے۔ عوام کی توجہ حاصل کرنے اور ان کی بے زاری سے بچنے کے لیے تقریر ظرافت کے عنصر سے تہی نہیں ہونی چاہیے۔

## د۔ "فنِ خطابت" (از سید کلبِ مصطفیٰ)- تجزیہ

سید کلب مصطفیٰ کی کتاب "فنِ خطابت" اردو تقریر پر لکھی گئی ابتدائی کتب میں سے ایک ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں یورپی اور یونانی مصنفین کی کتب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کتاب میں مصنف کے نظریات و خیالات میں فنِ خطابت پر تحریر کردہ اول کتاب "ریطوریقا" (ارسطو) کی واضح جھلک منعکس ہوتی ہے۔ ابتدا میں خطابت کی تعریف، اس کا دیگر علوم سے تعلق، خطابت کے بنیادی اصول، مشق کی اہمیت، خطابت کی روایت، اقسام، اقسام کے تین حصے، بہ اعتبار نوع، بہ اعتبار موضوع اور بہ اعتبار مقصود، دورانِ تقریر تسلسل و روانی بر قرار رکھنے کے ذرائع، تقریر تیار کرنے کے وسیلے، حافظے کی اہمیت، مقرر کی حرکات و سکنات، آواز کا تناسب، قرات کی ضرورت، اسلوبِ بیان اور محاسنِ کلام، حصصِ تقریر، کامیاب خطابت کے اہم اصول، عورت اور خطابت، مصنف اور مقرر میں فرق، ضمیمہ جات کی شکل میں جلسوں کے آئین و آداب اور اشعار کا استعمال در تقریر جب کہ آخر میں اشاریہ مرتب کیا گیا ہے۔

### 1۔ خطابت کا تعارف

اس کتاب کی ابتدا میں ارسطو کی تحریر کردہ کتاب "ریطوریقا" کی تلخیص جو علامہ ابن رشد نے "تلخیص الخطابۃ" کے عنوان سے کی ہے، اس کا حوالہ دیتے ہوئے خطابت کا تعارف دیا۔ بعد ازیں، اس کے دو وسیلے،

حقایقی اور ابلاغی، بیان کیے۔ حقایقی وسائل سے مراد ان حقایق کو طشت از بام کرنا ہے جو مخاطب کو انگیزنے اور ابھارنے میں اہم کردار ادا کریں، جب کہ ابلاغی وسائل ایسا اسلوبِ بیان ہے جو مناسب اور پُر کشش ہو۔ اس کے بعد مصنف نے ریطوریقا میں ارسطو کے بیان کردہ ترغیب کے تین، "اخلاقی، جذباتی اور منطقی" اصولوں کا حوالہ دیا ہے۔ ان میں سے "منطقی" اصولِ ترغیب کو سب سے اہم قرار دیا ہے۔ مختلف سطحوں پر خطابت کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کے ذریعے مقرر کو ایسی عزت و شہرت حاصل ہوتی ہے، جو اسے دوام بخشتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے یہ بھی کہا ہے کہ حکومت کی مضبوطی و استحکام بھی خطابت کا محتاج ہے۔ اپنی بات کے استناد کے لیے یہاں اینٹنی (Antony) کی مثال دی۔ علاوہ ازیں، حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد آپ کی ہم شیر حضرت زینب کی بے مثل خطابت کا تذکرہ کیا ہے، جس نے جابرِ وقت یزید کے تختِ حکومت کی چولیں ہلا دی تھیں۔ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سیاسی خلفشار اور انقلاب کے زمانے میں خطابت ہی ہے جو بڑے بڑے طوفانوں کو حالتِ سکون میں بھی بدل سکتی ہے اور سکون و اطمینان کے زمانے میں تہلکہ و طوفان برپا کر سکتی ہے۔ علاوہ ازیں مذہبی خطابت کی سحر کاری اور جادو بیانی کا تذکرہ کر کے یہ بتایا گیا ہے کہ باکمال خطابت چند لمحوں میں وہ انسانی عقائد بھی بدل دیتی ہے جن پر وہ محبت، شدت اور صلابت سے قایم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شاہِ حبش کے دربار میں کی جانے والی تقریر پُر تاثیر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس امر کی جانب توجہ دلائی گئی کہ مذہب کی بقا اور استحکام بھی خطابت کا مرہونِ منت ہے۔

محولہ بالا نکات کے بعد کلبِ مصطفٰے نے خطابت کا دیگر علوم کے ساتھ تعلق واضح کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ خطابت ایک ایسا فن ہے، جس کا دائرہ کار تقریباً ہر علم اور فن کو محیط ہے۔ انسانی زندگی کے ہر لمحے اور پہلو کو یہ اپنے دامنِ بے کراں میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان علوم و فنون میں سے چند ایک کا ذکر کر کے یہ باور کروایا گیا ہے کہ ان کا سیکھنا خطیب یا مقرر کے لیے ضروری ہے۔ ان میں سے اول الذکر "گفت گو اور خطابت" ہے۔ گفت گو کے بل پر ہی انسان اپنے باطن کا اظہار کرتا ہے۔ اسی کی بہ دولت سماجی تعلق استوار ہوتا ہے۔ وہی مقرر کامیابی کی منازل آسانی سے طے کرتا ہے، جسے گفت گو کے فن پر مہارت حاصل ہو۔

## 2۔ خطابت اور دیگر علوم

"ریطوریقا" میں اس امر کی نشان دہی کی گئی ہے کہ خطابت ہر شعبہ ہائے زندگی پر محیط ہے۔ ارسطو نے منطق، نفسیات اور ادب کے خطابت سے تعلق کو اجمالی طور پر بیان کیا گیا ہے۔ سید کلب مصطفٰے نے نفسیات، ادب، منطق اور صحافت سے خطابت کے تعلق کو بیان کرتے ہوئے قدرے تفصیلی پیرایہ اختیار کیا ہے۔

منطق اور خطابت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ منطق کا مقصد انسان کو فکری غلطی سے بچانا اور صحیح تفکر پر ابھارنا ہے اور خطابت بھی اسی سے متعلق ہے۔ خطابت میں اپنے مقصد کی بات سامعین کی مکمل توجہ اپنی جانب مرکوز کر کے سنائی اور منوائی جاتی ہے۔ ایسے تمام فنون جن میں نطق، لسان اور بیان کی ضرورت پڑتی ہے، ان میں پانچ اجزا مشترک ہیں۔ ان میں اولیت دلیل کو حاصل ہے، دوسرا پہلو جدل جو دلائل کو مستحکم کرتی ہے، تیسرا نکتہ سفسطہ جو اغلاط کی نشان دہی کر کے ان سے بچنے کی تدبیر کرتا ہے۔ چوتھا جزو خطاب ہے، جس کی بہ دولت اپنی بات دوسروں سے منوائی جاتی ہے۔ پانچواں نکتہ شعر ہے، جو براہ راست دل و دماغ پر اثرانداز ہوتا ہے۔ انھی پانچ اجزا کو بروئے کار لا کر مقرر سامعین کو مسحور کرتا ہے اور اس کا فن ہر ایک سننے والے کو اس کی بات منوانے پر مجبور کرتا ہے۔

انسان کی ذہنی کیفیت، حالت اور جذبات کے دائرہ کار کو جانچنے کا علم نفسیات ہے۔ احساس، شعور، مختلف حالات میں مختلف جذبات کا ظہور اس علم کی بہ دولت مترشح ہوتا ہے۔ خطابت کا مقصد دیگر انسانوں کو متاثر اور متحرک کرنا ہے، اس لیے مقرر کو انسانی نفسیات اور ذہنی کیفیات کی آگہی ہونا ضروری ہے۔ محض منطقی دلائل کا استعمال اور نفسیاتی نکات، توجیہات و ترجیحات سے اغماض برتنا، کام یابی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اسی مقرر کا دامن ناکامی سے تہی رہتا ہے جو عوام کے جذبات و احساسات کا نباض ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہی ادراک مقرر کو بے باک اور عوامی جذبات ابھارنے میں تاک بناتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے جولیس سیزر اور انٹونی کی مثال سے نفسیات اور خطابت کا تعلق واضح کیا ہے۔ علم الاجتماع کے اصول یہ بتاتے ہیں کہ ایک مجمعے میں کس طرح محبت، خوشی، حصولِ مقصد، بزدلی، مایوسی، غیض و غضب اور ہمدردی کے جذبات بہ ذریعہ خطابت انگیز نے اور عوام کے دلوں میں اتارنے ہیں۔

ادب خطابت کی روح ہے۔ اگرچہ ادیب کے لیے خطیب ہونا ناگزیر نہیں، تاہم خطیب کے لیے ادب پر دسترس انتہائی ضروری ہے۔ کیوں کہ خطابت کو مرصع و مزین کرنے والے اجزا فصاحت و بلاغت ہیں، جو خالصتاً ادب سے منسلک ہیں۔ لہٰذا، ادب پر دسترس مقرر کو نکتہ داں اور افصح اللساں بناتی ہے۔

صحافت و خطابت ایک دوسرے سے اس لیے منسلک ہیں کہ صحافت کی بہ دولت ایک خطیب کو حالاتِ حاضرہ سے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں، جن کی مدد سے وہ اقتضائے حال کے مطابق اپنے دلائل کی منطق ترتیب دیتا ہے اور سامعین پر اپنے مدعا کی صداقت واضح کرتے ہوئے ان کی حمایت حاصل کر لیتا ہے۔ دوسری جانب قرطاسِ صحافت بھی مقررین کی تقاریر و بیانات سے مزین ہوتا ہے۔ خطابت و صحافت اس

لیے بھی لازم وملزوم ہیں کہ ایک اچھا صحافی جب تک خطابت کی شُدبُد سے متعارف نہیں ہو گا، تب تک اس کی صحافت موثر نہیں ہو سکتی۔ البتہ خطیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے عہد کے تمار سائل و اخبارات اور دیگر صحافتی ذرائع سے آگاہ ہو۔

## 3۔ کام یاب خطابت کے مبادی

"ریطوریقا" میں کام یاب اور موثر خطابت کے مبادیات کو نوعیت اور اصول و ضوابط کے ضمن میں مثالوں کے ساتھ مفصل بیان کیا گیا ہے۔ "فنِ خطابت" میں بھی کام یاب خطابت کے مبادی مکمل وضاحت سے بذریعہ امثلہ بیان کیے گئے ہیں۔ تاہم سید کلب مصطفٰے نے اقتضائے زمانہ کو بروئے کار لاتے ہوئے اس میں بعض نکات کا اضافہ بھی کیا ہے، جو "ریطوریقا" میں بیان کردہ مبادیاتِ خطابت سے مختلف ہے۔ مصنف نے کام یاب خطابت کے بتیس مبادی اصول بیان کیے ہیں۔ جو ایک خطیب کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ کیوں کہ خطابت ایک فن ہے، جو مختلف محاسن کا مجموعہ ہے۔ کام یاب خطابت کا پہلا بنیادی اصول انفرادیت ہے۔ انفرادیت کا تعلق مقرر کی ذات، اس کی تقریر کے ابتدائی نکات اور آخری کلمات تک خلوص کا رچاؤ، تصنع اور تکلف سے مبرا ہونے، اسلوب و مواد دیگر مقررین کی روش سے ہٹ کر ہونے سے ہے۔ دوسرا اصول "اطمینانِ قلب اور بلندیِ نفس" ہے۔ جب تک مقرر مطمئن اور خود اعتماد نہیں ہو گا، تو شرم و حجاب کی وجہ سے اپنے مدعا کو ٹھیک سے ادا کرنا تو درکنار، سامعین کے سامنے کھڑا ہونا بھی محال ہو جائے گا۔ لہٰذا، اطمینانِ قلب ناگزیر ہے۔ تیسرا بنیادی اصولِ خطابت "خلوص اور سچے جذبات" ہے۔ خلوص وہ طاقت ہے جو ناممکن کو ممکن اور ممکن کو ناممکن بنا سکتا ہے۔ مقرر کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ اخلاص کی دولت سے مالا مال ہو۔ ایک خطیب اسی وقت دوسروں کو کسی عمل کے لیے آمادہ کر سکتا ہے جب وہ خود خلوص و صداقت سے معمور ہو۔ چوتھا اصول "اخلاق اور نیکی" ہے۔ "اخلاق اور نیکی" کا حامل شخص دوسروں کو بہت جلد اخلاقیات اور حسنات کی جانب مائل کر سکتا ہے۔ اس کے باطن کی تطہیر اس کے الفاظ کو تاثیر سے معمور کرتی ہے۔ تقریر سے سامعین بھی اسی وقت متاثر ہوں گے جب مقرر خود اپنی تقریر سے متاثر ہو گا۔ پانچواں مبادی "عجز و انکسار" ہے۔ کوئی بہترین مقرر منکسر المزاجی اور عاجزی سے تہی نہیں ہو سکتا۔ یہ خوبی اس کی شخصیت کو نکھارتی ہے۔ عاجزی اور انکساری سے یہ مراد نہیں کہ وہ مجمعے کے سامنے آنے سے ہچکچاہٹ، خوف اور ڈر محسوس کرے، بلکہ وہ ایک خادم کی حیثیت میں خود کو سامعین کے سامنے متعارف کروائے۔ چھٹا اصولِ مبادی "خود اعتمادی" ہے۔ اس کے بغیر سامعین کے سامنے تقریر نہیں کی جا سکتی۔ ایک کم زور دل اور مبہوت شخص کبھی بھی اپنے

خیالات اور مافی الضمیر کا اظہار بہترین طریقے سے نہیں کر سکتا۔ خطابت کو ایسے عناں گیر کی ضرورت ہے جو پُر اعتماد اور دل شاد ہو۔ ساتواں اصولِ خطابت "زبان کی غلطی" ہے۔ مقرر کے لیے زبان و بیان اور تلفظِ الفاظ پر دسترس ہونا انتہائی ضروری ہے کیوں کہ اس نے ایک کثیر تعداد سے مخاطب ہونا ہوتا ہے۔ تلفظ کے معاملے میں مقرر کو انتہائی حزم و احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ آٹھواں اصول "فہمِ عامہ" ہے۔ مصنف کے مطابق مقرر کو ایسا طرزِ بیان اپنانا چاہیے جو ہر ایک شخص کے لیے قابلِ فہم ہو۔ ادق الفاظ، بعید از فہم تشبیہات و استعارات اور تراکیب استعمال نہیں کرنی چاہیے۔ نواں اصولِ خطابت "معلوماتِ عامہ" ہے۔ مقرر کے لیے ہر شعبے کے بارے میں معلومات کا ہونا ضروری ہے۔ معلومات میں اضافہ، مطالعے اور مشاہدے کا محتاج ہے۔ مصنف نے اس سلسلے میں لارڈ چسٹر فیلڈ کی مثال دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اسے علمِ ہیت کی فنی معلومات تو نہ تھیں، لیکن جب پارلیمنٹ میں نظامِ شمسی کے حق میں تقریر شروع کی تو اپنی معلوماتِ عامہ کی بہ دولت کام یابی و کامرانی حاصل ہوئی۔ دسواں اصول "ایجاز و اختصار" ہے۔ یہ خطابت کا حسن ہے۔ مقرر کوئی ایسی بات نہ کرے جو اس کے موضوع کے حوالے سے بے کار ہو۔ اس کی تقریر نہ اس قدر طویل ہو کہ سامعین کا دل اچاٹ ہو جائے اور نہ اس قدر مختصر کہ موضوع کی تشنگی باقی رہ جائے۔ خطابت بنیادی اصولوں میں اہم ترین اصول "زود فہمی" ہے۔ ایک شدید الحس اور شدید الذہن شخص اپنے ذہن کی تیزی، طرازی اور خوش گفتاری کی بہ دولت مشکل، پیچیدہ، ادق اور خشک مضامین بھی اس قدر مہارت و دل چسپی اور آسانی سے پیش کرتا ہے کہ ایک عام شخص کا ذہن بھی مضمون کے مدعا و مقصد کو قبول کر لیتا ہے۔ "فوری اظہار اور حاضر جوابی" اصولِ خطابت کا اہم پہلو ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو مقررین کی شہرت کو چار چاند لگا کر انھیں امر کر دیتی ہے۔ دورانِ تقریر بعض اوقات ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ مخالفین و معاندین تقریر کے اثر کو زائل کرنے کے لیے کوئی سوال یا اعتراض داغ دیتے ہیں، یہ مرحلہ مقرر کی ذہانت اور لیاقت کا امتحان ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں اگر مقرر کوئی ایسا الزامی جواب دیتا ہے، جس سے مخالف نہ صرف انگشت بدنداں اور بے بس ہو جاتا ہے بلکہ سامعین بھی عش عش کر اٹھتے ہیں۔ مقرر میں یہ مہارت مشقِ متواترہ سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ مصنف نے لائیڈ جارج کی تقریر کی مثال دیتے ہوئے بتایا ہے کہ الیکشن کی مہم کے دوران میں وہ تقریر کر رہا تھا تو اچانک خوش بیانی کے حوالے سے مشہور خاتون نے سامعین کو اپنی جانب متوجہ کر لیا اور موصوف کی مخالفت شروع کر دی۔ اس وجہ سے لائیڈ جارج مایوس ہو گیا۔ اچانک اس خاتون نے ایک جملہ بولا کہ "میں اگر تمھاری بیوی ہوتی تو تمھیں زہر دے کر مار دیتی۔" جارج یہ سن کر مسکرایا اور جواب دیا کہ "اگر میں تمھارا شوہر ہوتا تو اس

زہر کو خوشی سے پی کر جان دے دیتا۔" لائیڈ جارج کی اس حاضر جوابی نے اس خاتون کو مبہوت کر دیا اور وہ انتخابات میں کام یاب ہو گیا۔ اس لیے مقرر کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے اندر حاضر جوابی کی مہارت پیدا کرے۔ "مزاج کی شگفتگی" اصولِ خطابت کا تیرہواں عنصر ہے۔ فنِ خطابت مردم بے زار اور آدم آزار شخص کا متمنی نہیں ہے۔ وہی مقرر فتح یاب ہوتا ہے، جس کے مزاج میں شگفتگی اور شائستگی رچی بسی ہوتی ہے۔ "قوتِ متخیلہ اور تخلیقی قوت" مقرر کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ وہ قوتیں ہیں، جو قرطاسِ ذہن و فکر پر نئے، اچھوتے، انوکھے اور نرالے مضامین کا رنگ بکھیرتی ہے۔ مقرر اسی قوت کے بل پر عمومی روش سے ہٹ کر نئی فکر اور سوچ سے عوام کے قلوب و اذہان کو متاثر کرتا ہے۔ مقرر کو افکارِ نو کے اظہار میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ عوام کے لیے مفید ہے یا مضر۔ اگر نئی راہیں، خیالات اور افکار قوم و ملت کی فکری و ذہنی آب یاری میں مدد و معاون ہوں تو ان کا اظہار سلیقے سے کر دینا چاہیے، تاہم مسلسل غور و فکر اور تدبر ہی فکر و تخیل کہ نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔ "اظہارِ جذبات" اصولِ خطابت کا ایک اور نمایاں پہلو ہے۔ مقرر جس بات یا کیفیت کو بیان کر رہا ہو، وہ بات اس کے چہرے سے بھی عیاں ہو۔ غصیلے جذبات کے اظہار کے وقت اس کا چہرہ غیض و غضب کی تصویر نظر آئے۔ خوف کے وقت اس کی آنکھیں ڈر اور اندیشے کا سندیسا ہوں۔ بیانِ خوشی کے وقت اس کا چہرہ فرحت و انبساط سے تہی نہ ہو۔ رنج اور الم کے اظہار کے دوران میں اس کا چہرہ ملول نظر آئے۔ اظہارِ محبت کے وقت مقرر کی اداؤں اور نگاہوں سے محبت و مودت چھلکتی نظر آئے۔ یہ سب خوبیاں مقرر کو اپنانی چاہئیں۔ یہ خصائص اس کی شد و مد میں اضافے باعث ہے۔ "مقرر کی اثر پذیری" سے مراد یہ ہے کہ سامعین نفسیاتی طور پر مقرر کی تقریر کے بجائے اس کے تاثرات سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ وہ جو کیفیت بیان کرے، اس کیفیت کا اظہار مقرر کے سراپے، بالخصوص چہرے سے، واضح ہونا چاہیے۔

خطابت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک "پُر سکون انداز" ہے۔ کام یاب اور تجربہ کار مقررین دورانِ تقریر بغیر کسی اشد ضرورت کے اپنے جسمانی اعضا کو جنبش اور حرکت نہیں دیتے۔ سامعین کو جب اپنی جانب متوجہ کرنا ہوتا ہے تو آواز کے مناسب اتار چڑھاؤ اور موزوں اشارات سے کام لیتے ہیں۔ اگر کوئی مخالف شور شرابا کرے تو جوابی کارروائی میں مقرر کو انتہائی پُر سکون انداز میں جواب دینا چاہیے۔ اگر وہ اسی طرح چیختا اور چلاتا ہے، تو وقتی طور پر تو اس کا تاثر ہو سکتا ہے، تاہم سوچ و بچار کے بعد لوگ اس فعل کو مستحسن نہیں سمجھیں گے۔ لہٰذا مقرر کو محتاط انداز میں اپنی تقریر کی ابتدا سے انتہا تک اطمینان کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ "خیالات و دلائل کی ترتیب" اصولِ خطابت کا انتہائی اہم نکتہ ہے۔ مقرر کو تقریر سے پہلے اپنے موضوع کا ایک

خاکہ مرتب کرنا چاہیے۔ پھر افکار و نظریات اور دلائل و براہین کی اسی ترتیب کے مطابق و موافق سامعین کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ "سامعین کا لحاظ" مبادیِ خطابت کا انیسواں اصول ہے۔ مقرر نے چوں کہ سامعین سے مخاطب ہونا ہوتا ہے، اس لیے اسے سامعین کے مراتب کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مقرر کے سامنے سامعین تین حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ کچھ دائیں جانب، کچھ سامنے اور کچھ بائیں جانب براجمان ہوتے ہیں۔ مقرر کو چاہیے کہ محض ایک جانب ہی نہ دیکھتا رہے، بلکہ تینوں جانب دیکھے۔ سامعین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرے۔ کچھ جملے دائیں جانب دیکھ کر کہے، کچھ بائیں جانب دیکھ کر اور کچھ سامنے بیٹھے سامعین کی جانب دیکھ کر ادا کرے۔ کسی بھی سمت میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، بلکہ سب کو یکساں توجہ دینا چاہیے۔

اصولِ خطابت کا ایک اور نکتہ "مجمع سے خطاب" ہے۔ مقرر جب سامعین کے سامنے جاتا ہے، تو اس وقت انتہائی عقل مندی سے خطابیہ الفاظ کا چناؤ کرنا چاہیے۔ مجمعے کی علمی نوعیت، موضوع اور موقع محل کی مناسب سے ان سے مخاطب ہونا چاہیے۔ اس سلسلے میں مصنف نے بتیس خطابیہ الفاظ لکھے ہیں۔ جن میں سے چند یہ ہیں:

> "اعیانِ قوم و سرفروشانِ ملت، علمائے کرام، رؤسا، عظام، شرکاء ذوی الاحترام، مربیان، علم و حامیانِ فن، میر مجلس اور حضارِ بزم یا حاضرینِ بزم، صدرِ محترم اور حاضرینِ بزم، میرے نوجوان رفیقو اور دوستو، معزز حضرات و خواتین۔"(۳۲)

مخلوط مجمعے کا لحاظ "خطابت کے بنیادی اصولوں کا ایک اور بنیادی نکتہ ہے۔ مقرر کے سامنے بیٹھے سامعین ہر عمر، علم اور طبقے کے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے انھیں سب کو ملحوظ رکھ کر خطاب کرنا چاہیے۔ "مخالف مجمعے کا لحاظ" ایک اہم نکتہِ اصولِ خطابت ہے۔ جو مقرر مخالفین کے سامنے اظہارِ خیال کرتا ہے تو اسے بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ مخالفین اور معاندین کو متاثر کرنا آسان اور سہل نہیں ہے۔ مقرر انتہائی انکساری اور ہوشیاری سے اپنا مدعا بیان کرے۔ اس ضمن میں مصنف نے نپولین کی تقریر کا تذکرہ کیا ہے، جو اس نے اپنے باغی سپاہیوں کے سامنے کی اور اس کے اختتام پر "نپولین-زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے۔ علاوہ ازیں، نہروان میں حضرت علی اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کے ان خطابات کا تذکرہ کیا ہے، جو خوارج کے مقابلے میں کیے گئے تھے۔ نو آموز مقررین کو یہ سمجھانے کی سعی کی گئی ہے کہ وہ ایسی صورت حال میں ذہن کی طراری اور ماہرانہ فن کاری کے بغیر مقرر ظفریاب نہیں ہو سکتا۔ "منتشر مجمعے پر قابو حاصل کرنا"

تئیسواں اصول ہائے خطابت ہے۔ اگر مجمع منتشر ہو، نظم وضبط سے تہی ہو، لوگوں کے مابین گزوں کا فاصلہ ہو تو ایسی صورت حال میں تقریر کرنا کارِ مشکل ہے۔ منتشر مجمعے کی طرح مصنف کا ذہن بھی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے مشہور خطیب ایچ وارڈ بیچر کے الفاظ میں یہ سمجھانے کی سعی کی ہے کہ مجمعے کی تعداد معنی نہیں رکھتی۔ اگر صرف دس بارہ سامعین ہوں اور ان کے درمیان ڈھیروں فاصلہ ہو تو ایسی صورت میں ان سے خطاب کرنا بے حد مشکل ہے۔ اس لیے مجمعے کا بالترتیب اور اکٹھے بیٹھنا تقریر کی تاثیر میں اضافہ کرتا ہے، نیز مقرر کو بہترین تقریر پر ابھارتا ہے۔

چوبیسواں اصولِ خطابت "تن درستی" ہے۔ مقرر کے لیے جسمانی اور دماغی صحت انتہائی ضروری ہے۔ سامعین سے داد و تحسین وصول کرنے کے لیے اسے پھیپھڑوں، گلے اور دانتوں کی مدد حاصل کر کے، آواز کے زیر و بم سے اپنی مہارت دکھانا پڑتی ہے۔ اس لیے مقرر کا صحت مند ہونا بے حد ضروری ہے۔ "طعام" اور "آرام" اصولِ خطابت کے مبادیات میں سے ہیں۔ مصنف کے مطابق مقرر کے لیے تقریر سے قبل طعام و آرام دونوں ضروری ہیں۔ تاہم، دونوں میں اعتدال بے حد اہم ہے۔ خالی پیٹ اور شکم سیری دونوں تقریر کے لیے خطرناک ہیں۔ مقرر کے لیے مضرِ صحت معقولات اور مشروبات سے پرہیز لازم ہے۔ علاوہ ازیں، جسم کی چستی اور تن درستی کے لیے ورزش اور فرحت و صحت بخش مشروبات کا استعمال کرنا چاہیے۔ "منشیات سے پرہیز" اور "غرارہ کرنا" بھی مقرر کی تقریری استعداد بڑھانے میں معاونت کرتا ہے۔ مقرر کو منشیات وغیرہ سے پرہیز برتنا چاہیے، کیوں کہ ایسی چیزیں گلے اور پھیپھڑوں کی خرابی کا باعث ہیں۔ اگر مقرر تمباکو نوشی کا عادی ہے تو تقریر سے پہلے اور بعد میں غرارہ کرنے سے اس کے گلے کو سکون ملے گا۔

انتیسویں نکتے میں "کُھلے میدان میں تقریر کرنے" کے چند اہم معاون اصول بتائے گئے ہیں۔ کھلے میدان میں تقریر کرتے ہوئے مقرر کو تقریر سے قبل پھیپھڑوں کو گہری سانس سے بھر لینا چاہیے اور بلاضرورت خارج نہیں کرے۔ تقریر کے دوران مناسب وقفوں سے ہوا بھرتا رہے، گویا خارج شدہ سانس کی جگہ پُر کر لے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ بند ہال میں آواز گونجتی ہے، جب کہ کھلے میدان میں آواز پھیلتی ہے۔ لہٰذا، مقرر کے لیے مذکورہ تکنیک اپنانا ضروری ہے۔

تیسویں نکتے کی ذیل میں مصنف نے "شب میں تقریر کرنے" کے چند بنیادی اصول بتائے ہیں۔ شب میں تقریر کرتے ہوئے مقرر کو چہرہ روشنی میں رکھنا چاہیے، تاکہ سامعین سے اس کے چہرے کے تاثرات اور اتار چڑھاؤ پوشیدہ نہ ہوں، اس سے تقریر کا اثر بڑھ جائے گا۔ رات گئے اکثر سامعین کے اونگھنے اور بے توجہی کا

اندیشہ ہوتا ہے، اس لیے وہ مقرر جس کی باری دیر سے آتی ہے، وہ اسی صورت سامعین کے دلوں میں گھر کر سکتا ہے، جب وہ فنِ خطابت کے انھی اصولوں کو اپناتے ہوئے اپنی تقریر کرے۔

"دورانِ تقریر میں پانی کا استعمال نہ کرنا" مفید ہے۔ جب کہ استعمال کرنے کے دو نقصانات ہیں، ایک یہ کہ سامعین کی توجہ بٹ جاتی ہے، دوسرا ٹھنڈا پانی گلے کے لیے مضر ہے۔ البتہ گرم پانی کا استعمال دورانِ تقریر مقررین کے لیے مفید ہے۔ اصولِ خطابت کے مبادیات کا آخری نکتہ "لباس" ہے۔ مقرر کے لیے خوش مذاقی کے ساتھ خوش لباسی انتہائی ضروری ہے۔ لباس کے معاملے میں مقرر کو محتاط ہونا چاہیے۔ اس کا لباس نہ ایسا ہو کہ سامعین کی توجہ کا واحد مرکز بن جائے اور نہ ایسا کہ مقرر کے وقار کو مجروح کرے۔ مناسب طرز کا مہذب اور پُروقار لباس مقرر کی شخصیت اور تقریر دونوں کو اثر انگیز بناتا ہے۔

"ریطوریقا" میں مشقِ تقریر کے ضمن میں زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ محض چند جملوں میں مصنف یہ باور کرواتا ہے کہ مشق کے ذریعے مقرر کسبی اوصاف اور تقریر میں مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ جب کہ کلب مصطفیٰ اس ضمن میں وضاحتی طریقہ اپناتے ہیں۔ ان کے مطابق فنِ خطابت مشق اور سعیِ مسلسل کے بغیر نہیں سیکھا جا سکتا۔ مسلسل محنت اور کوشش مقرر کو اس فن میں مہارتِ تامہ اور بلندیِ مقام عطا کرتی ہے۔ مصنف کے مطابق یہ فن وہبی بھی ہے اور کسبی بھی۔ وہبی مقرر کو کسبی مقرر کی نسبت کم محنت کرنا پڑتی ہے، تاہم محنت کے بغیر وہ میدانِ خطابت میں ممیز نہیں ہو سکتا۔ کسبی مقرر مسلسل محنت اور متواتر مشق سے خطیبانہ رنگ و آہنگ اپنا سکتا ہے، نیز تقریر کے تمام تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے اپنے اندر خطیبانہ اجزا کی کمیوں کے باوجود محنت اور کوشش سے انھیں پورا کیا۔ اس ضمن میں مصنف نے سسرو، ڈیماستھینز، بشپ ولبر فورس، جان برائٹ، پٹی داینگر (Pitty the younger)، سید سبط حسن، شریڈن، رابرٹ ہال اور ڈزریلی کی مثالوں سے جہدِ مسلسل اور مشقِ متواترہ کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا ہے۔

"ریطوریقا" میں خطابت کی روایت کو شاملِ موضوع نہیں کیا گیا۔ جب کہ سید کلب مصطفیٰ نے روایتِ خطابت کو مختلف حوالوں سے تفصیلاً بیان کیا ہے۔ مصنف نے ابتدائے خطابت اور اس کے ارتقا کے بارے میں بتاتے ہوئے یہ حقیقت اظہر من الشمس کی ہے کہ خطابت کی باقاعدہ ابتدا کا درست تخمینہ لگانا ناممکن ہے۔ انسان نے جب مافی الضمیر کا اظہار شروع کیا اور اپنے مسائل بیان کرنا شروع کیے تو اس وقت ہی خطابت کا آغاز ہوا۔ تاریخ اور سنین کے حوالے سے بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو پانچ سو قبل مسیح سے پہلے فنِ خطابت کا ذکر نہیں

ملتا۔ مذکورہ صدی کے وسط میں سوفسطائیوں نے علمی دُنیا میں انقلاب برپا کیا۔ علم کی ترویج و اشاعت کے لیے خطابت کو بروئے کار لا گیا۔ اس لیے فنِ خطابت کے بنیادی اصول برونا غورث ۴۸۵ق م، جورجیاس ۴۸۵ق م اور پریکلیس (Pericles) ۴۳۰ق م نے وضع کیے۔ بعد ازیں، مصنف نے یونان، روم، عرب، انگلستان اور ہندوستان کے نام ور خطبا اور ان کے محاسنِ خطبات کو زمانی ترتیب کے ساتھ قلم بند کیا ہے، نیز تقریر کے ضمن میں ان کی تحریروں کی وضاحتی امثلہ بھی پیش کی ہیں۔

## 5۔ خطابت کی اقسام

ارسطو نے فنِ خطابت پر بہ طور مجموع بات کرتے ہوئے اس کو تین اقسام "سیاسی، عدالتی اور عوامی تقاریر" میں تقسیم کیا ہے۔ نیز، اس نے اقسامِ خطابت کو زیادہ مفصل بیان نہیں کیا۔ بلکہ خطابت پر اثر انداز ہونے والے عوامل کو بنیادی نکتہ بنا کر مفصل بحث کی ہے۔ جب کہ کلب مصطفٰے نے خطابت کو نوعی، موضوعی اور مقصودی اعتبار سے منقسم کر کے اقسامِ خطابت اور ان کی ذیلی صورتوں کو مفصل بیان کیا ہے۔

### ا۔ خطابت بہ اعتبار نوع

مصنف نے خطابت کو تین بنیادی حصص "خطابت بہ اعتبارِ نوع، بہ اعتبارِ موضوع اور بہ اعتبارِ مقصود" میں تقسیم کرتے ہوئے ان کو پندرہ مزید ذیلی اقسام میں منقسم کیا ہے۔ "خطابت بہ اعتبارِ نوع" کی مزید چار اقسام ہیں۔ اول، مکتوبی خطابت ایسی خطابت ہے جو پہلے سے تحریری صورت میں تیار کر لی جائے اور روبہ روئے سامعین دیکھ کر دہرا دی جائے۔ دوم، خطابت بالحفظ ایسی خطابت کو کہا جاتا ہے جو تحریری صورت میں تیار شدہ خطابت کو زبانی یاد کر کے مجمعے کے سامنے دُہرا دی جائے۔ رٹ کر تقریر کرنے والا مقرر برجستگی، سامعین کی نفسیات شناسی اور مجمعے کے رجحان کے مطابق لفظ و آہنگ اور اندازِ بیان تبدیل کرنے سے خالی ہوتا ہے، اس لیے اس کی تقریر چند مستثنٰی صورتوں کے زیادہ اثر انگیز نہیں ہوتی۔ سوم، خطابت اعدادی خطابت کی ایسی قسم ہے جس میں تقریر سے قبل مقرر معلومات و شواہد جمع کر کے اپنی بھرپور ذہن سازی کرتا ہے، بعض اوقات ان نکات کو کاغذ پر محفوظ بھی کر لیتا ہے۔ ایسے وہ دورانِ تقریر روانی، برجستگی اور اثر پذیری کو قایم رکھ سکتا ہے۔ چہارم نوعِ خطابت "خطابتِ ارتجالی" ہے؛ یہ فی البدیہہ خطابت ہے۔ وہی مقرر ایسی کام یاب تقریر کر سکتا ہے، جس کو میدانِ علم یا میدانِ خطابت پر دسترسِ کامل ہو۔ ایسے مقرر کا فطری اندازِ تقریر، متانتِ گفت گو اور جوش و جذبہ سننے والوں کو فوراً قائل اور متاثر کرتا ہے۔

بیان کردہ تین انواعِ خطابت کو درجہ بہ درجہ اپنا کر ایک مقرر ارتجالی مقرر بن سکتا ہے۔ مصنف کے مطابق ارتجالی خطابت کے چار زینے ہیں: زینہِ اولیٰ بے تکلف گفت گو کرنا، زینہِ ثانی عمدہ گفت گو کرنا، زینہِ ثلاثہ اپنی مکمل تقریر لکھنا اور زینہِ اربع تقریری نکاتِ بحث کا منضبط ذہنی خاکہ تیار کرنا ہے۔ ان زینوں کو طے کرنے کے بعد نو آموز مقرر ارتجالی خطیب بن کر سامنے آتا ہے۔

## ۲۔ خطابت بہ اعتبار موضوع

"خطابت بہ اعتبار موضوع" چھ اقسام میں تقسیم شدہ ہے۔ پہلی قسم "دینی خطابت" ہے، جس کا مقصد دینی و اخلاقی تعلیم و ترویج ہے، اس میں انسانی جذبات و احساسات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ دینی خطابت کی چھ ذیلی اقسام "تبلیغی خطابت، عیدین و جمعے کے خطبے، وعظ، میلاد، ذاکری اور مناظرہ" ہیں۔ مستند دلائل اور معتبر براہین "تبلیغی خطابت" کا لازمہ ہیں۔ مخالف نظریات کے حامل گروہوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے اپنے نظریات کو تہذیب اور شان کے ساتھ دلائل کے پیرہن میں ڈھال کر پیش کرنا چاہیے۔ طعن و تشنیع اور طنز و مزاح کے رویے سے گریز لازم ہے۔ مخالف نظریات کے کمزور پہلوؤں پر نرم انداز میں تنقید کر کے اپنے نظریات کو ثابت کیا جائے، تاکہ معاندانہ جذبات ابھرنے کے بجائے آمادگی کی فضا قایم ہو سکے۔ "جمعے و عیدین" کے خطبوں کی روایت بہت قدیم ہے۔ یہ انسان کے اخلاقی، روحانی اور ایمانی پہلوؤں کی مثبت نشوونما کے لیے اہم ہیں۔ تاہم آج کل عربی متن کے خطبے پڑھ دیے جاتے ہیں، جو سامعین کی سطحِ فہم میں نہیں آتے۔ ایسے خطبوں کی اثر انگیزی اور کام یابی کے لیے اپنی زبان کا استعمال ضروری ہے۔ "وعظ" دینی خطابت کی ایک اہم قسم ہے۔ اس میں اخلاقی اور دینی دروس کا اہتمام ہوتا ہے۔ واعظ کے لیے عالمِ باعمل ہونا ضروری ہے؛ کلام کی تاثیر دراصل متکلم کے عمل میں پوشیدہ ہے۔ وعظ میں تاثیر اور کشش پیدا کرنے کے لیے بعض اوقات دل چسپ قصوں کا سہارا بھی لیا جاتا ہے۔ تاہم، وعظ جس قدر مختصر ہو گا، اسی قدر پُر لطف اور پُر اثر ہو گا۔ "میلاد" دینی خطابت کی ایک اور مروجہ قسم ہے۔ نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ولادت کے موقع پر ہر برس محافلِ میلاد کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ میلاد میں کی جانے والی تقاریر مذہبی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے عمل پر ابھارنے کے لیے بہترین وسیلہ ہو سکتی ہیں۔ تاہم، سالہا سال سے ایک ہی طرز پر رٹے ہوئے خطبات پڑھ دیے جاتے ہیں۔ ان تقاریر کو خطابت کے اصولوں اور عوامی شعور کے مطابق تیار کر کے ترغیب و ترہیب میں کامل بنایا جا سکتا ہے۔ دینی خطابت کی ایک اہم قسم "ذاکری" ہے۔ یہ عمومی خطابت سے اس لیے بھی مختلف ہے، کیوں کہ سوائے ابتدا اور انتہا کے، اس کا موضوع اور دائرہ کار الگ ہے۔ ذاکری کا تعلق واقعہِ

کربلا اور اس کے اندوہ ناک گوشوں سے ہے۔ خطابت کی یہ صنف ایران میں "روضہ خوانی"، ہندوستان میں "حدیث خوانی" اور پھر "ذاکری" کہلائی۔ یہ عمومی خطابت کی طرح پلیٹ فارم کی بجائے کرسی یا منبر پر کی جاتی ہے۔ جس محفل میں ذاکری کی جاتی ہے، اسے مجلس کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ذاکری کی ابتدا محمد بن قاسم کے حملے کے بعد ہوئی۔ محمد علی، سید دل دار علی طاب سراہ، علامہ غفراں مآب سید دل دار علی کے پرپوتے سید محمد حسین اور سید سبطِ حسن ذاکری میدان میں اہم نام ہیں۔ کلب مصطفے کے مطابق ذاکری کی نوعیت عمومی خطابت سے مختلف ہے۔ ذاکری تین حصوں "تمہید، فضائل (یعنی وسطِ تقریر) اور مصائب (یعنی خاتمہِ تقریر) پر مشتمل ہے۔ تمہید میں قرآنی آیات، آئمہ کے اقوال یا اشعار ہوتے ہیں۔ نوعی، اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی مفاہیم کو اس میں سمونے کی سعی کی جاتی ہے۔ فضائل میں اہلِ بیت اصحاب و اعوان کے مرتبے اور فضیلت کو طشت از بام کیا جاتا ہے۔ آخری حصے یعنی مصائب میں حضرت امام حسین اور ان کے رفقا اور ورثا پر ٹوٹنے والے مصائب و آلام کے تذکرے کے ساتھ ساتھ امام اور ان کے ساتھیوں کی اولوالعزمی، بلند نظری، خشیتِ الٰہی، خوددواری اور عقیدہِ توحید کی استواری کو بیان کیا جاتا ہے۔ ذاکری میں ترقی اور کمال کے لیے اسلام، تاریخِ اسلام، واقعاتِ کربلا کی سند اور روایت کے استحکام پر گرفت ضروری ہے۔

"مناظرہ" دینی خطابت کے تحت آنے والی ایک عمومی قسم ہے۔ مناظرہ دراصل مختلف مذہبی نکتہِ نظر رکھنے والے گروہوں یا افراد کے مابین مدلل بحث و گفت گو کا سلسلہ ہے۔ گروہ یا افراد منعقدہ جلسے میں عوام کے جمِ غفیر کے سامنے ایک دوسرے کے دوبہ دو اپنے اپنے نظریات کے حق میں منطقی اور فلسفیانہ دلائل مناسبتِ محل، دانش مندی اور حاضر جوابی سے پیش کرتے ہیں۔ نیز، اپنے نظریات پر اٹھنے والے اعتراضات کو بھی صبر و تحمل اور مستند دلیل و برہان سے رد کرتے ہیں۔ مناظر کو حتی الوسع آسان اسلوبِ بیان اختیار کرنا چاہیے، تاکہ سامعین استنادِ دلائل کے تحت خود حق و باطل میں امتیاز کر سکیں۔

موضوعی اعتبار سے خطابت کی دوسری قسم "علمی خطابت" ہے۔ اس سے مراد وہ مباحثے، تقاریر اور لیکچرز ہیں، جو تعلیمی اداروں میں درس و تدریس یا تقاریب کے سلسلے میں ناصحانہ طرز پر یا علمی و فنی مسائل کی تحقیق توضیح کے لیے دیے جاتے ہیں۔ ان کا مقصد فراہمیِ علم کے ساتھ سامعین کو غور و فکر کی دعوت دینا ہے۔ یہاں مصنف نے "مباحثوں" پر مفصل بحث کی ہے۔ اس ضمن میں مباحثے کی تعریف، کامیاب مباحثے کے مبادی اور موضوع کے انتخاب کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ ایک موضوع پر مختلف نکتہ ہائے نظر سے دو انسانوں کا باہم مدلل گفت گو کرنا مباحثہ ہے۔ ہر ایسا موضوع مباحثے کے لیے موزوں ہے، جس میں صریحاً دو باہم

متضاد پہلو موجود ہوں۔ کام یاب مباحثے کا انحصار موضوع کے انتخاب، مقرر کے اندازِ اظہار، دلائل کی نوعیت اور ترتیبِ دلائل پر ہے۔ عقائد و نظریات پر مبنی، خالص علمی و فنی موضوعات کے بجائے ادبی موضوعات مباحثے کے لیے مناسب ہیں تاکہ بدمزگی یا فرقہ وارانہ تعصب سے بچا جا سکے۔ فراخ دلی، راست بازی اور دلائل کا ایمان دارانہ استعمال کام یاب مباحثے کے بنیادی مبادی ہیں۔ مباحث سامعین کے ساتھ مباحثہ کرنے والے کو ذہنی و فکری اور نظریاتی اُپج عطا کرتے ہیں۔ خطابت پر کمال حاصل کرنے کے لیے نو آموز مقررین کے لیے مباحثے ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مباحثے کی تیاری میں عمیق تحقیق اور غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ مخالف نظریہ رکھنے والے کے بالمقابل اپنا نظریہ مستند اور مدلل انداز میں درست ثابت کیا جا سکے۔

بہ لحاظ موضوع خطابت کی قسمِ ثلاثہ "سیاسی خطابت" ہے۔ حکومتی و ملکی مسائل پر تقریر سیاسی خطابت میں داخل ہے۔ اس میں قومی و عالمی معاملات کے سلسلے میں کسی کی حمایت و مخالفت یا حقوق طلبی وغیرہ جیسے موضوعات بحث کیے جاتے ہیں۔ اس کی دو بنیادی صورتیں ہیں، اول پارلیمنٹری اور دوم پبلک۔ اس کا مقصد کسی خاص نظریے کے مطابق رائے عامہ کو متاثر کرتے ہوئے اپنا حامی بنانا ہے۔ یہ خطابت بلا امتیاز ملت و مذہب پر بحث کرتی ہے، اس لیے اس کا اثر اور دائرہ کار دیگر اقسامِ خطابت کی نسبت زیادہ وسیع اور دیرپا ہوتا ہے۔ ان تقاریر میں اغلاط و ابہام سے بچنے کے لیے الفاظ کا انتخاب احتیاط سے کرنا مناسب ہے۔

"سماجی خطابت" موضوعی اعتبار سے خطابت کی چوتھی قسم ہے۔ اس میں سماجی، تمدنی اور تہذیبی پہلوؤں کو موضوعِ بحث بنایا جاتا ہے۔ تمثیلی بیانات اس نوعِ خطابت کی سب سے نمایاں اور بنیادی خوبی ہے۔ سماجی خطابت کی کئی ذیلی اشکال ہیں، جیسے ضیافتی خطابت، تہنیتی خطابت، تعزیتی، خطابت، وداعی تقاریر، اظہارِ تشکر کی تقاریر وغیرہ۔ کسی پُر تکلف یا بے تکلف دعوتِ طعام کے بعد موقعے کی مناسبت سے تقریر کرنا ضافتی تقریر کہلاتا ہے۔ یہ اہلِ روم کی ایجاد ہے۔ اس مختصر تقریر میں ہلکے پھلکے اور عام فہم موضوعات یا کسی اخلاقی نکتے کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ کسی مرنے والے کی یاد میں، اظہارِ تعزیت کے لیے یا اس کے کارناموں کو یاد کر کے خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اظہارِ غم کرتی ہوئی تقاریر تعزیتی خطابت ہے۔ تہنیتی خطابت اس کے برعکس ہے۔ کسی معزز شخص کے خیر مقدم یا اعزاز میں، کسی کی شادی یا سال گرہ کی تقریب کے موقع پر تعریف و تحسین پر مبنی تقاریر تہنیتی خطابت کا حصہ ہیں۔ کسی معزز شخص کے وداع کے وقت کی جانے والی اظہارِ ملال و دل گرفتی پر مبنی تقاریر وداعی خطابت کا حصہ ہیں، جب کہ اجتماع کے آخر میں حاضرین و سامعین کی تشریف آوری کے لیے اظہارِ تشکر کی حامل تقاریر بھی سماجی خطابت کا حصہ ہیں۔

موضوعی اعتبار سے خطابت کی پانچویں قسم "کاروباری خطابت" ہے۔ اس قسم کی خطابت میں جذبات کے بجائے حقائق اور اختصار بنیادی خصائص ہیں۔ عدالتی خطابت، تجارتی خطابت اور دیگر کاروبار کے مندرجات پر مشتمل تقاریر اس کی ذیلی صورتیں ہیں۔ تجارتی لین دین میں ایک دوسرے کو متاثر کرنے کے لیے کی جانے والی تقاریر مختصر، عام فہم اور چیزوں کے نفع و نقصان کی بابت گفت گو پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ تجارتی خطابت کہلاتی ہے۔ ہر طبقہ اپنے معاملات میں حصولِ نفع کی خاطر انجمن سازی کرتا ہے، اپنے نظریات کی ترویج اور فوائد کے حصول کے لیے خطابت کا سہارا لیتا ہے، جو تجارتی خطابت کی ذیلی شکل ہے۔

"عسکری خطابت" نوجوانوں کو جوش دلانے اور ان میں مطلوبہ جذبات ابھارنے کے لیے عسکری افراد کی طرف سے کی جاتی ہے۔ ان تقاریر کا موضوع عموماً ملکی مفادات، ملی وقار اور قومی بھلائی ہوتا ہے۔ دورانِ جنگ سپاہیوں کو سستی، کاہلی اور بزدلی سے بچانے کے لیے اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے جذبات، غیض و غضب اور جوشِ عمل کو بڑھانے کے لیے اس قسم کی تقاریر معاون ہوتی ہیں۔

"خطابت بہ اعتبار مقصود" پانچ ضمنی اقسام پر مشتمل ہے۔ اول ترغیبی، دوم ترہیبی، سوم تائیدی اور چہارم اختلافی خطابت۔ سامعین کو کسی خاص نکتے یا نظریے کی طرف مائل کرنے لیے ترغیبی خطابت کا سہارا لیا جاتا ہے۔ مطلوبہ نکتے یا نظریے سے متعلق مثبت نکات، مخالف نظریے کی کم زوریوں اور دونوں نظریات میں تقابلی دلائل کے استعمال سے اپنے مدعے کو واضح اور درست ثابت کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور سیاسی اجلاس میں اس قسم کی خطابت معاونت کرتی ہے۔ ترہیبی خطابت میں سامعین کو کسی خاص عمل یا نظریے کو اپنانے سے باز رکھنا ہے۔ یہ ترغیبی خطابت کی ضد ہے۔ "تائیدی خطابت" میں مقرر کسی نکتے کی حمایت کرتے ہوئے دلائل استوار کرتا ہے، جب کہ اختلافی تقاریر میں اس کے برعکس کسی نکتے یا نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے عقلی و منطقی دلائل سے سامعین کو اپنا ہم نوا اور ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ موضوعی لحاظ سے تقسیم شدہ خطابت نوع اور مقصود کی ہر قسم پر پورا اتر سکتی ہے۔ خطیب کو چاہیے کہ ان نکات کو مدنظر رکھ کر اپنے موضوع سے متعلق دلائل و براہین استوار کرے، تاکہ نتیجہ خیز تقریر کی جاسکے۔

## 6۔ خطابت اور روانی

"ریطوریقا" میں تقریر کے منطقی ربط اور تسلسل کو لازمی جزوِ تقریر قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بغیر تقریر اثر سے تہی اور دل چسپی سے خالی ہو جاتی ہے۔ "فنِ خطابت" میں بھی یہ پہلو اسی طرح برتا گیا ہے۔ خطابت دریا کی سی روانی کی متمنی ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے، جو تقریر میں تسلسل و تواتر کی وجہ سے حسن پیدا کرتی ہے

اور سامعین کی توجہ تقریر پر مرتکز رکھتی ہے۔ یہ اسی صورت پیدا ہو سکتی ہے، جب مقرر کا ذخیرۂ معلومات نہ صرف وسیع ہو بلکہ اس کے اظہار کے لیے ذخیرۂ الفاظ اور انداز بھی بر موقع، بر محل اور سریع ہو۔ مصنف کے مطابق خطابت میں روانی کے ذریعے طغیانی کے لیے ضروری ہے کہ مقرر تواتر سے عمومی گفت گو میں بھی نئے الفاظ و تراکیب کے استعمال کی مشق کرے۔ مصنف نے مقرر کی آسانی اور تقریر میں روانی پیدا کرنے کے لیے تین ذرایع بتائے ہیں، جن میں پہلا ذریعہ ترجمہ ہے۔ ترجمے کی بہ دولت دوسرے ملکوں اور علاقوں کے علوم و فنون کے بارے میں آگہی و آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ذخیرۂ الفاظ میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ محاورات، استعارات، تشبیہات اور زبان و بیان کی ترجیحات کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ کلبِ مصطفٰے نے یہاں ایسے شہرہ آفاق مقررین کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے ترجمے کے فن کو اپنا کر روانیِ خطابت میں مہارت حاصل کی۔ ان میں سسرو (Cicero)، جان برائٹ (John Bright) اور ینگ پِٹ (Young Pitt) شامل ہیں۔ اردو زبان کے مقررین کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ عربی، فارسی اور انگریزی علم و ادب کے تراجم کے ذریعے اپنے علمی ایقان اور زورِ بیان کو مستحکم کریں۔ اس ضمن میں مصنف نے اردو زبان کے معروف مقرر سید سبط حسن کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے عربی تصانیف کے تراجم کی بہ دولت فنِ خطابت میں اوجِ کمال حاصل کیا۔ تراجم کی بہ دولت مقرر پر زبان و بیان کے نئے در وا ہوتے ہیں۔

تقریر میں روانی پیدا کرنے کا دوسرا ذریعہ "بہ آواز پڑھنا" ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ زبان میں لُکنت اور رکاوٹ ختم ہوتی ہے، نیز تسلسل اور روانی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مصنف کے مطابق مقرر کو فصیح و بلیغ مقررین کی تقاریر، مستند مصنفین اور قادرالکلام شعرا کی نگارشات کو بہ آواز بلند پڑھنا چاہیے۔ بالخصوص مقرر کا حافظہ "حضرت علی کے خطبات، شیکسپیر، ملٹن، امراوالقیس، سعدی، غالب، تھیکرے، ڈی کونسی، آزاد، میر انیس، میر تقی میر، مومن، مسعود حسن رضوی، عبدالماجد دریابادی، نیاز فتح پوری" کی تحاریر سے سیراب ہونا چاہیے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب تقریر کرنے والا شخص باضابطہ طور پر مذکورہ شخصیات کے رشحاتِ قلم کو باقاعدہ بہ آواز بلند پڑھنے کی مشقِ مسلسل کرے اور ان تحاریر میں استعمال ہونے والے پُر شکوہ اور بلیغ اقوال، خوب صورت الفاظ و تراکیب کو ازبر کر کے اپنی تقاریر میں استعمال کرے اور اپنے اسلوبِ بیان کو نکھارے۔

روانیِ تقریر کا تیسرا ذریعہ "مترادفات کا بر موقع و بر محل استعمال" ہے۔ اس سے مقرر کی زبان و بیان پر مہارت طشت از بام ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ، بات کو مختلف طریقوں سے بیان کرنے کا ڈھنگ اور طریقہ

بھی معلوم ہوتا ہے۔ مترادفات کی بہ دولت بعض اوقات مبہم اور غیر واضح بات بھی وضاحت کے سانچے میں ڈھل کر تفہیم کے پیرائے میں بیّن ہو کر سامعین کے دل میں اتر جاتی ہے۔ اس لیے ایک مقرر کو الفاظ پر قدرت کے ساتھ مترادفات کی آگہی اور آشنائی بھی ضروری ہے۔

## 7۔ تقریر کی تیاری:

"ریطوریقا" میں تقریر کی تیاری کے تمام پہلوؤں کی مفصل نشان دہی کی گئی ہے، تاہم ان پہلوؤں کی تحصیل کے ذرائع پر کوئی بحث شامل نہیں کی گئی۔ جب کہ کلب مصطفٰے نہ صرف تقریر کی تیاری میں معاون پہلوؤں کی مفصل نشان دہی کی ہے، بلکہ ان پہلوؤں کے ذریعہ ہائے کسب پر بھی سیر حاصل گفت گو کی ہے۔ وہی تقریر موثر، معتبر اور مقتدر ہوتی ہے جو باقاعدہ تیاری سے کی جائے اور خطابت کے اصول و قواعد کے مطابق سامعین کی سماعت کے سپرد کی جائے۔ اس سے صحت و بے ساختگی، دل آویزی و برجستگی مقرر کی فطرتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ تقریر کو تیار کرنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ تقریر کو رٹ لیا جائے، بلکہ عنوان کو مد نظر رکھ کر اس سے متعلقہ معلومات، دلائل و براہین بہ مطابق فہمِ سامعین مرتب کرے اور ایک خاکہ تیار کرلے۔ مصنف کے مطابق تقریر کی تیاری کی دو اقسام ہیں، ایک عام تیاری ہے۔ جس سے مراد مطالعے کی کثرت اور غور و فکر کی وسعت ہے۔ جب کہ خاص تیاری تقریر کے عنوان کو مد نظر رکھ کر تمام بیان کو مرتب کرنا ہے۔

کلبِ مصطفٰے نے عام تیاری کے اصول بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "گفت گو" تقریر کے نکھار کا پہلا اصول ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ اس نے جس موضوع پر تقریر کرنا ہو، اس موضوع سے متعلق مختلف لوگوں سے بات چیت کرے۔ اس سے موضوع کے حوالے سے نئے نکات سامنے آئیں گے۔ تقریر کی تیاری کا دوسرا اصول "مطالعہ" ہے، جس کی بہ دولت معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا، خطیب کے لیے مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔ اس ضمن میں مطالعے کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ پہلی صورت "سرسری مطالعہ" ہے۔ جس میں کوئی شخص غور و فکر کے بنا محض ورق گردانی کرتا ہے۔ دوسری صورت "سطحی مطالعہ" ہے، جس میں ناکافی غور و فکر سے قاری کسی شے کو پڑھتا ہے اور خیالات کی مبہم تصویر اس کے ذہن کے کینوس پر بن جاتی ہے۔ تیسری صورت عمیق مطالعہ ہے، جو انتہائی گہرائی اور غور و فکر سے کسی کتاب کو پڑھنا اور اس کے متعلق سوچ بچار کرنا ہے، نیز اس سے خیالات اخذ کر کے انھیں مجتمع کیا جاتا ہے۔ مقرر کے لیے لازم ہے کہ وہ تسلسل اور تواتر سے ہر خطے اور ملک کا ادب اپنے زیرِ مطالعہ رکھے، کیوں کہ ایک مقرر کو مناظرے اور مباحثے بھی کرنا

پڑتے ہیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ذخیرہِ معلومات انتہائی وسیع اور منطقی استدلال بے حد قوی ہو۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ خطیب کا اسلوبِ بیان نکھر جاتا ہے۔

عام تیاری کا تیسرا بنیادی اصول "انشا پردازی" ہے۔ فنِ خطابت کی تاریخ دیکھیں تو یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ انھیں خطیبوں کو اس میدان دوام حاصل ہوا جو بہترین انشا پرداز بھی تھے۔ مصنف نے یہاں سسرو، کو سینٹی لین اور انگلستان کے سابقہ وزیر اعظم مسٹر پٹ کے والد لارڈ برِ دوام کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ لکھنے کی مشق خطابت کے حسن کو نکھارتی ہے۔ اسی ذیل میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ دوسروں کے اقوال نقل کر کے مقرر کو یاد کرنے چاہئیں، کیوں کہ فی البدیہہ تقریر کے دوران میں یہ یاد کیے ہوئے اقوال ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

تقریر کی عام تیاری کا چوتھا اصول "الفاظ کی مناسبت اور جملوں کی ساخت و پرداخت" ہے۔ مقرر کے لیے ضروری ہے کہ اسے الفاظ کے ربط و مناسبت کا علم ہو۔ مناسبتِ الفاظ کی دو اقسام ہیں: مناسبت بہ لحاظ خیال یعنی بلاغتِ کلام اور مناسبت بہ لحاظ الفاظ یعنی فصاحتِ کلام۔ بلاغتِ کلام کی دو صورتیں ہیں، ایک مناسبت بہ لحاظ صوت اور دوسری مناسبت بہ لحاظ معنی۔ علاوہ ازیں، فصاحتِ کلام کی مزید تین صورتیں ہیں، پہلی صورت لفظ کی مناسبت بہ لحاظ آواز۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کیفیت کے مطابق الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً، کرخت اور سخت کیفیت کو بیان کرنے کے لیے الفاظ بھی اسی طرح کے استعمال کیا جائیں۔ اس سے کلام مزید موثر ہو جاتا ہے۔ "لفظ کی مناسبت خیال سے بہ لحاظ معنی" سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی بات کو مختلف طریقوں سے عام فہم انداز میں بیان کیا جائے۔ "لفظ کی مناسبت لفظ سے" سے مراد یہ ہے کہ ایسے الفاظ جمع میں استعمال کیے جائیں جو روانی کو متاثر نہ کریں، نیز فصیح اور خوش گوار معلوم ہوں۔ "جملوں کی ساخت" کے اعتبار سے مصنف نے جملوں کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے، "مختصر، متوسط اور طویل"۔ مختصر جملے بات کی قطعیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ متوسط جملے خیالات کو بیانیہ انداز میں واضح کرتے ہیں۔ طویل جملے جذبات اور جوش پیدا کرتے ہیں۔ مقرر کو جملوں کی ساخت کے حوالے سے یہ احتیاط لازمی برتنی چاہیے کہ عامیانہ، غیر واضح، اجنبی اور اصطلاحی الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ تقریر وہی موثر ہوتی ہے، جس کے جملے سادگی و سلاست سے مزین ہوں۔

عام تیاریِ تقریر کا پانچواں اصول "تخلیقِ مضامین اور تسلسلِ خیالات" ہے۔ مقرر کو الفاظ کے ذخیرے کے ساتھ ساتھ نئے مضامین و خیالات کی تلاش اور ان کی بنت کا طریقہ بھی آنا چاہیے۔ خیالات کو

واضح کرنے کا پہلا نکتہ تصور ہے۔ یہ منطق کی اصطلاح ہے، جس میں کسی شے کو ذہن کے کینوس پر منعکس کیا جاتا ہے۔ تصور کی ارفعیت، خیالات کے استحکام اور تقویت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غور و فکر کی بہ دولت ہی مقرر اپنے موضوع پر جملہ معلومات نہ صرف جمع کرتا ہے، بلکہ انھیں سامعین تک عام فہم انداز میں پہنچانے کے ذریعے بھی تلاشتا ہے۔ دوسرا نکتہ "مشاہدہِ ذہنی" ہے۔ اس ذیل میں بتایا گیا ہے کہ مشاہدہِ ذہنی کی بہ دولت خیالات کے ساتھ ساتھ بصیرت کی نشوونما میں اضافہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ مشاہدہِ ذہنی کی بہ دولت خیالات کو دیکھا جاتا ہے، یہی عمل تخلیقِ مضامین کی کنجی ہے۔ مطالب تک رسائی، گہرائی اور گیرائی مشاہدہِ ذہنی کی دین ہے۔ اس لیے مقرر کو تصور اور مشاہدہِ ذہنی کی مشق تسلسل و تواتر سے کرنی چاہیے۔ تیسرا نکتہ "تلازمِ خیالات" ہے۔ تلازمِ خیالات سے مراد خیالات کی مناسب تنظیم و ترتیب ہے۔ ایک خیال کا دوسرے خیال کے ساتھ مناسب اور منطقی ربط تقریر کے اثر کو بڑھا دیتا ہے۔ لہٰذا، مقرر کو چاہیے کہ وہ اپنی تقریر کا ایک باقاعدہ خاکہ مرتب کرے اور اس میں خیالات کو مناسب طریقے سے ترتیب دے۔

عام تیاری کا اصولِ ششم "انتخابِ خیالات" ہے۔ ایک تجربہ کار مقرر انتخابِ خیالات کے معاملے میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیتا ہے۔ انھی خیالات کا چناؤ کرتا ہے، جو بالکل واضح اور موضوع کے عین مطابق ہوں۔ مصنف کے مطابق مقرر کو چاہیے کہ خیالات کے انتخاب کے وقت پانچ امور کو مدنظر رکھے۔ پہلا امر اصلیت ہے۔ یعنی، ایسے خیالات پیش کیے جائیں جو روزمرہ پیش آنے والے واقعات سے ماخوذ ہوں۔ دوسرا امر "بلندیِ خیالات" ہے۔ خیالات کی بلندی سے مراد یہ نہیں ہے کہ ایسے خیالات پیش کیے جائیں جو معمولی سمجھ سے باہر ہوں اور نہ ہی ایسے خیالات پیش کیے جائیں جو عامیانہ اور رقیق ہوں۔ تیسرا ضروری امر "سادگی" ہے۔ سادگی تقریر کو موثر، مفید اور فطری بنانے میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ مصنف کے مطابق مشکل الفاظ کے استعمال کے بجائے، سادہ اور عام فہم الفاظ استعمال کیے جائیں، غیر معروف بات کی جانب اشارہ نہ کیا جائے، بعید از فہم تشبیہات و استعارات تقریر میں شامل نہیں کرنے چاہئیں۔ سادگی سے مراد یہ ہے کہ کوئی خیال ایسا پیش نہ کیا جائے جو پیچیدگی اور الجھاؤ پیدا کرے۔ چوتھا بنیادی امر "باریکی" ہے۔ باریکی سے مراد یہ ہے کہ کوئی خیال ایسا پیش نہ کیا جائے جو سطحی ہو، بلکہ ایسے خیالات طشت از بام کیے جائیں جو انسانی فطرت کے مطالعے اور کائنات کے مشاہدے کا ثمر ہوں۔ "انتخابِ خیالات کا پانچواں اساسی امر "تڑپ" ہے۔ تڑپ سے مراد ہے کہ محض خیالات پیش نہ کیے جائیں، بلکہ خیالات، جذبات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔ خیالات اگر تڑپ اور شدت سے تہی ہوں تو ان میں خطیبانہ رنگ و آہنگ نہیں ابھر سکتا۔

تقریر کی عام تیاری کا ساتواں اصول "الفاظ و خیال کا باہمی ربط" ہے۔ الفاظ اور خیال کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ کسی خیال کو بیان کرنے کے لیے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ الفاظ کی بہ دولت ہی دماغی قوتوں کو ایک نکتے پر مرکوز کر کے خیالات منصہِ شہود پر آتے ہیں۔ لہٰذا مقرر کو خیالات کی مناسبت، صحت اور ارفعیت کے مطابق الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔

مصنف نے تقریر کی "خاص تیاری" کے چند اصول و ضوابط منضبط کیے ہیں۔ ان اصولوں کی تفصیل سے قبل مصنف نے ان کی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے دنیائے خطابت کے چند معروف و مقبول مقررین کا ذکر کیا ہے، جو تقریر سے پہلے خاص تیاری کے اصول کو اپناتے تھے۔ ان مقررین میں امریکی صدر "مسٹر ولسن"، امریکا کے ایک اور صدر "روز ولٹ"، انگلستان کے وزیر اعظم "مسٹر گلیڈ سٹن"، لارڈ بالفر اور مسٹر چرچل شامل ہیں۔ خاص تیاری کے سلسلے میں مصنف نے چھ اصول بیان کیے ہیں۔ ان میں پہلا نکتہ "موضوع کا لحاظ" ہے۔ یعنی، مقرر کو تقریر کی تیاری کے وقت اپنے موضوع کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دوسرا نکتہ "موضوع پر غور و فکر اور انضباطِ تاثرات" ہے۔ سب سے پہلے مقرر کو اپنے موضوع سے متعلق غور و فکر اور تدبر کا التزام کرنا چاہیے۔ اسے موضوع کے مالہٗ وماعلیہ کے بارے میں علم حاصل ہو، تاکہ وہ منظم انداز میں انضباطِ تاثرات کر سکے۔ تیسرا نکتہ "مضامین کی ذہنی ترتیب" ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ حاصل کردہ معلومات کو مناسب انداز میں مرتب کرے، تاکہ مجمعے کے سامنے غلطیوں سے بچ سکے اور اپنے خیالات کو مستحکم طریقے سے سامعین تک پہنچائے۔ چوتھا نکتہ "خاکے کی تشکیل" ہے۔ محولہ بالا مدارج سے گزرنے کے بعد مقرر کے لیے لازم ہے کہ وہ ان تمام معلومات کو نکات کی صورت میں تدریجی اور منطقی ترتیب سے ایک کاغذ پر لکھے اور ایک خاکہ تیار کرے۔ خاکے کی تیاری میں "تمہید، وسط اور خاتمے" کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ چوتھا نکتہِ تیاری "خاکے کا لباس" ہے۔ مقرر اک اجمالی خاکہ تیار کرنے کے بعد اس خاکے میں معلومات اور افکارِ نو کے ایسے رنگ بھرتا ہے جو سامعین کے دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ جب وہ لکھنے کی مشق کرتا ہے تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ اغلاط و اسقام کی نہ صرف نشان دہی ہو جاتی ہے بلکہ اس کی خود اعتمادی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عمل مقرر کے فن کو نکھارنے میں بہت مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ پانچواں نکتہ "خاکے کی تلخیص" ہے۔ مصنف کے مطابق خاکے کی تلخیص بے حد ضروری ہے مقرر کو چاہیے کہ خاکے کے حوالے سے اختصار در اختصار کو ترجیح دے۔ خصوصیت کے حامل عنوانات کو جلی اور تحتی عنوانات خطِ خفی میں تحریر کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مکمل خاکہ مقرر کے ذہن پر مرتسم ہو جائے گا۔ جب وہ سامعین کے سامنے اظہارِ خیال کرے گا تو اعتماد کے ساتھ

جملوں کی مناسبت اور خیالات کی مطابقت کو بروئے کار لائے گا۔ چھٹا نکتہ "تجزیے یا تلخیص کی ذہن نشینی" ہے۔ مصنف نے اس نکتے کو یوں احاطہ تحریر میں لایا ہے کہ مقرر محولہ بالا تمام اعمال سے گزرنے کے بعد اپنے خاکے کو بہترین انداز میں اس طرح ذہن نشین کرے کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔ کام یاب مقررین کا یہ اصول ہے کہ وہ عوام کے سامنے جانے سے پہلے اپنی تقریر کے خاکے کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے ہیں اس مرحلے میں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ تمام نکات کو اختصار کے ساتھ ازبر کر لیا جائے اور پھر انتہائی سہولت اور مہارت سے عوام کے گوش گزارے جائیں۔

## 8۔ تقریر کے اہم لوازم

### ا۔ تقریر میں حافظے کی ضرورت

"ریطوریقا" میں مقرر کے لیے موضوع پر گرفت اور متعلقہ علم ہونے کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس علم کے استحکام کے لیے قوتِ حافظہ درکار ہے۔ تاہم ارسطو نے حافظے کو بنیاد بنا کر علاحدہ بحث نہیں کی۔ جب کہ "فنِ خطابت" کے مصنف نے تقریر میں حافظے کی ضرورت و اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ مقرر حافظے کے بل پر سامعین کے سامنے کسی موضوع کی بابت تقریر کرتا ہے۔ حافظے کو قوی کرنے کے لیے مقرر کو مسلسل مشق کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ وہ ہر تقریر سے پہلے باقاعدہ رٹا لگائے، اگر وہ ایسا کرے گا تو دورانِ تقریر معمولی سا خلل بھی اس کے خیالات کو درہم برہم کر دے گا، جس سے وہ بوکھلا کر تقریر چھوڑ دے گا یا عوام کا تمسخر کا شکار ہو گا۔ حافظے کو مضبوط کرنے کے لیے مقرر کو مسلسل مطالعے کے ساتھ ساتھ اہم ترین اور ضروری معلومات کو ذہن نشین کرنا چاہیے اور پھر وقتاً فوقتاً انھیں دہرانا چاہیے۔ اس سے حافظہ وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط اور قوی ہوتا جائے گا۔ مصنف نے حافظے کے حوالے سے ایک اور مشق یہ بتائی ہے کہ مقرر کے معمول میں یہ عمل شامل ہو کہ وہ روزانہ کسی مصنف کے نہ صرف خیالات کو ذہن نشین کرے، بلکہ اس کے الفاظ تک حافظے کا حصہ بنیں۔

### ۲۔ مقرر کا انداز و حرکات

"ریطوریقا" میں فنِ خطابت کے جملہ لوازمات کو قلم بند کیا گیا ہے، لیکن مقرر کی حرکات و اشارات کو موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا۔ جب کہ سید کلب مصطفٰے نے حرکات و اشارات کی اہمیت کو بھی رقم کیا ہے۔ برمحل اشارات مقرر کے خیالات و احساسات کو مزید واضح اور بین کرتے ہیں۔ لہٰذا، مصنف نے دورانِ تقریر مناسب اشارات اور حرکات و سکنات کو بہتر پیرائے میں اظہار کرنے پر زور دیا ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ آئینے

کے سامنے کھڑے ہو کر کسی موضوع پر اظہارِ خیال کرے اور مناسب حرکات و سکنات سے اپنے خیالات و احساسات کو واضح کرے یہ آئینہ مقرر کے لیے بہترین مشق گاہ ہے، کیوں کہ اس سے مقرر کی اغلاط کی نہ صرف نشان دہی ہو گی بلکہ اسے مناسب حرکات و اشارات کا ذریعہ بھی معلوم ہو گا۔ مصنف نے حرکات و اشارات کے پیرائے میں مختلف اعضائے جسم "سر، چشم و ابرو، چہرہ، ہاتھ اور پاؤں" کی حرکات کی بابت تفصیل سے گفت گو کی ہے کہ تقریر کرتے ہوئے کیفیت اور حالت کے مطابق مذکورہ اعضا کی مناسب حرکات سے تقریر کو مزید موثر کیا جا سکتا ہے۔ البتہ پاؤں کی حرکات بتاتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ مقرر جوش و شدت، توہین و حقارت اور غصے و نفرت کے اظہار کے لیے اپنے پنجوں پر بلند ہو جاتا ہے اور کبھی پاؤں کو زمین پر مارتا ہے۔

### ۳۔ سامعین کے برابر کھڑے ہو کر تقریر کرنا

علاوہ ازیں مصنف نے سامعین کے سامنے برابر کھڑے ہو کر تقریر کرنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ جب کوئی مقرر سامعین کے برابر کھڑا ہو، تو اسے چاہیے کہ اس کا سر بہت زیادہ اوپر کی طرف اٹھا ہوا نہ ہو اور اگر اس کے سامنے میز موجود ہے تو اس پر ہاتھ رکھے۔ اگر مجمع زیادہ ہے تو اسے چاہیے کہ میز سے ہٹ کر تقریر کرے۔ اگر مقرر کھڑے ہو کر تقریر کر رہا ہے اور برابر میں کرسی موجود ہے تو اس کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کٹہرے میں کھڑا تقریر کر رہا ہے تو اس کا سہارا بالکل بھی نہیں لینا چاہیے۔

بیٹھ کر تقریر کرتے ہوئے مقرر کو آدابِ تقریر اور آدابِ سامعین ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ اس طرح بیٹھے کہ اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو مناسب انداز میں سمیٹ کر رکھے اور تقریر کی کیفیت کے مطابق بازوؤں اور ہاتھوں کو حرکت دیتا رہے۔ منبر پر بیٹھ کر تقریر کرتے ہوئے مقرر کو چاہیے کہ وہ بائیں جانب خفیف سا ترچھا ہو کر بیٹھے۔ اس سے اندازِ نشست خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ دائیں جانب مڑتے ہوئے بھی آسانی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں کبھی بھی منبر پر ٹانگ پر ٹانگ جما کر نہ بیٹھے۔ منبر پر بیٹھتے ہوئی یہ دھیان رکھے کہ نچلے زینوں کا استعمال کرے۔ اگر مجمع زیادہ ہو تو پھر عرشے پر بیٹھ جائے۔ منبر پر بیٹھ کر تقریر کرتے ہوئے بھی اصولِ خطابت کے تمام لوازم و قوانین کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جب کہ "ریطوریقا" میں اس موضوع پر کوئی بحث نہیں ملتی۔

### ۴۔ خطابت میں تناسبِ آواز اور علمِ قرات کی ضرورت

ارسطو نے "ریطوریقا" میں آواز کے زیر و بم اور الفاظ کے درست تلفظ پر تفصیل اور دلیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ مذکورہ کتاب میں بھی اس حصے کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق خطاب میں تناسبِ

آواز تناکس کو مٹا دیتا ہے۔ آواز کا مناسب اتار چڑھاؤ خطابت کی جان ہے۔ مصنف نے یہاں بتایا ہے کہ موسیقی اور خطابتی آواز میں مشابہت موجود ہے، جس طرح موسیقی میں زیر و بم کے ذریعے حسن و نکھار پیدا کیا جاتا ہے، بعینہٖ خطابت بھی تاثیر اور حُسن کے پیرائے میں اسی مشق کی متمنی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے بتایا ہے کہ آواز میں تنوع موجود ہو۔ کیوں کہ تغیر و تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ دورانِ تقریر بھی مقرر کو کیفیت کے مطابق آواز کو متنوع رکھنا چاہیے۔ یہ مسلسل مشق سے ہی حاصل ہوتا ہے۔ آواز کے استحکام میں زیادہ عمل دخل سانس پر کنٹرول ہے۔ جب مقرر بار بار کسی خطیب کی تقریر کو بہ آواز بلند پڑھتا ہے تو سانس پر کنٹرول اور آواز کے تنوع کو بہتر بنایا جاسکتا ہے۔

خطابت کا براہ راست تعلق بولنے اور پڑھنے سے ہے، اس لیے مقرر کے لیے علم قرات دسترس ضروری ہے۔ مصنف کے مطابق علمِ قرات اور خطابت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ایک مقرر کی علمِ قرات کے اصول و ضوابط سے مکمل آگہی تقریر میں دل چسپی اور مقرر کے ساتھ سامعین کی دل بستگی اور وابستگی پیدا کرتی ہے۔ اس کے تحت مصنف نے لہجے کے نکھار پر زور دیا ہے۔ کیوں کہ صوت کی خاص فطری کیفیت و حالت کو لہجہ کہتے ہیں۔ اس لیے مقرر کو تقریر کی کیفیت کے مطابق زیر و بم سے لہجے میں تنوع پیدا کرنا چاہیے۔ "تلفظ" کے ضمن میں مصنف اس بات پر زور دیا ہے کہ مصنف کو اپنے تلفظ، لغت، توقف اور فن کے تمام اصول و ضوابط کے محلِ استعمال کو مد نظر رکھنا چاہیے۔

## ۵۔ محاسنِ کلام اور اسلوبِ بیان

اسلوبِ بیان اور صحتِ کلام کو موثر تقریر کے اصولی نکتے قرار دیتے ہوئے "ریطوریقا" میں مفصل، جامع اور مدلل بحث کی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بھی ان نکات کو تاثیر و حسنِ تقریر کا لازمی جزو قرار دے کر جامع بات کی گئی ہے۔ مصنف نے خطابت کی تزئین کے لیے محاسنِ کلام اور اسلوبِ بیان کی ذیل میں تین نکات "نفسِ کلام، محلِ کلام اور غرضِ کلام" کو واضح کیا ہے۔ نفسِ کلام کے تحت بتایا گیا ہے کہ ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے جس سے سامعین کی سماعت آشنا نہ ہو۔ روز مرہ اور محاورے کے مطابق اظہارِ خیال کیا جائے۔ غرضِ کلام کی ذیل میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ سامعین تک مدعا و مقصد بہ آسانی پہنچ جائے۔ محلِ کلام سے مراد یہ ہے کہ اقتضائے حال کے مطابق گفت گو کی جائے۔

"اسلوبِ بیان" کے حوالے سے مصنف نے یہ بتایا ہے کہ بہترین اسلوب وہبی ہوتا ہے۔ لیکن اکتسابی ذرایع کو استعمال کرتے ہوئے اسلوبِ بیان کو نکھارا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں یونان کے معروف مقرر

ڈیما ستھینز کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا ہے کہ اس نے تھیوڈی ڈس کی کتاب کو بارہا نقل کر کے اس کے اسلوب سے اکتسابِ فیض کیا۔ علاوہ ازیں، انگریزی، عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کے ادب سے استفادہ کر کے اسلوب کو نکھارا جاسکتا ہے۔ اسلوبِ بیان جب تک فطری نہی ہو گا، اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتا۔ مناسب اتار چڑھاؤ اور واضح اندازِ بیان فنِ خطابت کو اوجِ کمال تک پہنچاتا ہے۔ "زورِ بیان اور شدتِ بیان" سے موقفِ تقریر واضح ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ انتہائی مشکل اور ادق الفاظ استعمال کیے جائیں، بلکہ اس طرح تمام مطالب اور مفاہیم کو سمیٹا جائے کہ سامعین کو موضوع کا ہر پہلو واضح ہو جائے۔ تقریر کا اچھا تاثر قایم کرنے کے لیے زور، شدت اور جذبات کی حدت بے حد ضروری ہے۔ علاوہ ازیں، جدتِ ادا تقریر کے اثر کو دوچند کر دیتی ہے۔ اس معاملے میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ اس میدان میں وہی لوگ ممتاز ہوتے ہیں، جن کی خطابت "جدت و ندرت" کا مرقع ہوتی ہے۔ "زورِ بیان، شدت اور جدت" لازمہِ تقریر تو ہے، تاہم مقرر کو ہمیشہ اعتدال اور میانہ روی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جوشِ خطابت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مقرر معتدل نہ رہے اور کسی بھی موضوع کے حوالے سے غلو کرنے لگے۔

## ۶۔ تقریر میں صنائع کا استعمال

ارسطو نے مناسب، بر محل اور اچھے صنائع بدائع کے استعمال کو تقریر کا حسن اور تاثیر کا پُر لطف ذریعہ قرار دیا ہے۔ ان کے استعمال میں وہ مختلف پہلوؤں سے مناسب مثالوں کے ساتھ واضح کرتا ہے کہ قابلِ فہم اور عام فہم الفاظ میں مختلف النوع صنائع تقریر اور استدلال کو مستحکم بناتے ہیں۔ کلب مصطفٰے کے ہاں بھی یہ نکات جامع انداز میں مرقوم ہیں۔ اس کے مطابق مقرر کو علمِ بیان و بدیع پر دسترس بہت ضروری ہے۔ اسی مہارت کے بل بوتے پر مقرر ایک بات کو مختلف طریقوں سے پُر اثر بناتا ہے۔ نیز، سامعین کے سامنے اس کے مدعا اور مقصد کی تفہیم و ترسیل سہل ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں مقرر علمِ بیان و بدیع کا سہارا لیتے ہوئے تمثیل، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجازِ مرسل، تنبیہ، مبالغہ، ایرادِ مثل، تعجب، تلمیح، ترصیع، توجیہ، تضاد، تکرارِ لفظی و معنوی، خود کلامی، استفہام، روزمرہ اور محاورے کے استعمال سے اپنے موضوع کو نکھار کر واضح اور بین کر سکتا ہے۔ مصنف کے مطابق مقدس ہستیوں کی قسم کھا کر بھی اپنی بات کو مستحکم اور مستند کیا جاسکتا ہے۔

## ۷۔ لطائف و ظرائف، قصے کہانیاں

"ریطوریقا" میں دلائل کی متفرق صورتیں بیان کرتے ہوئے ارسطو نے عوامی تقاریر میں روایتی، اخلاقی، علامتی اور حکایتی قصوں کو بہ طور دلیل استعمال کرنے کو پُر کشش اور پُر اثر قرار دیا ہے۔ کلب مصطفٰے

کے مطابق مقرر کی تقریر میں لطائف وظرائف، کہانیاں اور قصص نہ صرف دل چسپی پیدا کرتے ہیں، بلکہ ان کا تقریر میں اس لیے بھی ہونا ضروری ہے، کیوں کہ موضوع کی تفہیم وترسیل میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ فلسفیانہ نکات کو واضح کرنے، اپنے مافی الضمیر کو مناسب اور موثر انداز میں پیش کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ تاہم لطیفہ گوئی اور قصص کے بیان کے ضمن میں یہ بات مد نظر رکھنی چاہیے کہ سامعین کے مراتب و مقام کو ٹھیس نہ پہنچے۔ نیز، کوئی کہانی یا قصہ اخلاق باختہ نہ ہو۔

## 9۔ تقریر کے حصے

ارسطو نے "ریطوریقا" میں تقریر کو چار بنیادی حصص میں منقسم کیا ہے، تمہید، مدعا، دلائل اور خاتمہ۔ جب کہ صاحبِ "فنِ خطابت" نے تالیفی اعتبار سے تقریر کو تین حصوں میں منقسم کیا ہے۔ پہلا حصہ تمہید ہے۔ جس کے لغوی معنی "فرش بچھانا" جب کہ اصطلاحاً مراد یہ ہے کہ "کسی امر کے اظہار سے قبل اس کے لیے زمین ہموار کرنا۔" (۳۳) یہاں مصنف نے سسرو کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ اس کو انتہائی توجہ اور انہماک سے تیار کرنا چاہیے۔ تمہیدی کلمات موضوع کے مبادیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کے دلائل وبراہین کو پیش کرنے کے بجائے سادگی سے ابتدا کی جاتی ہے، جب کہ دوسرا حصہ مبحث ہے۔ اس میں کلام کو دلائل وبراہین کے ساتھ انتہا کی جانب لے کر جایا جاتا ہے۔ تقریر کا آخری حصہ "خاتمہ" ہے۔ اس میں مقرر کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اچانک اپنی تقریر ختم نہ کرے، بلکہ اپنی تقریر کے ملخص یا مدعا و مقصد اور دلائل کو پُرجوش اور ولولہ انگیز انداز میں اس طرح سمیٹے اور خاتمہ کرے جس طرح ایک لائق وکیل اپنے دلائل واثبات کا اتمام کرتا ہے۔ بہترین خاتمہ تقریر کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے انگلستان کے مشہور اور ممتاز مقرر جان برائٹ، لارڈ بردوام اور ارسطو کا ذکر کرکے تقریر کے بہترین خاتمے کے لیے ابھارا ہے۔ تقریر کے حصص کے تحت مصنف نے ایک تحتی عنوان "معذرت" کے حوالے سے لکھا ہے، جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ نو آموز مقررین یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنی تقریر کے ابتدا میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ "میں تیار نہیں ہوں" اس لیے اغلاط واسقام کو نظر انداز کیجیے گا۔ چوں کہ دیر ہو گئی اس لیے میں آپ کو زیادہ زحمت نہیں دوں گا، وغیرہ۔ جب مقرر ابتدا میں اس طرح کے کلمات بولتا ہے تو سامعین کے ہاں اس کی قدر ومنزلت کم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا، مقرر کو تقریر کی ابتدا اس طرح کرنی چاہیے کہ ہر شخص کی توجہ خود بہ خود اس کی جانب مبذول ہو جائے۔

مصنف نے مقررین اور قارئین کی آسانی کے لیے "خلاصہِ کلام" کے عنوان سے ان تمام نکات کو چند صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، تاکہ ضروری اور اہم باتوں کو مقررین سہولت سے ازبر کر سکیں۔ نیز، اپنی تقریری صلاحیتوں کو بہترین نہج پر نکھار سکیں۔ علاوہ ازیں "کام یاب خطابت کے بنیادی اصولوں کو بھی انتہائی اختصار کے ساتھ بہ صورت نکات پیش کیا ہے، تاکہ مقررین و قارئین کو فنی مہارت نکھارنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرنا پڑے۔

## ۱۰۔ خواتین اور مقرر

"ریطوریقا" میں فنِ خطابت کے بنیادی عوامل کو مفصل بحث کیا گیا ہے۔ صنفی اعتبار سے خطابت کے تاثر اور تقسیم "ریطوریقا" میں شاملِ بحث نہیں ہے، جب کہ کلب مصطفٰے نے اپنی کتاب میں ایک نکتہ "عورت اور خطابت" سے معنون کیا ہے۔ مصنف نے یہ بتایا ہے کہ عورتیں بہت سی ایسی چیزوں کا ادراک بھی کر لیتی ہیں جو بہ ظاہر آسانی سے محسوس نہیں کی جاسکتیں۔ ان میں معروف تاریخی مقررات کا تذکرہ بھی کیا ہے، جنھوں نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر عالمی شہرت حاصل کی۔ ان میں "حضرت فاطمۃ الزہرا، حضرت زینب، ایران کی مقررہ قراۃ العین، ہندوستان کی مشہور مقررات مسز اینی بسنٹ، مسز سروجنی نائیڈو، مسز جے لکشمی پنڈت اور مسز کملا دیوی" شامل ہیں۔ زبان اور لہجے کی فطری نزاکت، لطافت، لوچ کے علاوہ تشبیہات، استعارات اور امثال کا استعمال جس طرح خواتین کرتی ہیں اس طرح مرد نہیں کر سکتے۔ عورتیں عام طور پر فلسفیانہ اور منطقی بحثوں سے دل چسپی نہیں رکھتیں۔ مصنف کے مطابق انھیں فی البدیہہ خطابت کو اختیار کرنا چاہیے۔ خواتین سیاسی و سماجی مسائل میں زیادہ دل چسپی رکھتی ہیں، وہ اپنی تقاریر میں ترغیبی اور تائیدی مقاصد کو ملحوظ رکھیں اور تمام تر توجہ انھی نکات پر صرف کریں۔ یہ مشورہ عورتوں کے فطری رجحان اور میلان کو دیکھتے ہوئے دیا گیا ہے۔ اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ محنت اور کوشش سے فلسفیانہ میدان میں بھی نمایاں ہو سکتی ہیں۔

## ۱۱۔ مقرر اور مصنف

"ریطوریقا" میں مصنف اور مقرر کو دو الگ شعبوں کا نمایندہ قرار دے کر ان کے دائرہ کار کو علاحدہ شمار کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بھی مصنف نے دونوں کے تفاوت کو واضح کیا ہے۔ مصنف نے "مقرر اور مصنف" کے تحت تحریر کیا ہے کہ اگرچہ مقررین اور مصنفین دونوں ایک ہی صف میں آتے ہیں، لیکن ان

میں فرق ہے۔ مصنف کسی موضوع سے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے، جب کہ مقرر کسی خاص مقصد پر ابھارتا ہے۔ مصنف کے رشحاتِ قلم عموماً عزلت اور خلوت میں پڑھے جاتے ہیں، جب کہ مقرر نے انبوہِ کثیر کے دو بہ دو ہو کر سرخ رو ہونا ہوتا ہے۔ یہ انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے مقرر کا اسلوبِ بیان غیر معمولی یاداشت کے بل پر اپنے سامعین کی ذہنی و فکری پرداخت کرنا ہوتی ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب مقرر مصنفین کی تحریر کردہ کتب کا بہ غور مطالعہ کر کے ان سے بھرپور استفادہ کر چکا ہو۔ علاوہ ازیں، ایک اچھے مقرر کو اچھے نثار کی تمام خوبیوں کو اپنانا چاہیے، نیز لکھنے کی متواتر مشق بھی کرنا چاہیے۔ اس سے اس کی خطابت میں نکھار پیدا ہو گا۔ اسلوبِ بیان تازگی، شائستگی اور عمدگی کا مرقع ہو جائے گا۔

## 12۔ جلسوں کے آئین و آداب (ضمیمہ ا)

"ریطوریقا" میں اجتماعات یا جلسوں کی اقسام اور ان کے اعتبار سے ان کے قوانین و ضوابط، اصول اور انتظام و آداب کو موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا، جب کہ "فنِ خطابت" از کلب مصطفیٰ میں ضمیمے کی ذیل میں یہ موضوع انتہائی مفصل انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ "جلسے اور ان کی مختلف شکلیں اور قواعد" کے ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جمہوری نظام میں اکثریت کی رائے معلوم کرنے کے لیے جلسوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ جلسے اور مقررین لازم و ملزوم ہیں۔ اس لیے مقرر کو جلسوں کی جملہ اقسام کا علم ہونا ضروری ہے۔

مصنف نے کتاب کے آخر میں دو ضمیمہ جات کا اضافہ کیا ہے۔ ان میں سے پہلا "جلسوں کے آئین و آداب" سے معنون ہے۔ جس میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ جمہوری نظام کی موجودگی میں کسی نظریے کی حمایت و مخالفت کو جانچنے کے لیے جلسوں کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ مقررین اور جلسے لازم و ملزوم ہے۔ اس لیے مقررین کو جلسوں کی اقسام اور ان کے اصول و قواعد سے آشنائی بہت ضروری ہے۔ لہٰذا، مصنف نے اس ضمیمے میں "جلسے، ان کی مختلف اشکال اور قواعد" کے تحت "انعقادِ جلسہ، التوائے جلسہ، ضابطہِ کارروائی، کورم، مقامی مجالس قانون ساز اور ان کے قواعد، تشکیلِ وزارت، مقامی پارلیمنٹ کا طریقِ کار، مقامی پارلیمنٹ کا صدر، مقامی پارلیمنٹ کے آداب، رائے شماری، انجمنِ مباحثہ، آئینِ مباحثہ، آدابِ مباحثہ، کمیٹی، کُل ایوان کی کمیٹی اور مجالسِ تجاویز" کے ضمن میں ان تمام نکات اور اصول و قواعد کو رقم کیا ہے جو جلسوں کی ان تمام اقسام کے لیے نہ صرف ضروری ہیں بلکہ ان پر عمل کر کے جلسوں کی تزئین و آرائش اور وقعت میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد مصنف نے انتہائی جامعیت اور اختصار کے ساتھ جلسوں کے متعلق کچھ خاص اصول و ضوابط کو پیش کیا ہے۔ ان میں جلسوں میں ترمیم کے طریقے، جلسوں کی تقسیم کے آداب، مباحثے میں مداخلت

کرنے کے طریقے اور حدود، نقطۂ اعتراض کا طریقِ کار، مباحثے کے التوا کے قواعد، مقدم مسائل کو پہلے پیش کرنے کے طریقے، تعینِ وقت اور تحریک کا اختتام کیوں کر اور کیسے ہو، احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں کیا لائحہ عمل اپنایا جائے۔ بعد ازاں، مصنف نے صدارت اور اس کے عمومی اصول و ضوابط کو واضح کرتے ہوئے صدر کی ضرورت و اہمیت کو بیان کیا ہے۔ صدر کے انتخاب کا طریقہ بتایا ہے، ہوش مندانہ انتخاب کی اہمیت، صدر کی اہلیت، اس کے حقوق و فرائض اور حقِ استرداد کے تمام زاویوں اور ضابطوں کو بیان کیا ہے۔ بعد ازاں مصنف نے "خاص و عام جلسوں کے صدر اور ان کے فرائض" کے ضمن میں صدرِ جلسۂ خاص کے فرائض اور منصب کو واضح کیا ہے۔ فرائض کی بابت بین کیا ہے کہ صدر کا فرض ہے کہ وہ مقرر کا تعارف کروائے۔ تحریک، تائید اور تردید کو اظہر من الشمس کرے۔ رائے شماری، اپنی رائے بھی پیش کرے کیوں کہ وہ خود اک رکن بھی ہے۔ علاوہ ازیں تمام ترامیم کی ترقیم کروانا بھی صدر کی زمہ داری ہے۔ اس کے علاوہ مصنف نے دعوت کے جلسوں کی صدارت کرنے والے شخص اور صدر جلسہ عام کے جملہ حقوق و فرائض اور زمہ داریاں بیان کی ہیں۔ یہ سب معلومات مقرر کے اعتماد کو مستحکم کرنے اور اس کے فن کو جلا بخشنے کے لیے ضمیمہ کی صورت درج کی گئی ہیں۔

## 13۔ تقاریر میں استعمال کیے جانے والے اشعار (ضمیمہ ۲)

"ریطوریقا" میں شعری زبان اور نثری زبان کے تفاوت کو واضح کرتے ہوئے نثری زبان کے شعری طرز پر استعمال کو مستحسن قرار دیا ہے۔ نیز موضوع کی مناسبت سے شعری حوالوں کا سہارا تقریر کے حسن میں اضافے کا سبب ہوتا ہے، تاہم مصنف کا بنیادی نکتۂ نظر نثری تقریر کو نثری زبان کے محاسن کے ساتھ پیش کیا جانا ہے۔ زیرِ تجزیہ کتاب کے دوسرے ضمیمے میں مصنف نے مختلف موضوعات کے حوالے سے کچھ اشعار درج کیے ہیں کیوں کہ دورانِ تقریر بر موقع و بر محل شعر اثر انگیزی اور دل کشی بڑھا دیتا ہے۔ مصنف نے ان اشعار کے درج کرنے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ مقرر ذوقِ سلیم کی مدد سے اپنے مطالب کی نہ صرف بہترین توضیح کر سکتا ہے بلکہ سامعین کو کسی خاص مقصد کے لیے متحرک کر سکتا ہے۔ چند اشعار بہ طور مثال ملاحظہ کیجیے:

"دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا (غالب) (۳۴)

اگر مقرر کو سامعین کی جانب سے مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے تو اس صورت حال کے مطابق اشعار یہ ہیں:

"یارب! نہ وہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے مِری بات دے
اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور" (غالب)(۳۵)

آزادیِ ضمیر اور آزادیِ تقریر یا غلامی کے خلاف مزاحمت کے لیے یہ اشعار دیکھیے:

"رہی نہ طاقتِ فریاد اور اگر ہو بھی تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے"(غالب)(۳۶)

کسی عمل پر آمادہ یا برانگیخت کرنے، غیرت دلانے کے لیے یہ اشعار دیکھیے:

"آرزو کو درپہ مقصود رہنا چاہیے آج اگر اک بات ہے دشوار، کل مشکل نہیں"(مانی جائسی)(۳۷)

جب مقرر خود اپنی بے حسی، بے کسی، بے بضاعتی، بربادی، بے خبری، محرومی کے بیان کے لیے یہ اشعار معاون ہو سکتے ہیں:

"وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا"(اقبال)(۳۸)

جب انسان دوسروں کے لیے انتہائی محنت کرے اور پاپڑ بیلے اور وہی لوگ بُرا بھلا کہنے لگ جائیں تو یہ صورت حال بہت دردناک ہوتی ہے، اس کیفیت کے اظہار کے لیے شعر اور مصرع دیکھیے:

"لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں"(غالب)(۳۹)

محولہ بالا اشعار یا اس طرح کے دیگر اشعار مقررین کو ازبر ہونا بے حد ضروری ہیں، کیوں کہ یہ مختلف کیفیات کے بہترین آئینہ دار ہوتے ہیں۔ نثر میں کوئی بات کہنے کے بجائے شاعری کا سہارا لیا جائے تو اثر انگیزی اور سحر آفرینی بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا مقرر کو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ مختلف مواقع کے متعلق اشعار یاد ہونے چاہئیں۔

ضمیمہ جات کے بعد مصنف نے اشاریہ مرتب کیا ہے، تاکہ اس کتاب کے کسی بھی موضوع یا سرخی کو بہ آسانی تلاش کیا جا سکے۔ اشاریے میں مکمل کتاب کا مالہٗ وماعلیہ مضمر ہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مقرر اس کتاب سے استفادے کے لیے مکمل پڑھ لیتا ہے اور پھر کچھ نکات پر غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ بہ آسانی نکال لیتا ہے۔

## ۵۔ "تعلیمِ تقریر"(از ابوالبیان آزاد)- تجزیہ

"تعلیمِ تقریر" فنِ تقریر کے حوالے سے ایک جامع کتاب ہے، جس کے مصنف "علامہ ابوالبیان آزاد" ہیں۔ انھوں نے فنِ خطابت کو تدریسی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ "تعلیمِ تقریر" میں سب سے پہلے تقریر کی ضرورت و اہمیت اور پھر اس فن کے بارے میں مشرق و

مغرب کے اربابِ بصیرت کی آرا، تقریر کی باقاعدہ تعریف و تشریح، اقسامِ تقریر، مختلف اقوام کے ہاں فنِ خطابت، مقصد کے لحاظ سے تقریر کی اقسام، مقررین کی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریاں، یونان و روما کے عالمی شہرت یافتہ مقررین، مقررین کی ابتدائی مشکلات اور ان کا حل، مقرر کے خصائص مختلف اقوام وماہرین کی نظر میں، جوش اور خلوص کی ضرورت، حرکات و سکنات اور کیفیات، حصولِ فن کے اہم وسائل، تقریر کی مشق اور تیاری، اس حوالے سے ماہرین کی آرا اور آخر میں مستند و معتبر مقررین کی تقاریر بہ طور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ تاکہ مقررین نہ صرف فنی خصائص پر اپنی گرفت مضبوط کر سکیں، بلکہ جب خود عملی طور پر تقاریر کا آغاز کریں تو ان نمونوں کی مدد سے اپنی تقاریر کو موثر، معتبر اور قابلِ قدر بنائیں۔

## 1۔ خطابت کا تعارف، دائرہ کار اور اہمیت

زیرِ تجزیہ کتاب میں تمہیدی طور پر خطابت کا تعارف اور دائرہ کار کو انتہائی اختصار کے ساتھ رقم کیا گیا ہے۔ جب کہ "ریطوریقا" میں نسبتاً زیادہ وضاحت اور دلائل کے ساتھ تعارفِ خطابت اور دائرہ ہائے کار کو قلم بند کیا گیا ہے۔ نیز اہمیت و افادیت کے بیان میں ارسطو نے اختصار و جامعیت سے کام لیا ہے۔ مذکورہ کتاب میں بھی اہمیت و افادیتِ خطابت کو پیش کرنے میں اختصار ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مصنف نے "تمہید" میں تقریر کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس فن کی وقعت کسی سے بھی مخفی نہیں ہے۔ نیز، اس ہنر کا دائرۂ کار ہر شعبے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ مثلاً، معلم، وکیل، واعظ، ملکی و ملی رہ نما، تاجر حتیٰ کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے، جو گفتار اور تقریر کا محتاج نہ ہو۔ معاشرے میں وہی لوگ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جو تقریری مہارت کے حامل ہوتے ہیں۔ انھی لوگوں کو معاشرہ اپنا رہ بر اور رہ نما تسلیم کرتا ہے۔ کسی قوم کی ترقی بھی مقررین پر منحصر ہوتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو اعلا مقاصد پر ابھارتا ہے۔ اسی ہنر اور صلاحیت کی بہ دولت حکومتیں مضبوط ہوتی ہیں۔ یہی فن علم کے فروغ اور حصول کا ذریعہ ہے۔ زبان کی ترویج و ترقی میں بھی تقریر ممد و معاون ہے۔ علاوہ ازیں، اس کی اہمیت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اس میں سامانِ تفریح موجود ہے۔ مقرر کے لیے تقریر نہ صرف اس کی ذاتی فرحت کا باعث ہے بلکہ سامعین بھی اس سے فرحت اور حظ حاصل کرتے ہیں۔

تقریر کی اہمیت و افادیت بیان کرنے کے بعد مصنف نے مختلف اقوام اور ان کے نابغہ روزگار شخصیات کے حوالے سے خطابت پر روشنی ڈالی۔ مصنف کے مطابق اہل عرب خطابت اور زبان دانی کو انسانیت کا طرہ امتیاز سمجھتے اور اپنی اسی مہارت کی بنا پر دیگر اقوام کو گونگا گردانتے۔ تقریر کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ایک بڑے شاعر اور حکیم شیخ سعدی کے اس شعر کا حوالہ دیا ہے:

"تا مردِ سخن ناگفتہ باشد عیب وہنرش نہفتہ باشد"(۴۰)

یہ شعر گویائی کی نہ صرف اہمیت بتاتا ہے بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ طاقتِ گفتار کا غلط استعمال انسان کے وقار کو مجروح کرتا ہے اور اس کا درست استعمال اسے معاشرے میں ممتاز بناتا ہے۔ رومی فنِ خطابت کا روشن نام سسرو کے حوالہ دیتے ہوئے مصنف نے خطابت کی اہمیت واضح کی ہے کہ جب گفت گو فنِ خطابت کے اصول و قواعد سے آراستہ ہو جاتی ہے تو اس کے اثرات اور استفادے کا دائرہ کار وسیع ہو جاتا ہے۔ لاطینی دنیا کے ممتاز خطیب کوئن ٹیلین کا تقریر کی اہمیت کے حوالے سے قول نقل کی ہے:

> "میں کہہ سکتا ہوں کہ ایک تقریر جو از حد بے التفاتی و بے توجہی سے کی گئی ہو، اگر اس تقریر میں مقرر نے خطابت کے اصولوں سے کام لیا ہے تو اس تقریر کا اثر کسی دوسری ایسی تقریر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گا۔ جس میں خطابت کے اصولوں سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ چاہے دیگر اعتبارات سے دوسری تقریر بہترین تقریر ہی کیوں نہ ہو۔"(۴۱)

مصنف نے فن تقریر کے اصولوں کو باقاعدہ سیکھنے کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ آزاد نے نو آموز مقررین کو محنت اور جدوجہد پر ابھارنے کے لیے چند عالمی شہرت یافتہ مقررین کا تذکرہ کیا ہے، جنھوں نے اپنی محنت اور کوشش سے دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان کے راستے میں بہت سے کٹھن مراحل آئے لیکن وہ گھبرائے نہیں، ڈٹے رہے، بالآخر دنیا نے ان کے فن کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان مقررین کے اسما یہ ہیں "لارڈ چیسٹر فیلڈ، مسٹر ریمزے میکڈونلڈ، مسٹر انتھونی ایڈن، ہٹلر (ڈکٹیٹر جرمنی)، برطانوی مدبر ڈسرائیلی اور سید عطاءاللہ شاہ بخاری"۔ بعد ازیں، مصنف نے تقریر کی تعریف کی ہے۔ تقریر اور عام گفت گو میں فرق بتایا ہے کہ تقریر کے دوران میں خاص لب و لہجہ، اظہارِ خیال کے لیے مخصوص اندازِ بیان، چنیدہ الفاظ و محاورات کا استعمال کیا جاتا ہے، جب کہ گفت گو میں سیدھی سادی بات چیت کی جاتی ہے۔

## 2۔ اقسامِ تقریر:

"ریطوریقا" میں طریقہ ہائے تقریر کے لحاظ سے تقسیمِ تقریر کی کوئی علاحدہ صورت نہیں ملتی۔ بلکہ بنیادی تین اقسام (سیاسی، عدالتی اور عوامی تقاریر) کے مطابق ہی طریقۂ تقریر پر بحث ملتی ہے۔ برعکس ازیں، یہاں مصنف نے طریقۂ تقریر کی بنیاد پر تقریر کی دو بنیادی اقسام بتائی ہیں، ایک Extemporaneous Speech کہا ہے، جب کہ دوسری قسم کو Studied speech کہا ہے۔ پہلی قسم میں مقرر فی البدیہہ خطابت

کے جوہر دکھاتا ہے۔ تقریر کے لیے قوتِ حافظہ کو بروئے کار لاتا ہے۔ جب کہ دوسری قسم میں مقرر تقریر سے قبل باقاعدہ اپنی تقریر تیار کرتا ہے اور پھر سامعین کے سامنے اظہارِ خیال کرتا ہے۔

یونان اور قدیم روما کے مقررین کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ اپنی تقاریر پہلے باقاعدہ لکھ کر تیار کرتے اور پھر عوام کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔ اس ضمن میں سسرو، کونٹیلین، ڈیماستھینز کا خیال یہ ہے کہ تقریر پہلے لکھ کر تیار کر لی جائے اور پھر خطیبانہ طرزِ بیان کے تحت عوام کی سماعتوں کے حوالے کر دی جائے۔ اہلِ فن کے مطابق کام یاب خطابت کا راز خطیبانہ طرزِ بیان میں مضمر ہے۔ محولہ بالا نکات کے بیان کے بعد ابوالبیان آزاد نے اپنے عہد کی تقاریر کی نوعیت بتائی ہے کہ اس وقت کے مقررین دونوں طریقہ ہائے تقاریر کو اپنائے ہوئے تھے۔ کچھ مقررین لکھی ہوئی تقاریر کو بھی اس مہارت و جدت کے ساتھ کرتے کہ لکھی ہوئی تقریر میں بھی جان پڑ جاتی۔ مصنف کے مطابق

> "آج کل تقریر کو تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، جو یہ ہیں: پہلا، وہ تقریر جو لکھ کر سنا دی جائے Studied or Written Speech، وہ تقریریں جو لکھ کر یاد کر لی جائیں اور اس انداز میں سنائی جائیں، گویا وقتی جوش کی کی بنا پر دلی امنگ سے کی جا رہی ہیں، Exptemporeneous Speeches۔ تیسرا، وہ تقریریں جو واقعتاً کسی پیشگی تیاری کے بغیر فوری امنگ یا ضرورت سے کی جائیں، Impromptu Speeches"(۴۲)

ریطوریقا میں فنِ خطابت کو تین بنیادی اقسام "سیاسی، عدالتی اور عوامی خطابت" میں منقسم کیا گیا ہے۔ برعکس ازیں، یہاں مقصد کے لحاظ سے مصنف نے تقریر کو دو بنیادی قسموں میں منقسم کیا ہے، سیاسی تقاریر اور غیر سیاسی تقاریر۔ سیاسی تقاریر کے زمرے میں پارلیمنٹری تقاریر، پبلک تقاریر، انتخابی تقاریر شامل ہیں۔ پہلی قسم میں وہ تقاریر شامل ہیں جو پارلیمنٹ سے منسلک ہیں، یہ خالصتاً سیاسی ہوتی ہیں اور پارلیمنٹ کے اصول و قواعد اور آداب میں رچی بسی ہوتی ہیں۔ دوسری قسم سے مراد وہ تقاریر ہیں جن کا تعلق براہ راست عوام سے ہے۔ تیسری قسم اہم سیاسی مقاصد کی ترویج اور اپنے رائے دہندگان کو ہموار کرنے سے متعلق ہے۔ غیر سیاسی تقاریر کے ضمن میں "مذہبی تقاریر، اصلاحی تقاریر، تبلیغی تقاریر، سوشل (سماجی) تقاریر اور علمی تقاریر" شامل ہیں۔ مذہبی تقاریر کا تعلق مذہب کی ترویج، تفہیم، تعظیم اور اشاعت سے ہے۔ اصلاحی تقاریر کا

مقصد محض اصلاح ہے۔ تبلیغی تقاریر کا مقصد غیر مذہب کے لوگوں تک اپنے مذہبی پیغام پہنچانا ہے۔ سوشل تقاریر خیر مقدم یا وداع کی تقریبات سے منسلک ہیں۔ علمی تقاریر علوم وفنون سے متعلق مخصوص تقاریر ہیں۔

## 3۔ مقرر کی ذمہ داری

ارسطو کے مطابق مقرر کو انتخابِ موضوع، بیانِ مدعا، اثباتِ مدعا اور اختتامی کلمات کہتے ہوئے کوئی فرقہ وارانہ، غیر قانونی، متعصب اور ناجائز بات یا ان میں سے کسی بھی پہلو کا پیش خیمہ بننے والی بات نہیں کہنی چاہیے۔ اخلاقیات اور تہذیب زبان وبیان کی بنیادی خوبی قرار دی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب میں بھی مقرر کی اس ذمہ داری کو صریحاً بیان کیا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق مقرر کی شخصیت ایسی ہونی چاہیے جو قابلِ مثال ہو۔ اسے تمام اخلاقی و قانونی ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ دورانِ تقریر غیر قانونی اور غیر اخلاقی باتوں سے گریز کرے۔ گویا، مقرر کی تقریر کا حرف حرف قانون اور اخلاق کا آئینہ دار ہو۔

"ریطوریقا" میں مشقِ خطابت کا علاحدہ موضوع تو موجود نہیں ہے، تاہم مقرر کے وہبی اور کسبی خصائص کے مبحث کی ذیل میں یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ فنِ خطابت صرف وہبی فن نہیں ہے، بلکہ اسے کسب کرکے اس میں ماہر و مشاق ہونا بھی ممکن ہے۔ زیر نظر کتاب میں اس نکتہ ہائے موضوع کو بالالتزام برتا گیا ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ مقرر کے پاس تقریری صلاحیت وہبی ہے جب کہ ایسا نہیں ہے۔ فنِ تقریر وہ فن ہے جو محنت و ریاضت اور مسلسل کوشش سے سیکھا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ جو فطری مقرر تو نہ تھے لیکن انھوں نے مسلسل محنت اور کوشش سے اس میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے۔ڈسرائیلی، ڈیماستھینز اور سسرو کے نام اس حوالے سے سرفہرست ہیں۔ معروف یونانی مقرر ڈیماستھینز اور اہلِ روما کے مشہور خطیب سسرو کے بارے میں مشہور ہے کہ ابتدائی دور میں وہ جب تقریر کرتا تو سامعین انھیں للکار کر بھگا دیتے، اگرچہ اس وقت بھی وہ علم وفضل کے اعتبار غیر معمولی شخصیت کا حامل تھے، تاہم اچھے طریقے سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ ان مشکلوں، پریشانیوں اور پشیمانیوں کی وجہ سے دل برداشتہ اور دل شکستہ نہ ہوئے، عملِ پیہم اور سعیِ مسلسل کی بنا پر اس فن کے امام تسلیم کیے گئے۔

## 4۔ اوصافِ مقرر:

"ریطوریقا" میں مقرر کے اوصاف کے لیے کتاب کا ایک طویل حصہ صرف کیا گیا ہے۔ نہایت مفصل اور مدلل انداز میں مقرر کے اوصاف، نوعیت، متفرق پہلو، تاثیرِ تقریر پر اثرات اور متعلقہ امثلہ کو پیش کیا گیا

ہے۔ یہاں بھی کم و بیش اسی قسم کے خصائص کو عیاں کیا گیا ہے، تاہم "ریطوریقا" کے مفصل مضامین جیسی طوالت اور وضاحت موجود نہیں ہے۔ مصنف نے مقرر کے بنیادی اوصاف کو اسلحہ قرار دیا ہے۔ ان اوصاف میں "زبان پر عبور، موضوع کا علم اور کامل شعور، بلند اور صاف آواز، شستہ سخن، آواز کا زیر و بم، شائستہ آہنگ اور خطیبانہ ترنگ شامل ہے۔ آہنگ اور آواز کا ترفع حلق اور دانتوں کی صفائی اور مضبوطی پر منحصر ہے۔ علاوہ ازیں مقرر کی گفتار لکنت سے تہی ہونی چاہیے۔

سرزمینِ عرب، جو تقریر و خطابت کا سرچشمہ ہے، وہاں کے مقررین دانتوں کی مضبوطی اور صفائی کو بے حد اہمیت دیتے۔ اس سلسلے میں زید بن جندب کا نام سامنے ہے، جو فنِ خطابت پر عبور رکھنے کے باوجود محض اس وجہ سے اہلِ عرب کا پسندیدہ مقرر نہیں بن سکا کہ اس کے دانت نہ صرف زرد تھے، بلکہ سامنے کے دانتوں میں ایک دانت زاید تھا۔ اسی طرح امیر معاویہ نے دانت گرنے کے بعد تقریر کرنا چھوڑ دی تھی۔ عرب کے ایک بڑے مقرر عبدالملک کے دانتوں میں جنبش پیدا ہوئی تو اس نے سونے کے تار سے اپنے دانتوں کو جکڑوالیا، تاکہ تقریر می رکاوٹ نہ ہو۔ سہیل بن عمرو جب اسلام مخالف تقاریر کرتے تھے۔ ایک موقع پر جب حضرت عمر کے ہتھے چڑھے، تو انھوں نے نیچے کے دانت اکھڑوادیے، تاکہ وہ اسلام مخالف تقاریر نہ کر سکیں۔ دانتوں کے علاوہ زبان کی صحت بھی خطابت کے لیے ضروری ہے۔

اہلِ عرب آواز کی بلندی کو پُر شکوہ وصف گردانتے۔ ایسے مقررین جن کی آواز پست ہوتی، انھیں حقارت کی نظر سے دیکھتے، اس لیے مقررین آواز کی حفاظت کا خصوصی خیال رکھتے تھے۔ ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ جس شخص کا منھ چوڑا ہو اس کی آواز بھی بلند ہوتی ہے اور جو شخص تنگ دہن ہو اس کی آواز بھی دھیمی ہوتی ہے۔ اس بنا پر اہلِ عرب تنگ دہن والوں کو بھی نظرِ حقیر سے دیکھتے۔

آواز کی بلندی اور خوش آہنگی کا تعلق جسمانی صحت، آلاتِ تنفس کے استحکام اور حنجرے کی ساخت سے ہے۔ مصنف کے مطابق کھلی فضا میں گہرے سانس لینے، کنویں میں منھ جھکا کر گلے بازی کرنے سے بہتری آتی ہے اور ایک خاص لوچ اور سُریلا پن پیدا ہوتا ہے۔

مصنف نے مقررین کی سخن طرازی نکھارنے کے لیے سی ہارٹلے کی آرا کو مدنظر رکھتے ہوئے مقررین کو تنبیہ کی ہے کہ وہ اپنی آواز کو بلند اور صاف بنانے کے لیے روزانہ اس طرح تقریر کی مشق کریں کہ ان کی آواز تدریجاً بلند ہو۔ آواز کے اتار چڑھاؤ یوں ملحوظ رکھا جائے کہ آواز میں تھکان کے آثار ظاہر نہ ہوں۔ ایسی تمام غذاؤں سے پرہیز لازم ہے جو حلق کی صحت کے لیے مضر ہوں اور ایسی دواؤں سے بھی گریز ضروری

ہے، جو باعثِ ضرر ہوں۔ آواز اسی صورت میں صاف اور واضح ہو سکتی ہے، جب مقرر کی ناک صاف ہو، نتھنوں میں گرد و غبار آوازِ گفتار متاثر کرتا ہے۔ حلق کی صحت کے لیے مقرر نیم گرم پانی میں نمک ملا کر روزانہ تین بار غرارے کرے اور اسی پانی سے نتھنوں کو بھی دھوئے۔ اس سے نہ صرف آواز صاف ہو گی بلکہ مضر بیماریوں سے بھی تحفظ ہو گا۔

مصنف کے مطابق مقرر کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ ایک سانس میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ کتنی طویل بات کر سکتا ہے۔ یوں اس کی تقریر کی کشش اور حُسن بڑھ جاتا ہے، نیز اس کے دلائل زیادہ موثر ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا، مقرر کو چاہیے کہ وہ اپنا سانس یا دم بڑھانے کی برابر مشق کرتا رہے۔ کیوں کہ سانس کے بل پر ہی مقرر کی تقریر کا انحصار ہے۔

مصنف کے مطابق دورانِ تقریر سوائے یورپین مقررین کے اکثر مقررین اپنے ہاتھ میں عصار کھتے ہیں۔ اہلِ عرب کے ہاں یہ رواج ہے کہ وہ دورانِ تقریر ہاتھ میں عصا یا تلوار یا اس طرح کی کوئی چیز لازمی رکھتے۔ عرب کے فصیح و بلیغ مقررین سحبان اور عبد الملک ہاتھ میں اپنا مخصوص عصار کھتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ اس کے بغیر ان کی تقریر کا استحکام ختم ہو جائے۔ یہ مقرر کے زور، جوش اور رعب میں اضافہ کرتا ہے۔

مصنف نے مقرر کی فکری سطح بلند کرنے کے لیے چند معاون نکات پیش کیے ہیں، جسے مقرر کا ذہنی اور دماغی اسلحہ کا نام دیا ہے۔ مقرر کو اپنے ملکی و قومی حالات، مسائل و وسائل کا، اپنے ملکی و ملی زعما کے معتقدات، اپنی زبان کا، زبان کی گرامر کا، جوش و خلوص کی ضرورت کا، چہرے کی کیفیات کی اہمیت کا علم ہونا از حد ضروری ہے۔ ذہنی اور دماغی بالیدگی اور نشوونما کے لیے مقرر کو مذکورہ علوم اور حالات کا علم ہونا اس کی علمی برتری اور ممایزت کا سبب بنتا ہے۔

"ریطوریقا" میں فنِ خطابت کے جملہ لوازم، علم اور مباحث و عوامل کا مفصل تذکرہ موجود ہے، تاہم تحصیلِ علم و فن کے ذرائع کا ذکر مفقود ہے۔ زیرِ تجزیہ کتاب میں مصنف نے ان ذرائع کو بھی اختصار کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جو فنِ خطابت کے تقاضوں کو پورا کرنے میں معاونت کرتے ہیں۔ کسی بھی فن کے حصول کے لیے اس کے اصول و قوائد اور وسائل و ذرایع کا جاننا ضروری ہے، اس لیے مصنف نے فنِ خطابت کے چار اہم وسائل بیان کیے ہیں، جنھیں اپنا کر ایک مقرر فنی مہارت حاصل کر سکتا ہے۔ پہلا وسیلہ "اچھے مقررین کی تقاریر کو بہ غور سننا" ہے۔ دوسرا ذریعہ 'مصنفین کی تحاریر اور مقررین کی تقاریر بہ آواز بلند پڑھنا'، تیسرا ذریعہ 'شستہ مضامین و عمدہ تقاریر کو لکھنے کی سعی کرنا'، چوتھا ذریعہ 'خود تقاریر کی مشق کرنا' ہے۔

جب کوئی نو آموز مقرر ایک ماہر اور تجربہ کار مقرر کی تقریر سنتا ہے، تو فطری طور پر اس میں بھی ماہرانہ تقریر کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ بر موقع و بر محل حرکات و سکنات بدلتی کیفیات اور علامات کے موزوں اظہار کا پتا چلتا ہے۔ آواز کا زیر و بم، تمہید، وسط اور اختتام کے موثر طریقے پتا چلتے ہیں۔ تقاریر و تحاریر کو بلند آواز سے پڑھنا فنِ تقریر کی فطری صلاحیت کو نکھارنا اور اجالنا ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ بہترین مصنفین کی تحاریر و تقاریر کو بہ آوازِ بلند پڑھے۔ عبارات کی تفہیم کے ساتھ ساتھ ان کی نئے انداز میں ترویج کے ذرایع تلاشے۔ آواز کے زیر و بم کو نکھارنے کی کوشش کرے۔ سانس پر کنٹرول حاصل کرے۔ مصنف نے ولیم کی کتاب "جمہور کی تعلیم" کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا ہے کہ

> "نوجوانوں کو اس قابل بنا دینا کافی نہیں کہ وہ مشین کی طرح پڑھنے لگیں۔ بلکہ ان کو اس طرح پڑھنے کی تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ ایسے زور اور جوش کے ساتھ پڑھ سکیں کہ ان کے چہرے اور ہاتھ پیروں کی حرکات و سکنات بھی اظہارِ مفہوم میں مدد دیں، پھر ان کو ایسی تربیت دی جانی چاہیے کہ وہ عبارتوں کے مفہوم اور اوقات کے منشا کے مطابق عبارتوں کے چڑھاؤ اتار اور سانس توڑنے اور دم لینے پر عامل ہوں۔"
>
> (۴۳)

فی الحقیقت، فنِ خطابت میں مہارت کے لیے محولہ بالا تجاویز پر عمل درآمد ناگزیر ہے۔

"ریطوریقا" کے مطابق تحریر و تقریر دو علاحدہ شعبہ جات ہیں، ایک فن میں مہارت دوسرے فن میں مہارت کا سبب نہیں۔ ان کے نوعیتِ اظہار کی طرح اسلوب و انداز بھی مختلف ہے۔ جب کہ مذکورہ کتاب کے مطابق اچھا محرر ہی اچھا مقرر ہے۔ مصنف کے مطابق مقرر کے لیے توجہ کا ایک نکتہ "اچھی تقریر اور مضمون لکھنے کی کوشش کرنا" ہے۔ جو مقرر خطابت اور انشا پردازی دونوں فنون میں مہارت رکھتا ہے، اس کے لیے تقریر کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ انشا پردازی اور مضمون نگاری کی مشق سے مقرر کو فی البدیہہ تقریر کرنے میں نہ صرف آسانی ہوتی ہے بلکہ اس کے جملے بھی پختہ، شستہ، چستہ، عمدہ اور شائستہ ہوتے ہیں۔ تحریر کی مشق تقریر کو نکھارتی ہے۔

مصنف نے سسرو، ہورٹینش، ڈیماستھینز اور ڈسرائیلی کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ ان نامور مقررین نے مشق کے بل پر اپنے فن میں مہارت حاصل کی۔ اس لیے ہر مبتدی کو فنِ خطابت کے تمام اصولوں کو پیش نظر رکھ کر تقریری صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے مسلسل مشق کی ضرورت ہے۔ اپنی تقریر کو پہلے سے لکھ کر

یاد کرے اور پھر مختصر خاکہ تیار کر کے یاداشت کے لیے اپنے پاس رکھے۔ اپنی تقریر میں کسی دوسرے مقرر کے اندازِ بیان اور معلومات کو من و عن شامل نہ کرے۔ یہ عمل اس کی اپنی شناخت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے برطانوی اخبار "پال مال گزٹ" اور ہارٹلے کے قول کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ کسی مقرر کے لیے یہ بالکل مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے صاحبِ فن کا چربہ اتارنے لگے۔ اس کو اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے اپنی شناخت بنانی چاہیے۔ علاوہ ازیں تمام قاعدوں اور ضابطوں کو بروئے کار لائے۔

"ریطوریقا" کے مطابق سامعین کی نفسیات، جذبات اور امزجہ کو سمجھتے ہوئے تقریری مندرجات اور دلائل تیار کرنا ایک کامیاب تقریر کی ضمانت ہے۔ بعینہٖ، مذکورہ کتاب میں بھی یہ بنیادی نکتہ جملہ تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ جن سامعین کے سامنے اس نے تقریر کرنا ہو، ان کے مزاج اور رواج کو اچھی طرح سمجھ لے۔ ان کی ذہنی سطح کے مطابق تقریر کرے۔ ابتدائی تقاریر کے بعد اپنے ہمدردوں سے تنقیدی رائے لے۔ جہاں تک ممکن ہو، اپنی تقریر کو تصنع اور بناوٹ سے پاک بنائے۔ ابتدا سے آخر تک موضوع کو نبھائے۔ تمام سامعین پر یکسر نظر ڈالے، کسی ایک شخص پر نظریں نہ جمائے۔ مسلسل مشق اور تقریری تجربات و مشاہدات مقرر کو خود شناسی میں مدد دیتے ہیں۔ اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ معاصرین میں اس کا کیا مقام ہے۔ اس لیے ذاتی تجربات کو بھی بروئے کار لا کر اپنی تقریری صلاحیت کو مزید نکھارنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

## 5۔ تقریر کی تیاری

ارسطو نے موضوع سے متعلق خاطر خواہ علم، جذبات و نفسیاتِ سامعین، امزجہِ حاضرین اور اپنے شخصی اوصاف کی تشکیل و تعمیر مقرر کے لیے ضروری قرار دے کر مفصل مباحث درج کی ہیں۔ تاہم اس ضرورت کی تکمیل کے طریقے زیرِ بحث نہیں لائے گئے۔ زیرِ تجزیہ کتاب میں مصنف نے مذکورہ نکات کی توضیح کے ساتھ ان کے ذریعہ ہائے تحصیل کا بھی احاطہ کیا ہے۔ مصنف کے مطابق تقریر کی تیاری مقرر کے فن کے معیاری ہونے کی دلیل ہے۔ ایک باکمال مقرر کو بھی کسی موضوع پر اظہارِ خیال سے قبل اس کے متفرق پہلوؤں کو سوچنے، تلاشنے، پرکھنے اور انھیں مرتب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصنف اپنے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک غلط نظریے کو مسترد کرتے ہیں کہ حقیقی مقرر وہی ہے، جو کسی موضوع پر برجستہ تقریر کرے اور کسی قسم کی تیاری نہ کرے۔ اگر کوئی مقرر یہ سمجھنے لگے کہ وہ فنِ خطابت میں کامل ہو چکا ہے، اب اسے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ تو اسی روز سے اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ تقریر پہلے سے باقاعدہ تیار کر

کے لکھنے اور یاد کرنے کے ضمن میں مصنف نے چند ایسے نابغہِ روزگار مقررین کا ذکر کیا ہے۔ "یونان اور روما کی شہرہ آفاق خطیب، برطانیہ کے فصیح اللساں مقرر شیریڈن، لارڈ میکالے، شیلے اور چارلیس ٹاؤن شنیڈ" یہ دنیائے خطابت کے ایسے اسما ہیں، کہ جنھیں ہمیشگی اور دوام حاصل ہے، ان کا طریقہ و قرینہ یہ تھا کہ یہ باقاعدہ لکھ کر تقاریر تیار کرتے اور بعض ایسے تھے جو اس غرض سے مطالعہ کرتے رہتے کہ انھیں کسی بھی موضوع پر تقریر کرنا پڑ سکتی ہے۔ اس لیے ان کا حافظہ شستہ جملوں، تشبیہوں، استعاروں، کنایوں، علامتوں کا گنجِ گراں مایہ تھا۔

"تقریر کی تیاری" کے سلسلے میں مصنف نے فنِ خطابت کے مبتدیوں اور طالب علموں کی صلاحیت اور استعداد کو بڑھانے، سنوارنے اور نکھارنے کے لیے چند ماہرینِ فن "لارڈ بروہم، کوئن ٹیلین، باٹین، ڈاکٹر بلیر اور پروفیسر ہارٹلے" کی تجاویز نقل کی ہیں، جو نو آموز مقررین کو اس فن کی کاملیت کی جانب گام زن کرتی ہیں۔ فنِ خطابت پر کامل دسترس رکھنے والوں کا یہ کہنا ہے کہ مقررین اگرچہ مصنفین نہیں ہوتے، لیکن انھیں مصنفین کے جملہ خصائص کو اپنانا چاہیے۔ ایک کام یاب مقرر کے لیے بہترین محرر ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ تحاریر تقاریر کو مہمیز دیتی ہے۔ اس لیے جس موضوع پر اظہارِ خیال کرنا ہو، اس کے تمام پہلوؤں اور نکات کو حوالہ جات کے ساتھ تحریر کر لینا چاہیے۔ کوئن کو ٹیلین لکھتا ہے: "قلم فنِ تقریر کا بہترین معلم ہے۔"(۴۴)

بعینہٖ "ریطوریقا" کی طرز پر "تعلیمِ تقریر" میں فنِ خطابت کے اصول وضوابط کے مطابق تقریر کو پانچ حصوں "تمہید، دعوے، دعوے کی تشریح، ثبوت و دلائل اور نتیجے" میں منقسم کیا ہے۔ ان نکات کو مد نظر رکھ کر مقررہ وقت کے تناسب سے مقرر کو تقریر کا خاکہ تیار کر کے مواد اور دلائل کو منظم کر کے تقریر کو مستحکم کرنا چاہیے۔ مذکورہ کتاب میں "ریطوریقا" میں مرقوم نکات کی طرح ہی تقریر کی طوالت اور اختصار کا انحصار موضوع کی نزاکت، وقت کی ضرورت، سامعین کے ذوقِ طبیعت اور موقع و محل کی مطابقت پر کہا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم عنصر مقرر کی فنی مہارت ہے، جس کی بنا پر وہ سامعین کی توجہ ابتدا سے انتہا تک اپنی طرف مرکوز رکھتا ہے۔

## 8۔ ماہرین کی تقاریر (نمونے)

"ریطوریقا" میں مختلف نکات کی توضیح و تشریح کی ذیل میں معروف مقررین کی تقاریر کے متعلقہ جملے یا حصے مختصراً بہ طور نمونہ و مثال پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح "تعلیمِ تقریر" میں تقریر کے تمام اصول وضوابط

کی مختصر تعلیم کے بعد نئے مقررین کی باقاعدہ تفہیم کے لیے تجربہ کار اور مایہ ناز مقررین "سرسید احمد خان، جنرل بونا پارٹ، نپولین، ترکی کے وزیر خارجہ توفیق رشدی آراس، ابوالکلام آزاد اور ابوالبیان آزاد" کی معتدل، مختصر اور طویل تقاریر درج کی گئی ہیں۔ مصنف نے ان تینوں اقسامِ تقریر کے چند نمونوں کے ذریعے مقررین پر یہ واضح کیا ہے کہ کس نوع کی تقریر میں کس قسم کے الفاظ، انداز، نکتۂ اختتام و آغاز، موضوع کے سربستہ راز اور سامعین کے مراتب اور تعظیم کو مد نظر رکھتے ہوئے تفہیمی انداز کو کیسے بروئے کار لایا جائے۔

> "شخصی عزت کا حاصل کرنا بھی قومی عزت پر موقوف ہے اور جب تک قومی ہمدردی نہ ہو، قومی عزت حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس جو لوگ قومی ہمدردی اور قومی عزت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ حقیقت میں خود اپنی ہمدردی اور اپنی عزت کی ترقی کے لیے کرتے ہیں۔ اگر یہ میرا بیان درست ہو تو اس سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو شخص اپنی عزت چاہتا ہے، اور یقین ہے کہ ہر کوئی چاہتا ہے، اس پر فرض یہ ہے کہ قومی ہمدردی اور قومی عزت کی کوشش کرے۔"(۴۵)

حقیقی عزت کے موضوع پر سرسید احمد خان کی مذکورہ تقریر اور جنرل بونا پارٹ کی صلح کے حوالے سے کی گئی معتدل اور موثر تقریر کس قدر جامع اور مدعا و مقصد کی آئینہ دار ہے، اس لیے مقررین کو معتدل تقریر کرتے ہوئے تمام اصول و ضوابط کو بر سر پیکار لانا چاہیے تاکہ مقصد میں کامیابی ہو۔

مختصر تقاریر کے ضمن میں مصنف نے نپولین اور ترکی کے وزیر خارجہ توفیق رشد آراس کی بالترتیب دورانِ جنگ اور بعد از جنگ تقاریر کو نقل کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ یہ تقاریر موقع و محل کی مناسبت سے کس قدر ابھارنے اور قائل کرنے کی صلاحیت سے معمور ہیں۔ ایک موقعے پر جنگ میں فتح کے بعد ترکی وزیر خارجہ کی مختصر، جامع اور جذبہِ حب الوطنی سے لبریز تقریر قوم میں تحفظِ ملت کے جذبات ابھارنے کے لیے بہترین تقریر تھی:

> "جب تک ترک قوم کا ایک بچہ باقی ہے، ترکی کی ایک انچ زمین پر کسی کا قبضہ نہیں ہو سکے گا۔"(۴۶)

ابوالکلام آزاد اردو فنِ خطابت کا ایک معتبر نام ہیں، جس کے فن کو ایک عالم نے سراہا۔ مقررین نے ان جیسا بننے کی خواہش کی، کیوں کہ ان کی تقریر فنِ خطابت کے اصول و قوانین کا مرقع ہوتی۔ اپنی ایک تقریر

"ایمان کی حقیقت اور اس کی شناخت" میں ایمان کی بنیاد اور اس کے تقاضوں کو دیکھیے ایک حدیث کی مدد سے کس خوب صورتی سے بیان کرتے ہیں:

> "تم میں سے کوئی آدمی مومن نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ایسا نہ ہو جائے کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولے تو میری محبت تمام محبوب انسانوں سے زیادہ ہو جائے۔ اپنے باپ سے، اپنی اولاد سے اور دین کے تمام انسانوں سے۔ اس حدیث میں ایمان کی صاف صاف نفی کر دی گئی ہے اور اگرچہ لوگوں نے اس نفی کو نفیِ کمال پر محمول کیا ہے، لیکن بھولنا نہیں چاہیے کہ صاف صاف نفی کر دی ہے۔ کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک اس کے دل و دماغ کی ایسی حالت نہ ہو جائے کہ دنیا میں انسانی محبت کے جتنے رشتے ہو سکتے ہیں، ان سب سے زیادہ اللہ کے رسول کا رشتہ ہو جائے۔ سارے رشتے اس رشتے کے سامنے ہیچ ہو جائیں۔ ساری محبتیں اس محبت کے سامنے سرد پڑ جائیں، ساری زنجیریں اس زنجیرِ عشق کی موجودگی میں بے اثر ہو جائیں۔"(۴۷)

مصنف نے یہ تقاریر درج کرنے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ مقررین ان تقاریر سے بھرپور استفادہ کریں اور اس کے علاوہ اخبار میں چھپنے والی مختلف تقاریر کو بھی اس غرض سے پڑھیں کہ وہ اپنے فن کو نکھار سکیں۔

## و۔ "فنِ خطابت"(از شورش کاشمیری)- تجزیہ

شورش کاشمیری کی کتاب "فنِ خطابت" اردو فنِ خطابت پر لکھی گئی کتابوں میں سب سے منفرد کتاب ہے، کیوں کہ یہ نظریاتی نہیں بلکہ مشاہداتی، تجرباتی اور کافی حد تک تاثراتی ہے۔ "فنِ خطابت" کا دیباچہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحریر کیا۔ ان کے خیال میں اردو میں اس عنوان پر جتنی کتب لکھی گئی ہیں، ان کا مواد انگریزی اور دیگر زبانوں سے مستعار لیا گیا ہے۔ جب کہ یہ کتاب فنِ خطابت کے موضوع پر لکھی گئی کتب کی فہرست کی رونق بڑھانے کے لیے بلکہ یہ ایک وقیع، بدیع اور مستقل کتاب ہے۔ انھی خصائص کی بنا پر اس موضوع پر کوئی دوسری تصنیف اس کے مدمقابل نہیں ہو سکتی۔ شورش ایک اچھے مقرر ہی نہیں تھے بلکہ ایک اچھے سامع اور ادیب بھی تھے۔ انھوں نے ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان اور سید عطا اللہ شاہ بخاری سے فنِ خطابت کے اسرار و رموز سیکھے اور پھر انھیں انتہائی مہارت سے مدرسانہ انداز میں "فنِ خطابت" کی صورت میں پیش کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بہ قول

> "میں اعتراف کرتا ہوں کہ شورش کی اس کتاب نے میرے دل میں بڑی جگہ بنائی

ہے اور بڑی عزت حاصل کی ہے۔ میں اس کا بے حد مداح ہوں، کیوں کہ اس کا طریقِ توضیح مدرسانہ ہے۔"(۴۸)

یہ کتاب محض فنِ خطابت کا ہی شاہ کار نہیں، بلکہ اردو زبان کے اسالیبِ بیان کا ایک بہترین مرقع ہے۔ اس میں اردو کی بہترین وکالت کی گئی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بہ قول:

"شورش کا یہ جملہ ہر اردو تحریک کا ولولہ انگیز نعرہ بننے کا مستحق ہے کہ 'اردو میں کائنات کے سما جانے کا حوصلہ ہے۔' اللہ اللہ! کیا بلاغت ہے۔ یہ ایجاز اور یہ اعجاز شورش ہی کے قلم سے ظہور پا سکتا تھا۔ مذکورہ بالا چند لفظوں میں کائنات سمٹ کر آگئی . . . شورش کی یہ کتاب اگرچہ فنِ خطابت کے بارے میں ہے، لیکن ایک لحاظ سے یہ اردو زبان کے اسالیبِ بیان کے متعلق مجموعہِ اشارات بھی ہے۔ اس میں ملک کے اردو ادیبوں انشا پردازوں، خطیبوں اور شاعروں کے خصائصِ زبان و بیان اور بلاغتوں کے لہجوں اور تیوروں کے بارے میں نہایت عمدہ نکتے ملتے ہیں۔"(۴۹)

شورش نے "فنِ خطابت" میں سات ابواب کے ذریعے بہ تدریج اس فن کے مالہٗ وماعلیہ کو بیان کیا ہے۔ کتاب کے باقاعدہ آغاز سے پہلے خطابت کے اجزائے ترکیبی، آواز، اظہار، تکنیک، اسلوب، سلاست، متانت، ظرافت، اشارات، استدلال، تجربہ، تمثیلات اور انفرادیت کو ایک چارٹ کی صورت میں تناسب کے ساتھ درج کیا گیا ہے۔ مقرر مطالعہ سے پہلے اور مطالعے کے بعد مشق کی صورت میں نتائج لکھ سکے۔ پہلی ششماہی میں ہی اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اس کی استعداد کتنی بڑھی ہے اور اس کی محنت اور کاوش کس حد تک بارآور ثابت ہوئی ہے۔

## 1۔ خطابت کا تعارف اور روایت

"ریطوریقا" میں ارسطو نے خطابت کے تعارف میں اس فن کی اجمالاً تعریف اور دائرہ کار متعین کیا ہے۔ ارسطو نے خطابت کے لوازم اور عوامل کی مدلل توضیح و تشریح کی ہے، تاہم تاریخ و روایتِ خطابت کو موضوع نہیں بنایا۔ جب کہ شورش نے خطابت کا جامع اور نسبتاً مفصل تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس فن کی مستحکم روایت اور تاریخ کو بھی جامعیت سے احاطہِ تحریر میں لایا ہے۔ ارسطو نے اپنی تصنیف میں یونانی اور یونانی مقررین مثالیں پیش کی ہیں، اسی طرح شورش نے پاک وہند کے مقررین اور اردو زبان کی امثلہ سے اثباتِ مدعا کیا۔ "خطابت" کے باب میں شورش نے سب سے پہلے خطابت کی مختصر اور جامع تعریف کی ہے۔

جب کوئی مقرر لوگوں سے اجتماعاً ہم کلام ہوتا ہے تو یہ خطابت کہلاتا ہے۔ اصطلاح میں خطابت سے مراد ترغیب و ترہیب کو مد نظر رکھتے ہوئے سامعین کے قلوب و اذہان تک اپنے مدعا و مقصد کا ابلاغ ہے۔ مصنف نے خطابت کے تین اجزا بیان کیے ہیں۔ "مقرر یا خطیب" خطابت کا پہلا جزو ہے۔ دوسرا جزو "موضوع، پیام یا مدعا" ہے۔ تیسرا جزو "سامعین و حاضرین" ہیں۔ خطابت کے آغاز و ارتقا کے بارے میں شورش کی رائے یہ ہے کہ باقاعدہ طور پر خطابت کی اسی وقت ابتدا ہو گئی تھی، جب انسان نے اپنے مافی الضمیر کا اظہار شروع کیا۔ ابلاغِ عامہ کی ابتدا تقریر ہے، اگرچہ تحریر بھی ابلاغ کا ایک ذریعہ ہے لیکن تقریر تحریر کے مقابلے میں زیادہ طویل العمر ہے۔ اولین خطبا کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ خطابت میں اولیت پیغمبروں کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں، ان پر نازل ہونے والی سماوی کتب اور صحف کا سراپا بھی خطیبانہ ہے۔ ان کے اسلوبِ بیان سے خطابت کی گونج گرج اور آہنگ کا رنگ مترشح ہوتا ہے۔ شورش نے خطابت کی روایت کی جامع صراحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ باقاعدہ اصول و قواعد کے تحت خطابت کا آغاز یونان سے ہوا۔ بعد ازیں یہ فن اوج اور تغیر کی منازل طے کرتے ہوئے روم، فرانس، عرب، انگلستان اور ہندوستان میں مروج ہوا۔

شورش نے محض دیگر اقوام کی خطابت کا تذکرہ نہیں کیا، بلکہ اپنی اردو زبان کی خصوصیت انفرادیت اور صلاحیت کو بھی طشت از بام کیا ہے۔ عربی کے بعد فارسی اور اردو کو اسلام کی تیسری بڑی زبان قرار دیا ہے۔ اردو خطابت و زبان کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "عربی کی حرارت، فارسی کی صباحت، ہندی کی لطافت اور انگریزی کی شہادت لے کر شستہ و رفتہ ہو گئی۔ تا آنکہ صوبائی زبانوں کے بعض محاورے بھی اس میں رچ بس گئے۔ جس سے یہ چیز صاف ہو گئی کہ اردو میں کائنات کے سما جانے کا حوصلہ ہے۔"(۵۰)

علاوہ ازیں، شورش کے خیال میں اردو ہی وہ واحد زبان ہے جسے آزادی سے قبل اور بعد میں وسیع ذریعہِ ابلاغ کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ آزادیِ ہندوستان اور قیامِ پاکستان کی عوامی تحاریک میں اردو ہی نے برتری حاصل کی۔ یہی اس عہد اور زمانے میں خطابت کا اظہار رہی۔

## 2۔ خطابت کی افادیت

"ریطوریقا" میں ارسطو نے فنِ خطابت کی اہمیت، افادیت اور دائرہ کار جس طرح اختصار اور اکملیت سے بیان کیا ہے، اسی طرح شورش نے بھی مذکورہ نکات کو ہمہ گیریت سے طشت از بام کیا ہے۔ شورش نے فنِ

خطابت کی تاثیر، قوت، ایجاز اور اعجاز کو واضح کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ خطابت آنِ واحد میں زمانوں کا سفر کرتی، ماضی کی جھلکیاں دکھاتی اور مستقبل کی تصویر بناتی ہے۔ یہ گردشِ زمانہ کو خاطر میں نہیں لاتی، آن کی آن میں انقلاب برپا کرتی اور صدائے واحد پل بھر میں بے شمار انسانوں کی آواز بن جاتی ہے۔ اس کی طینت میں شاعری، ساحری، مصوری اور موسیقی کے جواہر موجود ہیں۔ اس کی روح میں ایٹمی توانائی سے بھی بڑھ کر قوت موجود ہے۔ یہاں مصنف نے لارڈ سالس بری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ "دنیا آج بھی ان کے ساتھ ہے، جو بول سکتے ہیں۔"(۵۱) اپنی بات کے اثبات میں شورش نے ڈیماستھینز اور سسرو، جو یونان اور روم کے ایسے مقررین تھے جنھوں نے آفاقی شہرت حاصل کی اور اپنی صلاحیت کے بل پر امر ہوئے، کا ذکر کیا۔ ان کا رسوخ فی الخطابت دیکھیے کہ انھوں نے اس فن کے جو قاعدے، ضابطے، قرینے اور طریقے تشکیل دیے وہ آج بھی خطابت کی بنیاد، لازمہ، افشردہ اور عصارہ ہیں۔ ان کے بعد کئی ایسے خطبا اور مقررین منصہِ شہود پر آئے، جنھوں نے اپنے فن کے جوہر دکھائے لیکن ان کے طے کردہ اصول و قواعد میں قطع و برید نہ کر سکے۔ یہ ضرور ہے کہ فکر و نظر کی نئی راہیں ہموار ہوئیں، ارتقا کی تجریدی افتاد، عہود کا تنوع، صنعتی انقلاب اور سائنس کی ترقی کی بہ دولت مقررنئے موضوعات اور خیالات کی جانب مائل ہوا ہے۔

## 3۔ خطابت کے عناصر

مصنف کے مطابق خطیب تخلیقی جوہر اور اپنی مہارت کی بنیاد پر اپنا مافی الضمیر اس قرینے اور سلیقے سے ایک خاص مدعا اور مقصد کو اس طرح عوام کے قلوب و اذہان میں انڈیلتا ہے کہ خطیب کے تخیل پر ابھرنے والا نقش من و عن ہر سامع کے دل پر منقش ہو جاتا ہے۔ فی زمانہ خطابت کئی حصوں میں منقسم ہو چکی ہے۔ مذہب سے متعلق خطبا واعظ، ذاکری سے منسلک ذاکر، خطیبِ اہلِ بیت وغیرہ، اسی طرح سیاست اور عوام سے متعلق سیاسی مقررین کہلاتے ہیں۔ یہ نیا دور اور نیا زمانہ ہے، بہت سے محاورے، ضرب الامثال متروک ہو چکے ہیں، اس لیے مقرر کو اقتضائے حال کے مطابق اظہارِ خیال کرنا چاہیے۔ شورش نے خطابت کے پانچ بنیادی عناصر مطالعہ، مشق، حافظہ، زبان اور اسلوب بتائے ہیں۔ برعکسِ ازیں، ارسطو نے مذکورہ عناصر میں سے زبان اور اسلوب کو خطابت کے بنیادی عناصر کے طور پر ان کی مختلف جہات کے ساتھ مفصل پیش کیا ہے، مگر اول الذکر تین عناصر اگرچہ باقاعدہ طور پر بحث کا حصہ نہیں ہیں، تاہم ہر ذی شعور شخص یہ بات جانتا ہے کہ مطالعے، مشق اور حافظے کے بغیر زبان اور اسلوب پر دسترس ناممکن ہے۔ شورش کے مطابق خطابت کے عناصرِ خمسہ یہ ہیں:

۱۔ مطالعہ ۲۔ مشق ۳۔ حافظہ

۴۔ زبان ۵۔ اسلوب

ان پانچ عناصر پر جو مقرر محنت کرے گا، وہ بہت جلد خطابت کی دُنیا میں نمایاں مقام حاصل کر لے گا۔ مناظرین کا شمار اگرچہ واعظین میں ہوتا ہے، لیکن ایک واعظ اور مناظر میں وہی فرق ہے جو ایک مقالہ نگار اور افسانہ نگار کے درمیان ہے۔ مقرر، واعظ اور خطیب کے علاوہ کچھ لوگ محض لسان ہوتے ہیں۔ الفاظ کی روانی اور طغیانی پر ان کا انحصار ہوتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں جو گفت گو طرازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کے متعلق عوام کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ یہ بھی خطیب اور مقرر ہیں، لیکن در حقیقت یہ لوگ فنِ مکالمت کے زمرے میں آتے ہیں، خطابت کے دائرے میں نہیں۔ یہ مجمعوں کے بجائے محفلوں کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسی طرح، ایک باتونی اور گفت گو طراز شخص میں بھی تفاوت ہے۔ گفت گو طراز شخص کا انحصار مطالعے، مشاہدے اور تجربے پر ہوتا ہے، جب کہ ایک باتونی شخص بے مقصد باتیں اور چرب زبانی کرتا ہے۔ بعینہٖ، دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگ مثلاً جامعات کے بعض اساتذہ، عدالتوں کے بعض وکلا یہ اپنے موقر اور مقدس پیشے اور شعبے کے نمایندے ہیں، مگر خطیب نہیں۔

مصنف کے مطابق نئے علوم و فنون نے اگرچہ خطابت میں تنوع، وسعت اور رنگا رنگی پیدا کی ہے، لیکن فنی اعتبار سے خطابت در حقیقت وہی ہے جو ماضی میں تھی اور اسی طرح رہے گی جو آج ہے۔ خطابت انسانیت کی آفاقی سچائی سے متعلق ہے۔ یہ اپنی حالت، خصوصیت اور خصلت کی رو سے پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کی ہم عمر ہے۔ شورش کاشمیری نے پہلے باب میں انتہائی منفرد انداز میں تجرباتی و مشاہداتی علم کو بروئے کار لاتے ہوئے خطابت کی تعریف، عناصر، آغاز و ارتقا، اولین خطبا، مختلف اقوام میں خطابت اور ان کی خصوصیات، بالخصوص اردو اور اردو دنِ خطابت کے خصائص، خطابت کے کمالات، خطابت کا اطلاق، مقرر کی حیثیت، خطابت کے عناصرِ خمسہ، اصل خطیب کی شناخت کو فنی پہلو مد نظر رکھتے ہوئے طشت از بام کیا ہے۔

## 4۔ اردو کے نام ور مقررین اور ان کی ممایزت

"ریطوریقا" میں ارسطو نے اپنے دعوے کے اثبات میں یونان کے ممتاز خطبا کا بہ طور مثال جا بہ جا تذکرہ کیا ہے۔ اسی طرح شورش نے بھی اثباتِ مدعا کے لیے پاک و ہند کے ممیز مقررین کا بہ طور امثلہ تذکرہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں، شورش نے ممایزت کے حامل اردو مقررین اور ان کے خطابت میں اختصاص کو با قاعدہ اہتمام سے بیان کیا ہے۔ شورش کی کتاب "فنِ خطابت" کا تیسرا حصہ "خطیب" کے نام سے موسوم ہے۔

شورش کے مطابق خطیب کو فنِ خطابت کے میدان میں جس بنا پر شہرت اور انفرادیت حاصل ہوتی ہے، وہ اس کا منفرد اسلوبِ اظہار و تاثر ہے۔ جس کی وجہ سے کوئی خطیب اپنے ہم عصر خطبا سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس ضمن میں صاحبِ کتاب نے سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان دونوں شخصیات نے جہاد کے موضوع پر بے مثل خطابت کے جوہر دکھائے۔ تحریکِ علی گڑھ اور دارالعلوم دیوبند، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد خطابت کے تیور بدلنا شروع ہوئے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ایسا رنگ جمایا کہ ندوہ کی معرفت ارفع و اعلا مقررین منظرِ عام پر آئے۔ تحریک خلافت اور ترکِ موالات کے زمانے میں ایسے خطبا سامنے آئے جو واقعی فنی حوالے سے انفرادیت اور عمدہ صلاحیت کے حامل تھے۔ مصنف نے اردو زبان کے بے مثل اور بے نظیر خطبا کا تذکرہ کر کے فرداً فرداً ان کے اسلوبِ بیان، آواز کے زیر و بم، موضوعات کے تنوع، موضوعات پر گرفت، لہجے کی مٹھاس اور خصائص کے بارے میں بتا کر مذکورہ مقررین کی انفرادیت، ممایزت اور رفعت کو بیان کیا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، سید عطا اللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، نواب بہادر یار جنگ، سردار عبدالرب نشتر، ڈاکٹر اشرف اور مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی شامل ہیں۔

شورش نے جس طرح خطبا کا تذکرہ کر کے ان میں سے ہر ایک کے اختصاص کی نشان دہی کی ہے، بالکل اسی طرح شاعری اور شعرا کا تذکرہ کر کے ان کی خوبیوں کو بیان کرنے کے بعد یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی شے خطیب کو خطابت کے افق پر روشن اور درخشاں کرتی ہے تو وہ اس کے مافی الضمیر کے اظہار پر منحصر ہے۔ شاعری کے خصائص اس لیے احاطہِ تحریر میں لائے جاسکتے ہیں، کیوں کہ شاعر گوشہ نشینی کے عالم میں عوام سے ہم کلام ہوتا ہے۔ جب کہ خطابت قلم کے بجائے زبان سے مترشح ہوتی ہے۔ اس لیے تقریر و خطابت اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ قلم بند نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ زبان و لہجہ کے زیر و بم سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے، وہ لکھا نہیں جا سکتا "ریطوریقا" میں بھی ارسطو نے تحریر اور تقریر کو دو مختلف شعبے قرار دیتے ہوئے واضح کیا ہے کہ تقریر و تحریر کا انداز، زبان اور خصائص باہم متفرق ہوتے ہیں، لہٰذا تقریر تحریر کا مدعا اور تحریر تقریر کا مقصد پورا کما حقہٗ پورا نہیں کر سکتی۔ شورش نے خطیب کے کردار کو موضوع بنا کر یہ بتایا ہے کہ ایک بد کردار خطیب کی خطابت موثر نہیں ہو سکتی۔ "ریطوریقا" میں ارسطو نے سب سے زیادہ زور جس بات پر دیا ہے، وہ کردار اور اچھی شہرت ہے۔ اگر مقرر بد کردار، بد خصلت اور بد شہرت ہے تو اس کی تقریر کسی صورت موثر نہیں ہو سکتی،

برعکس ازیں، اگر مقرر اچھی شہرت، نیک سیرت و کردار کا حامل ہے تو اس کی تقریر میں فطری اثر پذیری اور کشش ہو گی۔ اس مضمون کو شورش یوں ادا کرتا ہے:

"خطابت کی اصل بنیاد خطیب کی سیرت ہے۔۔۔ خطابت بدن ہے تو سیرت اس کی روح ہے۔"(۵۲)

## 5۔ مقرر کے اوصاف

"ریطوریقا" میں مقرر کے وہبی و کسبی اوصاف بیان کیے گئے ہیں، شورش نے بھی اسی طرح ان خصائص کو بیان کیا ہے، جن کو اپنا کر مقرر بلند بامی اور نیک نامی حاصل کر سکتا ہے۔ "ریطوریقا" کے برعکس، شورش نے "مطالعہ اور اشارات" کو بھی اوصافِ مقرر کے ضمن میں اہم قرار دیا ہے۔

شورش چوں کہ خود خطابت کے میدان کے سربرآوردہ مقرر تھے، اس لیے ان کی اس کتاب میں ذاتی زندگی کے تجربے اور مشاہدے کی جھلک نظر آتی ہے۔ انھوں نے مقرر کے انیس اوصاف بیان کیے ہیں، جو یہ ہیں: "بے ریا کردار، بلند نصب العین، اخلاص فی العمل، صداقت شعاری، شخصی وجاہت، باخبر ذہن، نستعلیق اشارات، طلاقتِ لسانی، بے عیب آواز، صحیح تلفظ، حاضر جوابی، برجستہ گوئی، موقع شناسی، وحدتِ مقصد، ہمدردی و پامردی، مجمعے کی نفسیات سے آگاہی، مطالعے چٹک، مشاہدے کی لگن، فہمِ عامہ و مہارتِ تامہ۔" محولہ بالا بیان کردہ خصائص میں بعض خصائص وہبی ہیں اور بعض کسبی۔ ان میں سے ہر ایک مقرر کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ وہبی خصوصیات کو اپنی محنت کے بل پر بہ آسانی نکھار سکتا ہے۔

خطیب کو ممیز کرنے والی خوبیوں میں مطالعہ، تصورات، خیالات، مشاہدات اور تجربات ہیں۔ ان میں سب سے لازمی جزو مطالعہ ہے۔ ابتداً، خطیب کو ہر علم کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اس کی معلومات کا دائرہ وسیع ہو اور اس کے تصورات و نظریات مستحکم و مستحسن ہوں۔ بعد ازاں اسے محض وہی مضامین اور علوم و فنون کا بہ نظرِ غائر مطالعہ اور مشاہدہ کرنا چاہیے جو اس کی خطابت کے نکھار کا باعث ہوں۔ مقرر کو تقریر کرتے ہوئے مجمعے کی نفسیات، ترجیحات اور احساسات کو مد نظر رکھنا چاہئے کیوں کہ اسے بہ یک وقت مختلف استعداد اور طبائع کے حامل اشخاص سے مخاطب ہونا ہوتا ہے۔

"اپنی ذہانتوں اور بلوغتوں کے باوجود ایک مجمع، خطیب کے لیے بچے کی مثال ہے۔ اس بچے کو پچکارنا، سہلانا اور پھسلانا، پھر اس کا رینگنا، اس کو اٹھانا، چلانا اور دوڑانا خطابت کا جوہر ہے۔"(۵۳)

ایک کام یاب مقرر زبان و بیان پر مکمل عبور رکھتا ہے، کیوں کہ خطابت کے لیے زبان اسی قدر ناگزیر ہے، جس قدر زندگی کے لیے سانس اور روح کے لیے بدن۔ زبان پر عبور حاصل کرنے کے لیے مقرر کو تاریخ، منطق و فلسفہ، تذکرے، وقیع سوانح عمریاں، مستند سفر ناموں، سیاسی ادب، عوامی و ملکی مسائل، ثقہ اخبارات اور دین کا ہمہ جہت مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔

مصنف کے مطابق وہ کتاب لائقِ مطالعہ نہیں ہے، کیوں کہ بعض مصنفین علم و خبر اور فکر و نظر کے اعتبار سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ حلقۂ یاراں کہ بہ دولت وقتی شہرت تو پا لیتے ہیں، لیکن پھر وقت کی گرد میں گم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے مقرر کو ایسی کتب کا انتخاب کرنا چاہیے، جو زبان و بیان اور مواد کے اعتبار سے مستند ہوں۔ اردو خطابت کو فارسی اور عربی ادب سے جلا ملتی ہے۔ اردو خطابت جب عربی اور فارسی ادب سے خوشہ چینی کرتی ہے تو مزید نکھر جاتی ہے۔ اگرچہ انگریزی ایک عالمی زبان ہے، لیکن جب کوئی اردو مقرر انگریزی کتب کا مطالعہ بہ کثرت شروع کر دیتا ہے تو اس سے اس کی زبان کی ساخت و پرداخت نہ صرف متاثر ہوتی ہے بلکہ اس کی زبان میں انگریزی کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ اردو کے قدیم ادب یعنی کلاسیکل لٹریچر بالخصوص منثورات میں داستان، ناول، افسانہ، مکاتیب وغیرہ اور منظومات میں غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، ہجو، مسدس، مخمس وغیرہ کو بہ غرض استفادہ پڑھنا ضروری ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے مقرر پر نہ صرف زبان و بیان کے نئے در وا ہوتے ہیں، بلکہ مقرر کا احاطہ فکر نوادرات، قدیم و جدید خیالات، معلومات کا زبدہ اور خلاصہ ہو جاتا ہے۔ شورش نے چند بڑے مصنفین کا تذکرہ کر کے ان کے اسلوب بیان کے خصائص کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی کتب کا مطالعہ علوِ خطابت کا باعث ہے۔

اشعار کا استعمال نہ صرف سامعین کی دل چسپی کو بڑھاتا ہے، بلکہ انھیں کسی خاص مقصد پر ابھارنے کے لیے معاون ہے۔ نثر کے بجائے شاعری زیادہ پر اثر ہے، اس لیے بہترین اشعار کے استعمال سے دریا کو کوزے میں بند کیا جا سکتا ہے۔ شورش کے بہ قول

> "ایک چیز جو شاعری کے شغف سے ہر خطیب اور مقرر حاصل کر سکتا ہے، وہ خصائصِ خطابت کی بو قلمونی ہے۔ میں نے شاعری کے ذوق سے خطابت کے خصائص کا نصف حاصل کیا۔"(۵۴)

مسلسل مشق اور تجربہ خطیب کے اسلوب کو مزین کرتا ہے۔ لیکن خطابت محض اسلوب کا نام نہیں ہے، بعض خطبا محض اسلوب کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن مطالعے، مشاہدے اور تجربے سے تہی

رہتے ہیں۔ ان کا حلقۂ اثر وقیع و وسیع نہیں ہوتا۔ مصوری، شاعری، سنگ تراشی اور اس طرح کے دیگر فنون میں عوام کے سامنے محض فن پارہ ہوتا ہے، خود فن کار موجود نہیں ہوتا، جب کہ فن خطابت میں خطیب نے عوام کے سامنے موجود رہ کر اپنا لوہا منوانا ہوتا ہے، اس لیے اس کی ذات اور بات دونوں اہمیت کی حامل ہیں۔

اگر ایک خطیب کی خطابت کا دامن فصاحت و بلاغت سے خالی ہے تو پھر اس کی یہ خطابت کسی کام کہ نہیں۔ شورش نے ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، سید عطا اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ آج بھی ان کے فصاحت و بلاغت سے معمور فقرے عوام کے اذہان میں محفوظ ہیں۔ عربی خطابت نے اسی لیے ممتاز اور ممیز مقام حاصل کیا کہ وہ الفاظ کی شہ سواری اور شہ زوری، للکارِ خطابت اور پکارِ رجز کی بنا پر اس فن کو جامع الکلمات و الکمالات بناتے۔ اسٹیج کے ذریعے ہی مقرر عوام کے سامنے آتا ہے۔ یہ چوں کہ ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے، اس لیے جب تک سٹیج کا خوف مقرر پر طاری رہتا ہے، اس وقت تک وہ سہولت سے اظہارِ خیال نہیں کر سکتا۔ البتہ، تجربہ کار مقررین کو بھی ابتداً اسٹیج کی جھجھک ضرور ہوتی ہے، تاہم وہ اپنی مہارت، مطالعے اور مشاہدے کی وجہ سے اس پر نہ صرف قابو پاتے ہیں بلکہ خطابت کے ایسے جوہر دکھاتے ہیں کہ سامعین مسحور ہو جاتے ہیں۔

## 6۔ خطابت کے لوازم

شورش نے "فنِ خطابت" میں خطابت کے انھی لوازمات کو مفصل بیان کیا ہے، جو "ریطوریقا" میں ارسطو نے وضاحت سے رقم کیے ہیں۔ البتہ، شورش نے ذاتی تجربے اور مہارتِ تقریر کی بنیاد پر چند ایسے لوازم بھی زیرِ بحث لائے ہیں، جو "ریطوریقا" میں مذکور نہیں ہیں۔ ان میں "مقرر کے موضوع و مدعا اور موقعے کی مناسبت سے کیے جانے والے فطری اشارات، بیان کی انفرادیت، تقریر کی تیاری کی تفصیل" شامل ہے۔ مماثل لوازم میں "آواز، اندازِ اظہار، تکنیک، اسلوب، سلاست، متانت، ظرافت، استدلال، تجربہ اور تمثیلات" شامل ہیں۔

شورش نے اپنی کتاب کی ابتدا میں خطابت کے لوازم و خصائص پر مشتمل ایک چارٹ مرتب کیا، جس کی توضیح یہاں کی ہے۔ پہلا لازمہ 'آواز' ہے۔ عام گفتار اور خطابت میں واضح تفاوت ہے۔ آواز کا زیر و بم، صوتی سختی و نرمی اور ترتیب خطابت کا حسن اور لازمہ ہے۔ دوسری خصوصیت 'اظہار' ہے۔ مقرر کو اپنے موضوع، موقع محل اور مواد کی مطابقت سے طریقِ اظہار اپنانا چاہیے۔ اگر کوئی مقرر سٹیج پر بہترین مواد کو بھی عامیانہ انداز میں اور خطابت کے اوصاف سے مبرا ہو کر پیش کرے گا تو اس کا شان دار مواد بھی تاثیر سے تہی رہے

گا۔ لازمہِ خطابت کا تیسرا جزو 'تکنیک' ہے۔ لب و لہجے کا رنگ، معنی کی چال ڈھال اور ابلاغِ اظہار کو برتنے کا سلیقہ مقرر کی تکنیک ہے۔ آسان الفاظ میں تکنیک سے مراد مقرر اپنی بات کیسے، کس طرح اور کس ترتیب سے سامعین کے گوش گزار تا ہے۔ خصائصِ خطابت کا چوتھا حصہ 'اسلوب' ہے۔ مقرر کے اظہارِ خیال کا طریقہ، انداز، طرز اور روش اسلوب ہے۔ شورش کے مرتب کردہ اجزائے خطابت میں پانچواں نمبر 'سلاست' کا ہے۔ سلاست تسلسل، ارتباط اور روانی کا نام ہے۔ یہ وہ وصف ہے جو خطابت میں نرمی، آسانی، ہمواری، حاضر جوابی، برجستہ گوئی اور حاضر کلامی کا باعث بنتا ہے۔ چھٹا لازمہِ خطابت 'متانت' ہے۔ متانت اور سنجیدگی شائستگی کو بڑھا دیتی ہے۔ غیر سنجیدہ تقریر ایک مداری کے تماشے کے سوا کچھ نہیں، اس لیے ایک مقرر کو متانت کے ساتھ سامعین سے ہم کلام ہونا چاہیے۔ جزوِ سابعہ 'اشارات' ہے۔ جس طرح بولتے ہوئے بے اختیار ہونٹوں میں جنبش پیدا ہو جاتی ہے، اسی طرح کوئی مقرر تقریر کرتا ہے تو اس کے ہاتھ، آنکھیں اور چہرے کے تاثرات سے مختلف اشارات بے اختیار ابھرتے ہیں۔ اس سے تقریر واضح اور موثر ہو جاتی ہے۔ خاصہِ ثامنہ 'ظرافت' ہے۔ اردو میں ظرافت کا مطلب خوش طبعی جب کہ عربی میں دانائی ہے۔ ظرافت کی خوب صورتی ان مطائبات میں مضمر ہے، جس سے طبیعت خوش گوار اور سماعت کے چہرے پر مسکراہٹ کی پھوار پڑتی ہے۔ شورش کے مرتب کردہ چارٹ کے مطابق خاصہِ تسعہ 'تمثیلات' خطیب کی کہی ہوئی بات کو روزِ روشن کی طرح واضح کرنے میں معاونت کرتی ہیں۔ اظہارِ بیان اور استدلال قوت سے لبریز ہو جاتا ہے جو سمعی فرحت کا باعث بنتا ہے۔ جس خصوصیت کو دہم نمبر پر رکھا گیا ہے، وہ استدلال ہے۔ استدلال درحقیقت ضمیرِ خطابت ہے۔ بغیر دلیل کے کی ہوئی بات استحکام اور تاثر جیسی خصوصیات سے تہی رہتی ہے۔ یازدہم 'خاصیت' تجربہ ہے۔ مشق کا تسلسل اور مجمعے سے تخاطب، موضوع پر گرفت خطابت کے شباب کو دوام بخشتے ہیں۔ دوازدہم خاصہ 'انفرادیت' ہے۔ شورش کے مطابق اس خصوصیت کو متشکل اور مجسم صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ درحقیقت خطیب کی طرزِ ادا ہے جو اس کو اپنے معاصرین سے ممیز کرتی ہے۔

شورش نے کتاب کی ابتدا میں جو چارٹ مرتب کیا، اس کی وضاحت کے بعد خطابت کے دیگر خصائص کو بھی بیان کیا ہے، جن کو اپنا کر ایک مقرر چراغِ خطابت کی لو کو مزید بڑھا سکتا ہے۔ ان خصائص میں بنیادی خاصہ تیاری بہ شرط استواری ہے۔ اس ضمن میں شورش نے تیاری کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے، ایک ذہنی تیار، جس میں مقرر فکری طور پر موضوع سے متعلق اپنے ذہن میں تقریر کی بابت تمام خاکہ مرتب کرتا ہے۔ جب کہ دوسرا طریقے کے مطابق باقاعدہ ایک کاغذ پر تمام نکات اور اشارات رقم کر لیے جائیں، اس ترتیب

کے ساتھ کہ کون سی بات کب، کہاں اور کیسے کہنی ہے۔ البتہ تیاری کے بغیر خطابت نکھر نہیں سکتی، پس خطابت کے لیے باقاعدہ تیاری اور مشق لازمی ہے۔

"ریطوریقا" میں مصنف نے "تمہید" کے ضمن میں ایک مفصل بحث کی ہے۔ شورش نے بھی ارسطو کی طرح تمہید کو موثر تقریر کا پیش خیمہ قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق مقرر کو خطابت کی ابتدا اس نکتے کو مد نظر رکھ کر کرنی چاہیے کہ ابتدا کی حیثیت چہرے کی سی ہے۔ چہرہ جتنا خوب صورت اور پُر کشش ہو گا، اتنا ہی عوام کی توجہ حاصل کرنے میں کام یابی سے ہم کنار ہو گا۔ ابتدائیہ اور افتتاحیہ اگر موثر ہوں تو سامعین فوراً متحرک ہو جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں، مقرر کو اپنی تقریر کا اختتام اس خوب صورتی اور مہارت سے کرنا چاہیے کہ ابتدا سے انتہا تک کی تمام باتوں کی تصدیق ہو جائے اور کسی طرح کی تشنگی باقی نہ رہے۔

"ریطوریقا" میں سامعین کے جذبات و احساسات اور نفسیات کا مکمل ادراک مقرر کے لیے اہم قرار دیا گیا ہے۔ اسی بنیاد پر کتاب کا ایک طویل حصہ Pathos کے ضمن میں انسانی جذبات و احساسات اور ان کی نوعیت اور محرکات و اسباب کا احاطہ کرتا ہے۔ شورش کاشمیری بھی زیر تجزیہ کتاب "فنِ خطابت" میں اس نکتہِ نظر کا حامی ہے۔ اس کے مطابق، خطیب ایسے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے جن کی طبیعتیں مختلف اور فکریں متفاوت ہوتی ہیں۔ وہی مقرر کام یابی سے ہم کنار ہوتا ہے، جو اس صورت حال میں سب لوگوں کو بہ یک وقت ایک مقصد کی جانب متوجہ کرتا ہے اور ان کی تمام تر فکری جہات کو ایک نکتے پر مرکوز کر کے اپنے مدعا و مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔

"ریطوریقا" میں مقرر کے لیے دیگر نام ور مقررین کے خطبا کو پڑھنے یا سننے کو ضروری قرار نہیں دیا گیا، تاہم ارسطو کے عوامل و لوازماتِ تقریر کے اثبات کے لیے مشاہیر خطابت کی امثلہِ کثیر کے استعمال سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ مقرر کے لیے فنِ خطابت کے ماہر مقررین کو پڑھنا اور سننا اہم ہے۔ شورش کے نزدیک بھی مقرر کے فن کو نکھارنے والا امر نام ور خطبا کا مطالعہ اور مشاہدہ ہے کیوں کہ خطابت محض کتابوں کے مطالعے سے نہیں سیکھی جاسکتی۔ اس لیے نام ور مقررین کی صحبت سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔

"ریطوریقا" کے مضامین کے برعکس شورش نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر اس امر کی جانب بھی توجہ دلائی ہے کہ ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور بہادر یار جنگ کے بعد فنِ خطابت پر ان جیسی دسترس رکھنے والا کوئی نابغہ منصہِ شہود پر نہیں آیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ موجودہ عہد میں معاشی و عمرانی حوادث نے نئی نسل کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ تعلیم فزوں ہوتی جارہی

ہے اور علم گھٹتا جارہا ہے۔ خطابت کا یہ بحرانی دور، تعلیمی ارتداد اور معاشی افتاد تقریر کے عرفان کو مفقود کر چکا ہے۔ اردو اور عربی خطابت کا ماضی انتہائی شان دار اور جان دار ہے جب کہ موجودہ دور میں خطابت گردشِ زمانہ کی ستم گری کا شکار ہے۔

## 7۔ اسٹیج

ارسطو کی کتاب "ریطوریقا" میں اسٹیج کو مد نظر رکھ کر عواملِ تقریر یا اظہارِ مدعا کی تقسیم کہیں نہیں کی گئی۔ اس کی ساری بحث تقریر، مقرر اور سامعین کے گرد گھومتی ہے۔ جب کہ شورش نے اس نکتے کو مد نظر رکھ کر اسٹیج کے حوالے سے انتہائی سہل اور تدریسی انداز میں اسٹیج کے خوف اور اس پر قابو پانے کے تمام ذرائع بتائے ہیں۔ ان کے مطابق ہر مقرر کو اس ابتدائی آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں پانچ مقررین کے خیالات کا تذکرہ کیا ہے۔

> "ڈیماستھیز کے نزدیک اسٹیج کا خوف، حواس کی تپ ہے۔ سسرو کے نزدیک اعصاب کا رعشہ، چیتھم کے نزدیک سکوت کی اُثرن، گلیڈ سٹون کے نزدیک خطابت کی زچگی، البتہ برک کے نزدیک یہ خوف کی کوئی چیز نہ تھا۔"(۵۵)

جب مقرر اعتماد سے تہی اور خود پر سامعین کا خوف مسلط کر لیتا ہے تو ان دو وجوہ کی بنا پر اسٹیج سے خائف ہو جاتا ہے۔ یہ خوف اس کے حواس کو مضطرب اور اعصاب کو مضمحل اور معطل کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے خیالات منتشر اور زبان اس قدر لڑکھڑا جاتی ہے کہ حلق سے آواز تک نہیں نکلتی۔ اس سلسلے میں مقرر کا تجربہ ہی اس کے لیے مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ دو تین تقاریر کے بعد یہ خوف کم ہو جاتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جب مقرر عوام کی نفسیات اور ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھ کر تقریر کرتا ہے تو اسے داد و تحسین ملتی ہے، جس سے اس کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے، اس لیے مقرر کو چاہیے کہ مجمع کی امزجہ شناسی کو بروئے کار لاتے ہوئے خطاب کا آغاز کرے، بعد ازاں سامعین کے تیور ملحوظ رکھ کے آگے بڑھے۔ مصنف کے مطابق اسٹیج کے خوف کو ختم کرنے کا سب سے موثر ذریعہ تقریر کا خوب صورت ابتدائیہ ہے۔ ابتدائیہ جتنا خوب صورت ہو گا، سامعین کی تحسین و تشجیع اتنی ہی پُر جوش اور حوصلہ افزا ہو گی، جس سے اسٹیج کا خوف نہ صرف ختم ہوتا ہے، بلکہ خطیب کو اپنے مدعا و مقصد کی ترسیل و تکمیل میں آسانی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں، مصنف نے خطیب کے حق و فرض کو بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ خطیب کا فرض ہے کہ وہ سامعین کی منشا، رضا اور سماعت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر انھیں وہ سب معلومات پہنچائے جس مقصد کے لیے وہ اکٹھے

ہوئے ہیں، جب کہ سامعین کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مجلسی آداب کو ملحوظ رکھ کر مقرر کی باتوں کو سنیں اور تصدیق کریں۔ اگر ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کے نتیجے میں سامعین تبریک و تہنیت کے نعروں سے مقرر کو خراج پیش کرتے ہیں، جس سے اسٹیج کا خوف ختم ہو جاتا ہے۔ اسٹیج کے حوالے سے مصنف نے مقررین کے دو نقائص بیان کیے ہیں۔ اول یہ کہ مقررین اسٹیج پر آکر متعین موضوع کے متعلق سب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ دوسرے مقررین کے لیے کچھ چھوڑتے ہی نہیں۔ جب کہ دوسری یہ کہ اپنے سے اعلا و ارفع مقررین کی موجودگی میں احساسِ کم تری میں مبتلا ہو کر بہ طریق احسن اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتے۔ کیوں کہ ایک جلسے میں مختلف مقررین اور سامعین ہوتے ہیں۔ ہر سامع کی پسند دوسرے سے مختلف ہے۔ اس لیے مقرر کو عوام پر مسلط نہیں ہونا چاہیے، بلکہ دیگر مقررین کو بھی موقع دینا چاہیے۔ مقرر کا حقیقی کمال یہ ہے کہ وہ عوام کی ذہنی، فکری اور بصری توجہ کا مرکز کیسے بنتا ہے اور کب تک انھیں اپنے ساتھ شریک رکھتا ہے۔

مقرر کو ابتدائی مشکلات سے ہر گز گھبرانا نہیں چاہیے۔ مسلسل محنت اور جدوجہد بالآخر مقرر کو کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔ شورش نے اسٹیج کے خوف کے حوالے سے اپنا ذاتی تجربہ بیان کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ ادبی ذوق، شعری میلان اور لفاظی اس ضمن میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں اپنی کی گئی ایک تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس تقریر سے پہلے ان پر اسٹیج کا خوف طاری تھا، لیکن ابتدائیہ موثر و معتبر ہونے کے باعث عوام نے داد و تحسین سے نوازا، جس سے ان کا ڈر اور خوف ایسا ختم ہوا کہ انھوں نے خطابت کی دنیا میں پاک و ہند میں بہت جلد نمایاں مقام حاصل کر لیا۔

مصنف نے اپنے چالیس سالہ تجربے کی بنیاد پر نو آموز مقررین کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ ابتدائی فقرے باقاعدہ حفظ کریں، ذہنی تیاری کے حوالے سے ہر وقت تیار رہیں۔ ابتدائیہ مضبوط، پُرکشش اور دل چسپ ہو تو مقرر کا انشراحِ صدر فزوں ہو جاتا ہے۔ یہاں انھوں نے ابتدائیے کی تیاری کا تو کہا، تاہم مکمل تقریر رٹنے کی ممانعت کی ہے۔ مسلسل مشق، شتابیِ خیالات، برجستہ کلمات اور حاضر طبعی تقریر کا حسن ہے۔ مجمعے کی نفسیات کو بیان کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ "ہر مجمعے کی ایک نبض ہوتی ہے، اگر مقرر نباض ہے، عطائی نہیں تو وہ مجمعے کی نبض کو مٹھی میں لے کر مسیحا بن سکتا ہے۔"(۵۶)

جب مقرر اسٹیج پر آئے تو معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہ کرے۔ ایک کام یاب اور تجربہ کار مقرر کبھی بھی اپنی استعداد اور صلاحیت کی بابت عاجزی کا اظہار نہیں کرتا۔ اس کی تقریر سے اعتماد، استغنا، متانت و استقامت مترشح ہوتی ہے۔ اکثر مقررین محض گلا پھاڑنے کو ہی مہارتِ تقریر گردانتے ہیں، جب کہ آواز کا

زیر و بم، ملائمت و سلاست اور مٹھاس تقریر کی خوبیاں ہیں۔ صوتی مد و جزر کی بہ دولت سامعین کی توجہ مستحکم ہوتی ہے۔

مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ الفاظ کے مزاج کی باقاعدہ تفہیم حاصل کرے، کیوں کہ الفاظ کے لہجے میں فرق مطالب کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ الفاظ کے استعمال کی مہارت دانا، ادبا، شعرا، اذکیا اور طلقا کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے۔ وہبی اوصاف اکتسابی فضا میں ریاضت کی بہ دولت مہارت کے سفر پر گام زن ہو کر منزل تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ اکتساب کتابوں کے علاوہ نابغین اور ماہرین کی محافل میں شرکت سے سہل ہو جاتا ہے۔ اسٹیج کا خوف محض دو چار مجمعوں کے تخاطب ہی سے ہوا ہو جاتا ہے، اسٹیج درحقیقت مقرر کی منزل نہیں، بلکہ ایک سرائے ہے جس پر ستانے کے بعد انتہائی مہارت اور چابک دستی سے اپنے مدعا و مقصد کے حصول کے لیے آگے بڑھنا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جسے ایک جست میں طے کیا جا سکتا ہے۔

## 8۔ سلاست

"ریطوریقا" میں ارسطو نے بتایا ہے کہ مقرر کی تقریر اور اندازِ بیان منفرد مگر اتنا سہل ہو کہ سامعین میں بیٹھا ہر شخص اسے سمجھ سکے، وہ اپنے مافی الضمیر کا اظہار سلاست کے پیرائے میں کرے۔ شورش نے بھی یہی موقف اپناتے ہوئے کہا ہے کہ سلاست تقریر کا وہ وصف ہے، جو تفہیم میں نہ صرف سہولت کا باعث ہے، بلکہ اس سے خطابت نکھرتی ہے۔ شورش نے سلاست کی ذیل میں بتایا ہے کہ مقرر کی تقریر کا ہر لفظ آپس میں مربوط ہو اور بغیر کسی اٹکاؤ اور الجھاؤ کے تسلسل برقرار رہے۔ ایسے الفاظ سے گریز برتا جائے، جو تفہیم و ترسیل کے ذرایع مسدود کرے۔ اس ضمن میں خطیب برجستہ گوئی، حاضر ذہنی، حاضر جوابی اور حاضر کلامی کو بروئے کار لا کر سلاست کو مستحکم کر سکتا ہے۔ مصنف نے سلاست کو خطابت کا تنفس قرار دیا ہے۔ گویا اس کے بغیر خطابت میں جان نہیں پڑ سکتی۔ یہ خوبی مخاطبت کی راہیں ہموار کرتی ہے۔ مقرر کے خیالات و افکار کو برانگیخت کر کے بہ آسانی برنوکِ زباں لے آتی ہے۔ شورش نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ تحریری تقریریں کامیابی اور سلاست سے اس لیے ہم کنار نہیں ہو سکتیں، کیوں کہ مقرر کی ذاتی ارتجالی کیفیت مفقود ہو جاتی ہے، وہ اپنے ذہن اور خیال سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تحریر و تقریر میں فرق بتاتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ تحریر کا تعلق بصارت سے ہے اور تقریر سماعت کی محتاج ہے۔ اس لیے، شورش نے مجمعِ عام میں لکھی ہوئی تقریر کرنے کی مخالفت کی ہے۔ علاوہ ازیں، خطابت میں سلاست کو فزوں کرنے کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ صوتی عیوب و نقائص کو دُور کر کے زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل کیا جائے۔ الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے کے ساتھ ساتھ تلفظ کی

صحت کو ملحوظ رکھے۔ مقرر کے لیے لازم ہے کہ وہ لغت کا بالاستیعاب مطالعہ کرے۔ الفاظ، مترادفات، تمثیلات، روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال، لطائف، مطائبات، مرکبات، صرف و نحو کے قواعد، سلاست و خطابت کی نشوونما اور ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مقرر کا حافظہ اگر مذکورہ خصائص کا مرکز و محور ہو گا اور برموقع و برمحل ان خوبیوں کے استعمال سے واقفیت و آشنائی مقرر کو تحسین اور پذیرائی کی راہ پر گام زن کرتی ہے۔ نام ور مقررین کی سماعت مقرر کی فکری تربیت و بصیرت کو نکھار کر انفرادیت کی راہوں کی تلاش اور تعین میں ممد و معان ثابت ہوتی ہے۔ شعرا کے کلام اور قدیم و جدید ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ جدید ادبا اور شعرا خود قواعد و انشا کے اصول و ضوابط سے بے بہرہ ہیں۔ اس لیے مستند اور معتبر ادب کے مطالعے کو ترجیح دینی چاہیے۔

شورش چوں کہ خود ایک نام ور مقرر تھے اس لیے انھوں نے زیرِ تجزیہ کتاب میں ذاتی تجربات کی بنا پر اپنے خیالات اور فنی نکات کو طشت از بام کیا ہے۔ سلاست کے ضمن میں انھوں نے ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر، سید عطااللہ شاہ بخاری اور نواب بہادر یار جنگ کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ یہ مقررین ایک منٹ میں تین سو کے لگ بھگ الفاظ بولتے تھے، لیکن اس سلیقے اور شائستگی سے بولتے تھے کہ سامعین مسحور ہو جاتے۔ یہاں مصنف نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سلاست نہ تو الفاظ کی بوچھاڑ ہے اور نہ ہی طغیانی، بلکہ یہ روانی اور شگفتہ بیانی سے پروان چڑھتی ہے۔ اگر مقرر سامعین کے استرداد سے بچنے اور تحسین و داد کے حصول کا خواہاں ہے تو اسے سلاست کے اصول و ضوابط پر دسترس ضروری ہے۔ خطابت و سلاست کی بنیاد تصنع اور بناوٹ پر نہیں، بلکہ عشق پر ہے۔ کیوں کہ فن خطابت ایک فریضہ ہے، جو سامعین کی رہ نمائی سے تکمیل پاتا ہے۔ اس کے لیے عشق اور اخلاص نے حد ضروری ہے۔ خطابت وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی اور کروٹیں لیتی رہتی ہے۔ اس لیے مقرر کو وقت اور حالات کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر اپنے فن کا مظاہرہ سلاست کے پیرائے میں کرنا چاہیے۔ سلاست کی باقاعدہ تفہیم کے لیے مصنف نے اردو کے مستند اور معتبر خطبا مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطااللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی جوہر، نواب بہادر یار جنگ، مولانا احمد سعید دہلوی اور سردار عبدالرب نشتر کی تقاریر کے چند اقتباسات نقل کیے ہیں تاکہ نو آموز مقررین کو سلاست کے تقاضوں اور ضابطوں کا علم ہو سکے۔ علاوہ ازیں، مذکورہ مقررین کی سلاست و خطابت کے خصائص بھی بیان کیے ہیں۔

## 9۔ نکات و اشارات

شورش نے "نکات و اشارات" کے ضمن میں خطابت کے باسٹھ لوازم انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ "ریطوریقا" میں بھی یہ لوازمِ خطابت خاطر خواہ تفصیل و دلیل اور مناسب تماثیل کے ساتھ بحث کیے گئے ہیں۔ البتہ "مقرر کی جسمانی صحت، اشارات اور جسمانی حرکات و سکنات کے ذریعے ترسیلِ مدعا اور تنہائی میں مشقِ خطابت" ایسے لوازم ہیں جن کا ذکر "ریطوریقا" میں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں، نام ور مقررین کی تقاریر سے استفادے کا کوئی باقاعدہ اصول تو نہیں ملتا، تاہم ہر نکتے کی دلیل میں نام ور خطبا کی امثلہ اس بات کی ضامن ہیں کہ ماہر مقررین کی تقاریر سے استفادہ مقرر کو انفرادیت و ممایزت عطا کرتا ہے۔ شورش کے بیان کردہ باسٹھ لوازمِ خطابت ان کے مطابق ایسے عناصر ہیں، جن پر عبور خطیب کو خطابت کے جملہ اصول و ضوابط کا شعور عطا کرنے میں معاون ہیں۔ ان میں مصنف کے مطالعے سے زیادہ ذاتی تجربہ نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ان لوازم میں آواز کی نشوونما، چبا کر نہ بولنا، آواز کے زیر و بم کا خیال اور پُرکشش بنانے کی کوشش کرنا، نام ور مقررین کے اندازِ تقریر سے استفادہ کرنا، جسمانی صحت کا خیال رکھنا، اپنے اسلوب کو منفرد، موثر اور معتبر بنانا، تنہائی میں مشقِ خطابت کرنا، اشارات اور جسمانی حرکات فطری اور موثر بنانا، موضوع پر گرفت حاصل کرنا، مطالعے کی وسعت اور نکات کی تیاری کرنا، تحریری و تقریری صلاحیتوں کو نکھارنا، مختلف موضوعات پر قدرت حاصل کرنا، دلائل کو سہل الفہم مگر منفرد انداز میں بیان کرنا، شخصی تجربے سے سلاست کو بروئے کار لانا، انتہائی پُرکشش ابتدائیہ تیار کرنا، تدریجاً آواز میں تغیر پیدا کرنا، موضوع کے حوالے سے سامعین کی تشنگی مٹانا، ابتدائیے کی موقعے اور موضوع کے اعتبار سے تیاری کرنا شامل ہیں۔ علاوہ ازیں، ابتداً تقریری صلاحیت کے بل پر سامعین کو اپنی گرفت میں لینا، موضوع کے مطابق خود پر کیفیت طاری کرنا، اپنائیت سے مافی الضمیر کا اظہار کرنا، جلسوں میں مقرر سے قبل آنے والے کام یاب مقررین کی تقاریر سے کڑیاں ملانا، حقائق کا موثر اظہار کرنا، تقریر و تقریب کی رعایت سے علو ہمتی سے کام لینا، تصنع اور تموج سے پرہیز، تصادم سے اجتناب، تلخابہ کو شیریں بنا کر عوام کے ذہن میں اتارنا، سامعین کی ذہنی استعداد کو ملحوظ رکھنا، سامعین کے مزاج کو بھانپ کر ان سے خراج وصولی میں مہارت حاصل کرنا، ابتدا تا انتہا دل چسپی کا عنصر برقرار رکھنا، اشعار کا بر موقع استعمال کرنا اور بے جا استعمال سے اجتناب کرنا، بے محل لطائف، حکایات اور مطائبات سے احتراز برتنا، سنجیدگی اور شگفتگی میں توازن برقرار رکھنا، تخیل کی رفعت سے جدت پیدا کرنا بھی تقریری لوازم کے اہم پہلو ہیں، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گردشِ زمانہ کے مطابق تغیرِ زبان و بیان پر

نظر رکھنا اور مہارت حاصل کرنا فنِ خطابت کا بنیادی لازمہ ہے۔ بڑے مقررین کے اسلوب کی نقل کے بجائے اپنے انداز میں جدت پیدا کرنا، چرب زبانی اور لاف زنی کے بجائے فصیح البیانی سے تقریر اور اندازِ تقریر کو سنوارنا، لہجے اور اندازِ اظہار کی انفرادیت کو ملحوظ رکھ کر نکھارنا، مختلف طریقہ ہائے خطابت پر دسترس رکھنا اور ان کے مطابق لہجہ اور انداز اپنانا، سامعین کی نفسیات کو ملحوظ رکھ کر تقریر کرنا، سامعین کو ان کے ہم سفر ہونے کا تاثر دینا، معترضین کو حاضر دماغی، نرمی اور ضرورتِ جواب کے مطابق تلخ و شیریں جواب دینا، اظہارِ مدعا میں زور اور تاثر پیدا کرنے کے لیے تکرارِ لفظی سے کام لینا، استدلال اور جذبات میں توازن پیدا کر کے سامعین کو قائل کرنا، علمی صلاحیت کو مناسبتِ موقع سے استعمال کرنا، اگر کوئی واعظ ہے تو جدید وعظ کے ذرائع کو مد نظر رکھنا، سامعین کے دلوں میں گھر کرنا، الفاظ کے مناسب استعمال کا ہنر سیکھنا، اخبار کا مطالعہ کرنا، حافظے کو مستحکم کرنا، سریع الفہم مگر منفرد استعارات و تشبیہات کا استعمال کرنا، زبان و بیان پر عبور رکھنا، برتر شخصیات کے غیر شعوری رعب پر قابو پانا، مختلف النوع خطابت کے مطابق علمی اور تقریری و تحریری استعداد بڑھانا اور نکھارنا لوازماتِ خطابت ہیں، جو ایک مقرر کو میدانِ خطابت میں کام یاب اور ممتاز بناتے ہیں۔

## 10۔ زبان و بیان

"فنِ خطابت" کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں سے شورش کی کتاب اس لیے بھی انفرادیت کی حامل ہے کہ اس میں زبان و بیان کی تفصیل وضاحت اور تمثیل کے ساتھ ملتی ہے۔ "ریطوریقا" میں زبان و بیان پر دسترس کی اہمیت کے ضمن میں زبان کے درست، سلیس، تمثیلی اور بدیہی استعمال کو جس طرح بیّن کیا ہے، اسی طرح شورش نے بھی اردو زبان کو مد نظر رکھتے ہوئے زبان و بیان کے مذکورہ پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ شورش نہ صرف بلند پایہ خطیب تھے بلکہ اپنے زمانے کے معروف اور معتبر رسالے چٹان کے مدیر ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد شاعر اور ممتاز ادیب بھی تھے۔ اس لیے انھوں نے زبان و بیان کے ضمن میں خطبا کی اغلاط و اسقام کی نہ صرف نشان دہی اور تصحیح کی ہے، بلکہ مختلف حوالوں سے اردو زبان کی عزوبت، وسعت، قدر و منزلت کو بہ طریق احسن بیان کیا ہے۔

اردو خطابت میں بلند بامی اور نیک نامی کے لیے اردو زبان پر کامل دسترس اور مہارت ناگزیر ہے۔ اس ضمن میں قواعدِ زبان کا مطالعہ، ادبی محافل میں شرکت، شاعروں اور جیّد عالموں کی صحبت، مستند اور معتبر ادبی کتب کے مطالعے کی کثرت زبان و بیان پر مہارت میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

شورش نے بابائے اردو مولوی عبد الحق کی تصنیف "قواعدِ اردو" اور علامہ برجموہن دتاتریہ کی تالیف "کیفیہ" کا مطالعہ خطبا کے لیے ناگزیر قرار دیا ہے۔ یہ وہ کتابیں ہیں، جن کی مدد سے زبان و بیان کی تصحیح اور مخلوقات کی مختلف کیفیات، جذبات، حسیات اور اصوات کے بیان کے لیے متنوع، مناسب اور خوب صورت الفاظ ملتے ہیں۔ جس سے زبان و بیان اور اسلوب کثیر الجہت خصائص سے مزین ہوتا ہے۔ خطابت کا حسن سلاست اور آواز کا زیر و بم ہے۔ اس لیے مصنف نے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقاریر کے پانچ اقتباسات نقل کیے ہیں۔ تاکہ نو آموز مقررین زبان و بیان کے جملہ محاسن پر عبور حاصل کر سکیں اور معائب سے گریز برتیں۔ شورش نے آزاد کی تقاریر میں موجود صوتی آہنگ، ترنم، شاعرانہ تموج، الفاظ و تراکیب کے انتخاب، جملوں کے باہمی ربط، مواد کی ترتیب، لب و لہجے کے استحکام اور گرج اور کہیں دردمندانہ رنگ و آہنگ کی نشان دہی کی ہے۔

آواز و زبان خطابت کی اساس اور بنیاد ہیں۔ مطالعہ خطابت کی تزئین و آرائش میں مدد دیتا ہے۔ تجربہ اور مشاہدہ خطابت کو مزید نکھار کر مطالعے اور فکر میں ہم آہنگی اور تناسب تشکیل دیتا ہے۔ خطابت کا دائرہ کار وسیع ہونے کی وجہ سے ہر موضوع کا احاطہ کیے ہوئے ہے، اس لیے مقرر کو ہر شعبہِ زندگی کے بارے میں علم و آگہی بہت ضروری ہے۔ مذہبیات، سماجیات،، نفسیات، طبیعات، ادبیات، اقتصادیات، شخصیات یعنی زیست کے ہر پہلو کی بابت تالیفات اور تصنیفات کا بالاستیعاب مطالعہ خطابت کی نشو و نما، استحکام اور نکھار کا باعث بنتا ہے۔

## ماحصل

"ریطوریقا" فنِ خطابت کی ابتدائی کتب میں معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ متقدمین اور متاخرین اس سے مستفید و مستفیض ہوئے۔ اس کے بعد فنِ خطابت پر جتنی کتب لکھی گئیں ان پر اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ فنِ خطابت کی اردو کتب کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ فنِ خطابت کے جو خصائص ارسطو نے اُس دور میں بیان کیے، آج بھی معمولی سی تبدیلی اور وقت کی ضرورت کے تحت سرسری تغیر کے ساتھ مروج و مستعمل ہیں۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد لکھی جانے والی کتب میں آج بھی مصنفین نے اس فن کا تعارف اسی طرز پر وقت کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے کروایا، جس طرح ارسطو نے اپنی کتاب میں اس فن کو متعارف کروایا تھا۔ فنِ خطابت کی افادیت اور دائرہ کار جس طرح ارسطو نے متعین کیا تھا، آج بھی یہ فن اسی طرح زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کیے

ہوئے ہے۔ اس لیے اردو فنِ خطابت پر قلم اٹھانے والوں نے بھی یہی موقف بیان کیا ہے اور اپنی کتب میں اس فن کی افادیت آج بھی معمولی رد وبدل کے ساتھ طشت از بام کی ہے، جس طرح ریطوریقا میں مترشح ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "ریطوریقا" میں اگرچہ تحریر کی اقسام کو تین حصوں "عدالتی، سیاسی اور عوامی تقاریر" میں منقسم کیا گیا ہے۔ جب کہ اردو مصنفین نے اپنے عہد اور سماج کی ضرورت، رجحان اور پہلو ہائے حیات میں وسعت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے کئی ذیلی حصوں میں منقسم کیا ہے، لیکن تقریر کی بنیادی اقسام اہلِ فن کے نزدیک وہی ہیں۔ فنِ خطابت کی اردو کتب کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ آج سے کئی صدیاں قبل لکھی گئی تصنیف "ریطوریقا" میں بیان کی گئی تقریر کی خصوصیات، ان کی نوعیت اور اثرات اسی طرح مسلّم ہیں۔ ان کتب میں خصائصِ تقریر کا گوشہ آج بھی ریطوریقا کے اثر سے تہی نہیں ہے۔ محولہ بالا حوالہ جات کی بہ دولت یہ امر اب مخفی نہیں رہا۔ تقاریر کی مختلف اقسام میں استدلال کی ضرورت، اہمیت، افادیت اور اثر کی بابت "ریطوریقا" میں جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا گیا، اردو مصنفین نے بھی اسی طرح اثباتِ دعویٰ میں دلائل کی نوعیت وہیت اور اثرات کی وضاحت کی ہے۔ "ریطوریقا" میں مقرر کے وہبی و کسبی خصائص کی ذیل میں شخصی و کرداری اور فن کے لحاظ سے مطلوبہ اوصاف کو تفصیل و تمثیل کے ساتھ منصہِ شہود پر لایا گیا ہے۔ یہ خصائص مقرر کی شخصیت کے نکھار اور اس کی تقریر کے تاثر و اظہار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ خطابت پر لکھی گئی اردو کتب میں مذکورہ خصائص کو اور انھی بنیادوں پر اپنی سماجی روایات، مذہبی ترجیحات، اخلاقی اقدار، قومی و ملی رجحانات اور عصری میلانات کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کی مزید خصوصیات کو بھی شاملِ بحث کیا گیا ہے۔ "ریطوریقا" میں تقریر کے عناصرِ ترکیبی "تمہید، مدعا، اثباتِ مدعا (دلائل) اور اختتام" بیان کیے گئے ہیں۔ نیز، ان عناصر کو برتنے اس موضوع پر مرقوم اردو کتب میں بھی یہی عناصر بعینہٖ عصری اور موضوعی تقاضوں کے مطابق ملتے ہیں۔ "ریطوریقا" میں زبان و بیان کو موثر تقریر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ارسطو نے یہ حقیقت اظہر من الشمس کی ہے کہ زبان کے درست، مناسب، مہذب، آسان اور بر محل استعمال اور علمِ بیان و بدیع کے محاسن سے تقریر کو موثر، مزین و مستحسن کیا جا سکتا ہے۔ زیرِ تجزیہ کتب میں بھی کہیں مفصل اور کہیں مجمل انداز میں زبان و بیان کی اہمیت اور اس کے استعمال کی نوعیت و کاملیت کو واضح کر کے نو آموز مقررین کو یہ بتایا گیا ہے کہ زبان و بیان پر خاطر خواہ دسترس سامعین کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اردو فن خطابت پر تحریر کردہ کتب ریطوریقا سے تہی نہیں ہیں۔ لیکن، ان کتب میں عصری، سماجی اور مذہبی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے "ریطوریقا" کے برعکس بھی کچھ نکات شامل کیے گئے ہیں، جن میں سر فہرست "خطابت کی روایت" ہے۔ اس روایت کو مستحکم انداز میں کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً قلم بند کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، یونانی مشاہیر خطابت کے خصائص اور طریقہِ تقریر کے بیان کے ساتھ سماجی اور زبانی تقاضوں کے مطابق ان کتب میں کہیں کہیں اردو مقررین اور مذہبی و ملی تقاضوں کے مطابق انبیا اور صحابہ کرام کا تذکرہ اور امثلہ ملتے ہیں۔ ابوالبیان آزاد اور شورش کے ہاں انبیا و اصحابِ انبیا اور اردو مقررین کی تقاریر اور اختصاصِ تقریر پر مفصل اور مدلل بحث موجود ہے۔ طریقہِ تقریر کے ضمن میں اقتضائے حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنفین نے فی البدیہہ کے علاوہ تقریر کے "تحفیظی اور تحریری" طریقہ ہائے کار متعارف کروائے ہیں۔ تاکہ مقررین، بالخصوص نو آموز مقررین، اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکیں۔ کیوں کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس قدر وسعت در آئی ہے کہ ایک موضوع کے کئی پہلوؤں کے علم کو منطقی ترتیب سے صفحہِ ذہن میں محفوظ رکھنا اور کہیں بھی، کبھی بھی ان سے منطقی دلائل بنا کر اثباتِ مدعا کرنا بعض صورتوں میں مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، مذکورہ دو طریقے ایسی صورت حال میں شرمندگی اور سُبکی سے بچانے میں معاونت کرتے ہیں۔

شورش اور سید کلب مصطفٰے نے اسٹیج کے خوف اور مقررین کو اس خوف پر قابو پانے کے ذرائع اور طریقوں سے آگاہ کیا ہے۔ تاکہ وہ بہ آسانی، بے خوف و خطر اظہارِ مدعا کر سکیں۔ فنِ خطابت کی اردو کتب میں مقرر کی جسمانی صحت اور ظاہری شخصیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس امر کی نشان دہی کی گئی ہے کہ مقرر کے بارے میں اس کی ظاہری شخصیت کی بنا پر قایم کی جاتی ہے۔ سامعین کی توجہ کی پہلی بنیاد ہی مقرر کی ظاہری حالت و شخصیت ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک مقرر جسمانی لحاظ سے صحت مند نہیں ہو گا وہ تقریر کو مطلوبہ تقاضوں کے مطابق نہیں کر پائے گا۔ حرکات و اشارات جذبات و خیالات کی تحریک اور مدعا کی ترسیل میں معاونت و استعانت کرتے ہیں۔ موضوع کے مطابق مقرر کے چہرے، سراپے اور اشاروں سے وہی کیفیت عیاں ہونی چاہیے، جو وہ بیان کر رہا ہے۔ اس لیے ان مصنفین نے اوصافِ مقرر میں "فطری اشارات اور حرکات و سکنات کے ذریعے ترسیلِ مدعا" کا اضافہ کیا ہے۔

# حوالہ جات


۱. شمس الدین احمد، خواجہ، خطابت و تقریر، نامی پریس، لکھنو، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۲۔
۲. شمس الدین احمد، خواجہ، خطابت و تقریر، ص ۲۔
۳. محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۲۷۔
۴. شمس الدین احمد، خواجہ، خطابت و تقریر، ص ۶۔
۵. ایضاً، ص ۸۔
۶. ایضاً، ص ۱۱۔
۷. ایضاً، ص ۱۳، ۱۲۔
۸. ایضاً، ص ۱۳۔
۹. ایضاً، ص ۱۵۔
۱۰. ایضاً، ص ۱۷۔
۱۱. ایضاً، ص ۱۹
۱۲. ایضاً، ص ۲۵۔
۱۳. ایضاً، ص ۲۸۔
14. https://www.facebook.com/qazi.nafees.75
۱۵. فن تقریر، ادارہ ادبیات اردو، خیرت آباد، ۱۹۴۰ء، ص ۳۳، ۳۲۔
۱۶. فنِ تقریر، ادارہ ادبیات اردو، ص ۴۰۔
۱۷. ایضاً، ص ۵۸۔
۱۸. ایضاً، ص ۵۸۔
۱۹. ایضاً، ص ۷۰۔
۲۰. ایضاً، ص ۷۱۔
۲۱. ایضاً، ص ۷۴۔
۲۲. ایضاً، ص ۷۸۔
۲۳. ایضاً، ص ۸۵۔
۲۴. نذیر الدین احمد، رموزِ خطابت، انجمن نشاط علم و ادب، حیدرآباد دکن، ستمبر ۱۹۵۲، ص ۱۔
۲۵. نذیر الدین احمد، رموزِ خطابت، ص ۴۔
۲۶. ایضاً، ص ۱۵۔

۲۷. ایضاً، ص۴۰۔

۲۸. ایضاً، ص۴۷۔

۲۹. ایضاً، ص۵۷۔

۳۰. ایضاً، ص۶۳۔

۳۱. ایضاً، ص۷۴۔

۳۲. کلب مصطفٰے، سید، فنِ خطابت، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۵۷ء، ص۲۵۔

۳۳. ایضاً، ص۱۹۷۔

۳۴. ایضاً، ص۲۵۷۔

۳۵. ایضاً، ص۲۵۸۔

۳۶. ایضاً، ص۲۵۹۔

۳۷. ایضاً، ص۲۶۰۔

۳۸. ایضاً، ص۲۶۰۔

۳۹. ایضاً، ص۲۶۷۔

۴۰. ابوالبیان آزاد، علامہ، تعلیم تقریر، ادریس المطابع، دہلی، س ن، ص۹۔

۴۱. ابوالبیان آزاد، علامہ، تعلیم تقریر، ص۱۰۔

۴۲. ایضاً، ص۱۸۔

۴۳. ایضاً، ص۴۱۔

۴۴. ایضاً، ص۵۲۔

۴۵. ایضاً، ص۵۷۔

۴۶. ایضاً، ص۵۹۔

۴۷. ایضاً، ص۶۴۔

۴۸. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، الفیصل ناشران، لاہور، س ن، ص۱۱۔

۴۹. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۱۲۔

۵۰. ایضاً، ص۲۰۔

۵۱. ایضاً، ص۲۱۔

۵۲. ایضاً، ص۳۴۔

۵۳. ایضاً، ص۳۷۔

۵۴. ایضاً، ص۴۵۔

۵۵. ایضاً، ص۵۵۔

۵۶. ایضاً، ص۶۱۔

# باب سوم

# اردو میں خطابت کے عناصر و اسالیب

## الف۔ خطابت میں فصاحت و بلاغت

فصاحت عربی زبان کا لفظ ہے، جو اپنے دامن میں خوش کلامی، شگفتہ بیانی اور کشادہ سخنی جیسے الفاظ سموئے ہوئے ہے۔ اصطلاح میں، ایسا کلام جو مستند اہلِ زبان کی پیروی سے آراستہ اور علم صرف کے اصول و قواعد سے مزین، مشکل تراکیب، اجنبی الفاظ، بعید از فہم محاورات سے مبرا ہو، فصاحت کہلاتا ہے۔ اس کا تعلق الفاظ سے ہے۔ ذیل میں فصاحت کی چند تعریفیں رقم کی جا رہی ہیں، جن کی بہ دولت فصاحت کے مفہوم کو سمجھنے میں آسانی اور سہولت ہو گی۔ سجاد مرزا بیگ دہلوی اپنی تصنیف "تسہیل البلاغت" میں فصاحت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ایسا کلام جو اہلِ زبان کے روزمرہ کے موافق اور تنافرِ حروف، غرابت، مخالفت، قیاسِ لغوی اور تحوی اور تعقید وغیرہ تمام عیوبِ کلام سے پاک ہو، کلامِ فصیح کہلاتا ہے اور کلام کے اس وصف کو فصاحت کہتے ہیں۔"(۱)

نجم الغنی خان نجمی رامپوری نے "بحر الفصاحت" میں فصاحت کو درجِ زیریں الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "فصاحت کلمہ اور کلام دونوں میں پائی جاتی ہے۔ یعنی کلمہ بھی فصیح ہوتا ہے اور کلام بھی۔ کلمے کی فصاحت یہ ہے کہ اس میں جو حروف آئیں، ان میں تنافر نہ ہو اور مخالفت، قیاسِ لغوی اور غرابتِ لفظی سے پاک ہو۔ نہ ایسا ہو کہ اس کے سننے سے کراہت معلوم ہو۔ کلامِ فصیح وہ ہے جو ضعفِ تالیف، تنافرِ کلمات، تعقیدِ لفظِ واحد کی کثرت، تکرارِ بے درپے اضافت، ابتذال، تغیرِ اثقال، تناقض وغیرہ عیوب نہ رکھتا ہو۔"(۲)

محولہ بالا تعریفات اور حوالہ جات کی مدد سے فصاحت کا لغوی اور اصطلاحی دائرہ کار مترشح ہوا ہے۔ لیکن، علامہ برجموہن دتاتریہ اپنی کتاب "کیفیہ" میں فصاحت کی جو تعریف کرتے ہیں، وہ انتہائی عام فہم ہے، جس سے فصاحت کا مفہوم مزید نکھر کر سامنے آتا ہے:

> "فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو منشی یا متکلم کے ذہن کے

قریب پہنچادیتا ہے۔"(۳)

ماہرین نے فصاحت کا ایک باقاعدہ معیار مرتب کیا ہے، اس کے خصائص کو اہتمام کے ساتھ طشت از بام کرنے کے علاوہ معائب کو بھی عیاں کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھی الفاظ کو ترجیح دی گئی ہے، جو ادق، پیچیدہ، نامانوس اور بعید از فہم نہ ہوں، جو زبان کے قواعد سے نہ ٹکراتے ہوں۔ اہلِ زبان کے متعین کردہ اصول و ضوابط اور نظامِ لفظ و معنی کو مد نظر رکھتے ہوئے تحریر و تقریر میں الفاظ اور جملوں کو برتنا فصاحت ہے۔ ان تمام معائب سے بہ اہتمام گریز برتا جائے۔ وہاب اشرفی نے فصاحت کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں کی ہے:

"لفظ میں جو حروف آئیں ان میں تنافر نہ ہو، الفاظ نامانوس نہ ہوں اور قواعد حرفی کے خلاف نہ ہوں۔ دراصل مستند اہلِ زبان کی سند ہی کسی لفظ کو وضاحت کا اشارہ دے سکتی ہے۔ گویا لفظ کو مخصوص اعتبار اور معیار کے ساتھ دیکھنا فصاحت ہے۔"(۴)

متکلم مبہم اور مہمل جملوں سے اپنے کلام کو دانستاً تہی کرے۔ اپنے سامعین کو اس ضمن میں کسی آزمائش میں مبتلا نہ کرے۔ ان کی فکری و ذہنی استعداد سے ماورا الفاظ و تراکیب استعمال نہ کرے۔ ایسی تشبیہات و تمثیلات جو ان کے تفہیمی راستے میں اٹکاؤ اور الجھاؤ کا باعث ہوں، ابلاغ و ترسیل کی راہیں ہموار کرنے کے بجائے مسدود کرتے ہوں، حلقۂ تفہیم کو محدود کرتے ہوں، سے مکمل اجتناب برتے۔ بلاغت وہ علم ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اپنے مخاطبین، سامعین اور قارئین سے کس طرح کلام کرنا ہے۔ ان کے سامنے کون سے نکات رکھنے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی پسند و ناپسند کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے۔ ان کے سامنے وہی باتیں بیان کی جائیں جو ان کے دل کو بھلی معلوم ہوں۔ ان کا ذوقِ طبع خوش دلی سے قبول کرے اور ایسی باتوں کو خارج از سخن کر دینا چاہیے جو ان کی طبیعتِ خاطر پر گراں گزریں، ان کا دل و دماغ اس جانب سُرعت کے ساتھ مائل ہونے سے کتراتا ہو بلکہ رُجعت و ترجیع کو ترجیح دے۔ ایسی باتوں کو اولیت دینی چاہیے، جن کی ضرورت، اہمیت اور قدر و منزلت سب سے زیادہ ہو۔ اس کے برعکس ایسی تمام باتیں، جو کم اہمیت کی حامل ہوں، انھیں آخر میں بیان کیا جائے اور اہتمام کے ساتھ غیر ضروری کلام سے گریز برتا جائے۔ وہاب اشرفی بلاغت نے اپنی تصنیف "البلاغت" میں بلاغت کی توضیح ان الفاظ میں کی ہے:

"بلاغت کا تعلق مہمل گوئی سے نہیں ہے۔ وہ کلام جو دوسروں تک مرتبۂ کمال کے ساتھ ترسیل کا فرض انجام دے، اس پر بلاغت کا اطلاق ہو گا۔"(۵)

ارسطو نے اپنی کتاب "ریطوریقا" کے تیسرے حصے میں تقریر کو موثر بنانے کے لیے فصاحت و بلاغت کے ضروری نکات کو قابلِ تفہیم بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے مطابق تقریر اسی وقت اثر انگیز ہو سکتی ہے، جب وہ منطقی ربط و ضبط اور پُر اثر ترسیلِ مدعا کی آئنہ دار ہو۔ خوب صورت تشبیہات اور استعارات کا استعمال، مہذب، مناسب، عام فہم اور مروجہ الفاظ کا بر موقع و بر محل استعمال، زبان پر کامل دسترس، شعری و نثری زبان کے جملہ خصائص، رواں اور سہل زبان وہ خصائص ہیں جو تقریر کے حُسن و تاثر کو دوام بخشتے ہیں، جن کی بہ دولت مقرر اپنے فن کو جلا بخشتا ہے۔ یہ جلا فصاحت و بلاغت کے اسرار و رموز میں مضمر ہے، جن سے آگاہی اور آشنائی مقرر کی پذیرائی میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ ارسطو کے مطابق خطابت در حقیقت فصاحت اور بلاغت کا بہترین مرقع ہے۔ خطابت انھی دونوں ذرائع کی بہ دولت پروان چڑھتی ہے۔ تقریر کی تاثیر فزوں کرنے میں فصاحت و بلاغت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہمیں یہ دونوں لفظ اکثر و بیشتر بہ صورت مرکب عطفی اکٹھے نظر آتے ہیں۔ مقرر کے لیے فصیح و بلیغ ہونا اتنا ہی ناگزیر ہے جتنا جسم کی حرکت اور فعال ہونے کے لیے روح کی ضرورت ہے۔ فصاحت اور بلاغت پر دسترس اور مہارت مقرر کو نہ صرف کام یابی سے ہم کنار کرتی ہے، بلکہ اس سے مدعا و مقصد سے اس کے سامعین بہ طریق احسن مستفید و مستفیض ہوتے ہیں۔ یہی وہ سرچشمہ ہے، جس سے خطابت پھوٹتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انھی مقررین کو فن خطابت کے میدان میں عظمت و رفعت، قدر و منزلت اور دوام حاصل ہوا جو ان دونوں خصوصیات سے متصف تھے۔ ہر زبان کے مقرر کو فصاحت و بلاغت کے جملہ رموز و اسرار سے مکمل آشنا اور آگاہ ہونا چاہیے، تاکہ وہ اس فن میں قابلِ ذکر کام یابی و کامرانی حاصل کرے۔

> "Style to be good must be clear, as it proved by the fact that speech which fails to convey a plain meaning will fail to do just what speech has to do. It must also be appropriate, avoiding both meanness and undue elevation... People do not feel towards strangers as they do towards their own countrymen, and the same thing is true of their feeling for language. It is therefore well to give to everyday speech an unfamiliar air; people like

what strikes them, and are struck by what is out of the way."(۶)

فصاحت و بلاغت دراصل علمِ بیان، علمِ بدیع اور علمِ معانی سے پروان چڑھتی ہے۔ ان تینوں علوم سے آشنائی مقرر کی فکری و فنی صلاحیتوں میں نکھار کا باعث بنتی ہے۔

**1۔ علمِ بیان:**

علمِ بیان وہ علم ہے جس سے بیان کو تقویت ملتی ہے۔ ایک موضوع اور خیال کو مختلف طریقے سے برتنے اور بیان کرنے کا ڈھنگ اور قرینہ پتا چلتا ہے۔ خطابت کا تعلق چوں کہ اظہار و بیان سے ہے، اس لیے جب تک مقرر کو علمِ بیان پر مہارت و دسترس حاصل نہیں ہو گی تو وہ اپنے موضوع کے اظہار میں کسی ندرت و جدت کا مظاہرہ نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ یہی وہ علم ہے جس پر دسترس کی بہ دولت مافی الضمیر کے اظہار کے نہ صرف نئے در وا ہوتے ہیں، بلکہ مقرر کی تقریر بھی دل پذیر ہو جاتی ہے۔ میر انیس کے بہ قول

"گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں"(۷)

اس علم کا خاصہ ہے کہ یہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ اصول و قواعد اور اسرار و رموز کون سے ہیں، جن کو اپنا کر ایک بات کو مختلف قرینوں اور ذریعوں سے اظہار کیا جاتا ہے۔ نیز ایک فرسودہ خیال کو بھی اس جدت اور ندرت کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ وہ نیا اور نرالا معلوم ہونے لگے اور اقتضائے حال کے مطابق پسندیدہ ہو جائے، نیز ان تمام خصوصیات سے آراستہ ہو، جو قبولِ عام حاصل کرنے کے لیے از حد ضروری ہوں۔ جلال الدین احمد جعفری "نسیم البلاغت" میں علمِ بیان کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"علمِ بیان ایک ملکہ (نفسِ انسانی میں رسوخ اور استحکام پیدا کرنے کی قوت) کا نام ہے، جو ان تمام قواعد کو محفوظ کر لینے کے بعد پیدا ہوتا ہے جن میں معنی کو مختلف اسلوبوں سے ادا کرنے کے طریقے بتائے گئے ہوں۔"(۸)

کوئی بھی فن بغیر تگ و دو، جستجو، تشویق اور تعمیق کے فن کار کو حاصل نہیں ہوتا۔ مہارت اور ممایزت کے لیے مشقی ذرایع سے گزرنا پڑتا ہے، خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے، ضروری اوقات کا ایک اہم حصہ مختص کر کے فنی دسترس کو نکھارنا پڑتا ہے اور بالآخر، فن کار اس قابل ہو جاتا ہے کہ جب وہ اظہارِ فن کرے تو وہ فن جہاں تک پہنچے وہاں تک اس کی عظمت و سطوت کی گونج سنائی دے، ہر سامع و قاری اور ناظر دادِ

پذیرائی دے۔ نیز، فن کے ساتھ ساتھ فن کار کا بھی امر ہونا یقینی ہو جائے۔ یہ سب تبھی ممکن ہے جب دل بستگی اور وابستگی کے ساتھ علمِ بیان کی مشقِ مسلسل کی جائے۔ مرزا سجاد بیگ دہلوی "تسہیل البلاغت" میں رقم طراز ہیں:

> "وہ علم جو ایسے اصول و قواعد بیان کرتا ہے، جن کے ذریعے سے ایک مطلب مختلف عبارتوں میں اس طرح ادا کر سکیں کہ ایک معنی بہ نسبت دوسرے کے زیادہ یا کم واضح ہیں، علمِ بیان کہلاتا ہے۔"(۹)

علمِ بیان پر مکمل مہارت "تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل" کی باقاعدہ آشنائی اور استعمال سے ممکن ہے۔ مقرر کو تقریر میں اپنی بات کی تفہیم و تبلیغ کے لیے "تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل" کی ضرورت پڑتی ہے۔ عربی زبان کا لفظ تشبیہ "شبہ" سے نکلا ہے۔ لغت میں اس کے معنی "کی طرح ہونا، مماثل ہونا یا جیسا ہونا" بتایا گیا ہے۔ اصطلاحاً کسی ایک چیز یا شے کو کسی دوسری چیز یا شے کے مماثل اس بنیاد پر قرار دیا جاتا ہے کہ ان میں پائے جانے والے خصائص اور نقائص بھی مختلف اور ایک جیسے ہوں۔ احمد حسین مجاہد اپنی کتاب "رموزِ شعر" میں تشبیہ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> "تشبیہ دراصل دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے درمیان پائے جانے والی مشابہت کی بنا پر انھیں ایک دوسرے سے مشابہ قرار دینے کا نام ہے۔"(۱۰)

اہلِ فن نے تشبیہ کے پانچ اجزا بیان کیے ہیں: "مشبہ، مشبہ بہ، وجہِ شبہ، غرضِ تشبیہ اور حرفِ تشبیہ۔" تشبیہ دراصل ماہرین کے نزدیک دو یا دو سے زیادہ چیزوں کے درمیان پائی جانے والی مشابہت، مماثلت اور اشتراک ہے، خواہ یہ معائب کی بنیاد پر ہو یا محاسن کی وجہ سے ایک دوسرے کے مثل قرار دیا گیا ہو۔ وہاب اشرفی نے تشبیہ کی توضیح ان الفاظ میں لکھی ہے:

> "تشبیہ کے لغوی معنی ہیں 'مشابہت دینا'، ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند ٹھہرانا، اصطلاح میں دو چیزوں کا کسی صنعت میں ایک دوسرے کے شریک ہونے کو تشبیہ کہتے ہیں۔"(۱۱)

ارسطو تشبیہات کی بابت بات کرتے ہوئے اس امر کو اظہر من الشمس کرتا ہے کہ تشبیہات کی بہ دولت بات کی تفہیم و ترسیل میں آسانی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مقرر کو ایسی تشبیہات استعمال کرنی چاہئیں جو بعید از فہم نہ ہوں، بلکہ "از دل خیزد بر دل ریزد" کی مصداق ہوں۔ مقرر اگر ایسی تشبیہوں کا استعمال کرے گا

جو متروک ہو چکی ہوں یا ادق، مشکل اور پیچیدہ ہوں تو اپنے مقصد کی تفہیم میں ناکام رہے گا، نیز اس کا یہ امر تقریر اور تفہیمِ مدعا میں سامعین کی عدم دل چسپی کا سبب بن جاتا ہے۔ ارسطو نے تقریر میں تشبیہات کے استعمال کو ناگزیر قرار دیا ہے، کیوں کہ تشبیہات مقرر کے موضوع کے حقیقی مقصد کی توضیح و تصریح میں معاونت کرتی ہیں۔ تقریر کا تاثر اور اثر بڑھ جاتا ہے، بر موقع و محل تشبیہات کا استعمال تقریر کے تسلسل اور سامعین کے انہماک کو برقرار رکھتا ہے۔

> "Similes are useful in prose as well as in verse... They are to be employed just as metaphors sre employed, since they are really the same thing...the difference is but slight."(۱۲)

تشبیہات کا استعمال مقررین کی بات کی تفہیم میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ علمِ بیان کی یہ خوبی تقریر کو نکھارنے اور تدریسی و تفہیمی انداز میں سامعین کے دلوں میں اتارنے میں کارگر ثابت ہوتی ہے۔ تقریر کرتے ہوئے مقرر سامعین کی ذہنی استعداد کے مطابق مختلف تشبیہات کا استعمال کر کے اپنے مدعا اور مقصد کی بہ آسانی ترسیل و تفہیم ممکن بناتا ہے، یہی وہ خاصیت ہے، جو اس کی تقریر کو مستحکم کرتی ہے۔ کلب مصطفٰی تشبیہ کو خطابت کا حسن قرار دیتے ہیں۔

> "تشبیہ سے مراد دو چیزوں کو ایک دوسرے کے مماثل قرار دینا ہے۔ ان میں سے ایک کو مشبہ اور دوسرے کو مشبہ بہ کہتے ہیں اور صفت مشترک کو وجہ شبہ۔۔۔ تقریر میں حسن پیدا کرنے کے لیے تشبیہ کا استعمال بہت مفید ہے۔ اس سے ایک طرف تو الفاظ کے صرف میں کمی ہو جاتی ہے اور دوسری طرف اسلوبِ بیان میں قوت و وضاحت پیدا ہو جاتی ہے۔"(۱۳)

شورش کے مطابق مقرر کو ایسی تشبیہات کا استعمال کرنا چاہیے جو ان کی سوچ اور فکر سے ماورا نہ ہو۔ شورش نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ تشبیہات کے انتخاب اور استعمال میں انتہائی حزم و احتیاط سے کام لیا جائے۔ بعید از فہم تشبیہات کے استعمال سے گریز برتا جائے، تاکہ مقرر کی تقریر کا کوئی حصہ ایسا نہ ہو، جس کو سامعین سمجھ نہ سکیں۔ اگر مقرر اس معاملے میں احتیاط سے کام نہیں لے گا تو وہ اپنے مدعا کی تفہیم میں خود رکاوٹ بنے گا اور اپنی مقبولیت کے تمام راستوں کو مسدود کر دے گا:

"ان تشبیہوں سے کام لیں جو عوام کے دماغ کو حلق سے نکلتے ہی احاطہ کر لیں، وہ لطف محسوس کریں کہ آپ انھیں ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔"(۱۴)

تشبیہات کے استعمال کو ماہرین نے اس لیے اپنی ترجیحات میں شامل کیا ہے، کیوں کہ ان کی بہ دولت تفہیم، ابلاغ اور ترسیل کے نئے در وا ہوتے ہیں۔ مقرر اپنی بات کو جس طرح اور جیسے کہنا چاہتا ہے، تشبیہات کے بر موقع و بر محل استعمال سے اپنے مقصد میں کام یاب ہو جاتا ہے۔ اگر مقرر روز مرہ کے قریب رہ کر عام فہم اور اسان تشبیہات کو ترسیلِ مدعا کے لیے استعمال کرتا ہے تو یقیناً اس کا بیان سریع الاثر اور خطاب موثر ہو گا۔ شمس الدین احمد کے بہ قول

"دعوے کے ثبوت میں خطیب تشبیہات سے بھی کام لے سکتا ہے اور وہ بہت موثر ہوتی ہیں۔ تشبیہ سے مشبہ بہ کے تمام اوصاف اور خصائص مشبہ کے لیے حسن و خوبی کے ساتھ ثابت ہو جاتے ہیں۔"(۱۵)

"ریطوریقا" میں مرقوم ارسطو کے موقف کے مطابق تقریر کا مقصد اپنے مافی الضمیر کو انتہائی سہل اور عام فہم انداز میں سامعین تک منتقل کرنا ہے۔ مقرر کو اس مقصد میں کام یابی کے لیے مختلف تکنیکیں بروئے کار لانا پڑتی ہیں، ان میں ایک تشبیہ بھی ہے۔ یہ اس وقت کار گر ثابت ہوتی ہے، جب مقرر اپنے مدعا کی تشریح و توضیح کے لیے اسے کسی معروف چیز کے مماثل قرار دے کر ان کے مشترک خصائص عیاں کرتا ہے۔ کیوں کہ سامعین میں مختلف علمی صلاحیتوں کے حامل لوگ ہوتے ہیں، اس لیے تشبیہات کے ذریعے ایک کم علم آدمی تک بھی مدعا کی باقاعدہ ترسیل ممکن ہو سکتی ہے۔

استعارہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی "ادھار مانگنا، کسی لفظ کو اصل معنی کے بجائے اور معنی میں استعمال کرنا جب کہ ان دونوں میں تشبیہ کا تعلق ہو۔" اصطلاح میں اس سے مراد کسی ایک چیز کو ایک جیسی صلاحیت، مہارت، خوبی، نقص، خامی یا عیب کی بنیاد پر بعینہ دوسری چیز کہہ دینا، استعارہ کہلاتا ہے۔ استعارے کی خوبی یہ ہے کہ لفظ اپنے لغوی مفہوم اور معانی سے تہی ہو کر نئے مفہوم اور معانی مستعار لے کر ان کی توسیع و توضیح کرتا ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جس کی وجہ سے کلام موثر، بیان معتبر اور انداز مستحکم ہوتا ہے۔ وہاب اشرفی اپنی کتاب "تفہیم البلاغت" میں استعارہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"استعارہ کے لغوی معنی ہیں مانگنا، ادھار لینا، مستعار لینا وغیرہ۔ علمِ بیان کی اصطلاح میں استعارہ سے مراد حقیقی اور مجازی معنی کے مابین تشبیہ کا علاقہ پیدا کرنا، یعنی حقیقی

معنی کا لباس عاریتاً مانگ کر مجازی معنی کو پہنانا، استعارہ کہلاتا ہے۔"(۱۶)

استعارہ بھی علمِ بیان کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ بھی بیان کو مستحکم بنانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے تین بنیادی اجزا ہیں: "مستعار لہ، مستعار منہ، وجہ جامع"۔ مستعار لہ درحقیقت وہ رکنِ کلام ہے، جس کے لیے لفظ یا شے مستعار لی جاتی ہے، جب کہ مستعار منہ ایسا رکنِ کلام ہے، جس سے لفظ یا شے مستعار لیا جاتا ہے۔ جب کہ رکنِ ثلاثہ "وجہِ جامع" سے مراد مستعار لہ اور مستعار منہ کے مابین پائے جانے والی مشترک خصوصیت ہے۔ احمد حسین مجاہد نے بھی استعارہ کی بابت انھی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

> "استعارہ کے لغوی معنی ادھار لینا کے ہیں، یعنی مستعار لینا۔ اسی سے استعارہ کا لفظ برآمد ہوا ہے۔ انگریزی میں اسے Metaphor کہتے ہیں۔۔۔ استعارہ میں لفظ اپنے لغوی معنی سے دست کش ہو جاتا ہے اور نئے معانی مستعار لے کر ان کی توسیع کر دیتا ہے۔ استعارہ کلام کا جوہر ہے، اسی کی وجہ سے کلام میں شدت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو تشبیہ اور استعارے میں بہت گہری مشابہت ہے۔ فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری کے مانند قرار دیا جاتا ہے جب کہ استعارہ میں مبالغہ سے کام لے کر ایک چیز کو بعینہ دوسری چیز قرار دے دیا جاتا ہے۔"(۱۷)

استعارے کی ناگزیریت اور اس کے مناسب استعمال کی بابت ارسطو نے "ریطوریقا" میں جامع انداز میں بحث کی ہے۔ اس کے مطابق استعارہ فنِ خطابت کا بنیادی جوہر ہے۔ علمِ بیان کو یہ جزوِ خاص کلام اور فن کے نکھار کا باعث ہے۔ کسی چیز کی صحیح وقعت کو عوام کے اذہان میں بٹھانے کے لیے مقررین استعارات کا استعمال کرتے ہیں۔ بعض اوقات استعارات کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اگر مقرر نے کسی شے کی رفعت اور اوج کو واضح کرنا ہے تو وہ ارفع و اعلا استعارات کا استعمال کرتے ہوئے اپنی بات کو واضح کرنے کی تگ و دو کرے گا۔ اسی طرح اگر کسی شے کی پستی کو بیان کرنا ہے تو اس صورت میں تنزلی سے کچھ مستعار لے کر پستی کو بیّن اور واضح کرے گا۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ استعارات خطابت کا لازمی جزو ہیں۔ ارسطو کے مطابق استعارات خطابت میں حسن اور استدلال میں استحکام کا موجب ہیں۔

> "Liveliness is specially conveyed by metaphore, and by the firther power of surprising the hearer; because the hearer expected something different, his acquisition of

the new idea impresses him all the more... Well-constructed riddles are attractive for the same reason; a new idea is conveyed, and there is metaphorical expression." (۱۸)

استعارات کا یہ خاصہ ہے کہ سامعین میں تشویق و تحریک پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تمام تر توجہ مقرر کی جانب مبذول ہوتی ہے، جس کی وجہ سے استغراق بڑھتا ہے اور ادراک کی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں، انھی استعارات کی بہ دولت مقررین کو داد و تحسین ملتی ہے۔ یہی تحسین مقرر کے حوصلے کو بڑھاتی اور اس کی فکر کو مہمیز دے کر جلا بخشتی ہے۔ اس کا اثر اس کے بیان پر پڑتا ہے اور یہی بیان سامعین کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس لیے مقرر موقع محل کی مناسبت سے وقتاً فوقتاً مختلف اقتضائے ضرورت کے تحت مختلف استعارات استعمال کرتا ہے، تاکہ ابلاغ اور تفہیم میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ کلبِ مصطفٰی نے بھی اسی امر کی جانب توجہ دلائی ہے:

"استعارے سے مراد کسی لفظ کا مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کرنا کہ حقیقی اور مجازی معنوں کے درمیان کوئی تشبیہی مناسبت پائی جاتی ہو۔۔۔ استعارے خیالات میں روشنی پیدا کرتے ہیں، جذبات کو ابھارتے ہیں، اشتیاق کو بڑھاتے ہیں۔۔۔ اگر تقریر میں کسی خیال، کسی دلیل یا کسی جذبے کو موزوں اور دل کش استعارے کی صورت سے ظاہر کیا جائے تو وہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ دونوں پر یکساں اثر انداز ہو گا۔ ان کے احساسات و جذبات اور دل و دماغ سب متاثر ہوں گے۔"(۱۹)

خطابت میں اگرچہ تشبیہات اور استعارات دونوں سے مستفید ہوا جاتا ہے، لیکن استعارات کا استعمال تشبیہات کے بجائے زیادہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ تشبیہات عموماً شاعری میں زیادہ مستعمل ہیں، جب کہ نثر میں استعارات زیادہ زود اثر ہوتے ہیں اس لیے استعارات خطابت کا لازمہ ہیں۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ دورانِ تقریر استعارات کی وجہ سے انتہائی سُرعت سے اپنے مقصد کی ترسیل کی جا سکتی ہے۔ بقول نذیر الدین:

"استعارات کو خطیب اور تشبیہات کو شاعر زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہ لفظ مشابہت سے ہے اور استعارہ مستعار سے۔۔۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال پر عبور کے لیے مختلف مواقعوں پر ان کے استعمال پر غور کرنا اور پھر اپنے طور پر استعمال کرنا چاہیے، تاکہ مشق ہو سکے اور غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔"(۲۰)

استعارے کے استعمال کی بحث میں ارسطو نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ استعارات اگرچہ تقریر کے لیے ناگزیر ہیں، تاہم مقررین کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایسا کوئی استعارہ استعمال نہ کریں، جو سامعین کے لیے اجنبی ہوں۔ بہترین اور برمحل استعارات کے استعمال سے مقرر کا حلقۂ اثر نہ صرف بڑھتا ہے، بلکہ استعارات کے پیرائے میں کہی ہوئی بات بھی موثر ہوتی ہے۔

> "Metaphors must be drawn ... from things that are related to the original thing, and yet not obviously so related–just as in philosophy also an acute mind will perceive resemblances even in things far apart... Proverbs are metaphors from one species to another... Successful hyperboles are also metaphors." (۲۱)

لغت کے اعتبار سے کنایہ کے معنی "اشارہ، رمز، پوشیدہ بات، مبہم کلام، وہ لفظ جن میں مطلب اختصار سے یا بہ غرض عدم اظہار ایک یا دو لفظوں میں ادا کیا جائے۔" یہ درحقیقت علمِ بیان کا وہ جزو ہے، جس سے مراد تو مجازی معنی لیے جاتے ہیں، لیکن اگر اس کے حقیقی معنی بھی مراد لیے جائیں تو بات ٹھیک ہو گی۔ سہل الفاظ کے پیرائے میں، جب الفاظ کو اس طرح مجازی معنوں میں برتا جائے کہ اس کے حقیقی معنی بھی مراد لیے جاسکتے ہوں، یہ کنایہ کہلاتا ہے۔ نجم الغنی کے بہ قول:

> "کنایہ اس لفظ کو کہتے ہیں، جو اپنے معنیِ موضوع میں مستعمل ہو، لیکن مقصود وہ معنی نہ ہوں، بلکہ ایک دوسرے معنی ہوں، جو ان سے پہلے معنی کے ملزوم ہوں اور ان دوسرے معنی کا مقصود ہونا معنیِ موضوع کے ارادہ کرنے کے منافی نہیں۔" (۲۲)

ماہرینِ فن کی آرا کا بہ غور جائزہ اس بات کو اظہر من الشمس کرتا ہے کہ کنایہ مخفی اور پوشیدہ بات کا اظہار ہے۔ اصطلاح میں کنایہ وہ الفاظ ہیں جو حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں مستعمل ہوں۔ وہاب اشرفی "تفہیم البلاغت" میں اسی نکتے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> "کنایہ کے لغوی معنی ہیں مخفی یا پوشیدہ بات۔ اصطلاح میں کنایہ وہ لفظ ہے، جس کا معنی حقیقی مراد نہ ہوں بلکہ معنی غیر حقیقی مراد ہوں، لیکن معنی حقیقی مراد رکھیں تو بھی جائز ہے۔ اس میں ملزوم سے لازم مراد لیا جاتا ہے۔" (۲۳)

علمِ بیان کا ایک لازمی جزو کنایہ ہے۔ یہ خطابت میں دل کشی، ندرت، جدت اور بلاغت پیدا کرتا ہے۔ مقررین کنایہ کے بہترین استعمال سے اپنے سامعین کے دلوں میں گھر کرتے، فنی میدان میں عظمت و رفعت کی چوٹیاں سر کرتے ہیں۔ ایک عام سی تقریر میں بھی جب کنایہ کے محاسن شامل ہوتے ہیں تو اس کی قدر و منزلت اور افہام و تفہیم میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے بڑے خطبا بڑی مہارت اور جدت سے خطابت میں کنایوں کے استعمال سے تقریر کے اثر کو بڑھاتے اور عوامی جذبات کو گرماتے ہیں۔ ان کا یہ تجربہ ان کے فنی و فکری استعداد کو فزوں کر کے اپج پیدا کرتا ہے۔ سید کلب مصطفٰی اپنی تصنیف "فنِ خطابت" میں اسی امر کی نشان دہی کی ہے:

> "اگر کسی لفظ یا الفاظ سے ان کے مجازی معنی کے ساتھ حقیقی معنی بھی مراد لے سکیں تو اس کو کنایہ کہتے ہیں۔۔۔اس کا استعمال نظم و نثر میں عموماً اور تقریر میں خصوصیت کے ساتھ ایک قسم کی بلاغت، جدت اور دل کشی پیدا کرتا ہے۔"(۲۴)

علمِ بیان کا یہ جزو اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ جب لفظ کے لغوی اور حقیقی معنی ایک ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے لغوی معنی میں مستعمل نہ ہوں تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لفظ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس ضمن میں یہ کہا جاتا ہے کہ اگر لغوی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا علاقہ ہو تو یہ استعارہ کہلاتا ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو یہ مجازِ مرسل کہلاتا ہے۔ یعنی، کسی لفظ کا مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کہ حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور علاقہ یا تعلق موجود ہو، مجازِ مرسل کہلاتا ہے۔ مولانا روحی نے جو تعریف مجازِ مرسل کی، کی ہے وہ سید عابد علی عابد نے اپنی معروفِ زمانہ کتاب "البیان" میں نقل کی ہے۔ "معانی لغوی و مجازی میں اگر علاقہ تشبیہ کا ہو تو استعارہ ہے، نہیں تو مجازِ مرسل۔"(۲۵) مجازِ مرسل کی جامع توضیح وہاب اشرفی نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "لفظ کا استعمال لغوی معنی کے علاوہ کسی اور معنی میں کیا جائے اور اس کے حقیقی معنی اور مجازی معنی میں تشبیہ کے سوا کوئی اور علاقہ ہو تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔"(۲۶)

علمِ بیان اور خطابت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس علم کا جزوِ رابعہ مجازِ مرسل ہے، جس کا استعمال تقریر کو پُر کشش اور پُر اثر بناتا ہے۔ نیز، کلام کو حسن، انفرادیت اور ندرت عطا کرتا ہے۔ ماہرین نے اس کی چوبیس اقسام بتائی ہیں۔ اقتضائے حال کے مطابق مقرر ان اقسام کا سہارا لے کر اپنا مدعا و مقصد موثر و مقبول بنا

سکتا ہے۔ مقرر کو علمِ بیان کے اس وصف کی بہ خوبی آگہی اور آشنائی کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کے استعمال کا طریقہ معلوم ہونا چاہیے تاکہ وہ احسن پیرائے میں تقریر کے محاسن کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرے۔ سید کلب مصطفٰی مجازِ مرسل کے تقریر میں استعمال کی افادیت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> "جب کسی لفظ کو حقیقی معنی کے علاوہ مجازی معنوں میں استعمال کریں اور حقیقی و مجازی معنی میں تشبیہ کے علاوہ کوئی اور تعلق ہو تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں۔۔۔ اس سے تقریر میں ایک طرح کی ندرت و جدت پیدا ہو جاتی ہے اور جو چیزیں اپنے حقیقی لباس میں بھدی اور غیر موثر معلوم ہوتی ہیں وہ مجازِ مرسل کے لباس میں دل کش و موثر ہو جاتی ہیں۔"(۲۷)

ارسطو نے زبان کی تاثیر بڑھانے کے عناصر میں اس بات پر زور دیا ہے کہ کسی مہذب اصطلاح کے ذریعے بات کی صراحت اور وضاحت کی جائے، علاوہ ازیں اُس نے بیان کے ضمن میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ سیاسی تقاریر میں بیانیے کی گنجائش کم ہوتی ہے، اب مقرر کی ذہانت و فطانت اور حاضر دماغی پر منحصر ہے کہ وہ کس طرح کم وقت میں اپنے مدعا و مقصد کو اشاروں، کنایوں میں بہ اختصار پیش کر سکتا ہے۔

> "The following suggestions will help to give your language impressiveness. (1) Describe a thing instead of naming it. (2) Represent things with the help of metaphors and epithets, being careful to avoid poetical effects." (۲۸)

علمِ بیان چوں کہ فنِ بیان اور خطابت سے متعلق ہے، اس لیے خطابت سے منسلک لوگوں کو علمِ بیان کے جملہ اسرار و رموز کو انتہائی دل چسپی اور دل بستگی سے ازبر کرنا چاہیے۔ اس علم کی گہرائی و گیرائی، بر موقع و بر محل استعمال سے آشنائی مقرر کی پذیرائی میں اضافے کا باعث ہے۔ یہی وہ علم ہے جو ایک معمولی سے معمولی بات کو بھی انتہائی مستحسن اور مزین کو دیتا ہے۔ علمِ بیان کے لبادے میں لپٹا کلام اور بیان تاثیرِ تام کا حامل ہوتا ہے۔ تاہم، اس امر کا خیال ضروری ہے کہ تشبیہات، استعارات، کنایات اور مجازاتِ مرسل کے استعمال میں سہولت اور افہام کو مدِ نظر رکھا جائے، کوئی ایسا رکن استعمال نہ کیا جائے، جس کو سمجھنے میں سامعین کو دقت ہو، کیوں کہ مبہم تشبیہات و استعارات کے استعمال سے تقریر کا تاثرِ فطری زائل ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ ارکانِ علمِ بیان

کے استعمال کے وقت مشکل پسندی کے بجائے سہل پسندی کو ترجیح دینی چاہیے تاکہ فنی تکنیک ابہام کا باعث نہ بنے، نیز تفہیم و ابلاغ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔

## 2۔ علمِ بدیع:

بدیع عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب "اچھوتا، انوکھا اور نادر" ہے۔ وہی کلام ہمارے دل میں گھر کرتا ہے، جو فصیح و بلیغ اور حسنِ اظہار سے مملو ہو۔ کلام میں حسن دو وجوہات کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، ایک لفظی اور دوسرا معنوی اعتبار سے۔ علمِ بدیع درحقیقت انھی دو خصائص سے پروان چڑھتا ہے۔ سید عابد علی عابد بدیع کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: "علمِ بدیع وہ علم ہے جس سے تزئین و آرائشِ کلام کے اسباب و وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔"(۲۹)

اس علم کا انحصار صنعتوں پر ہے، جن کے بل پر شاعری اور کلام میں معنوی اور لفظی خوبیاں مترشح ہوتی ہیں۔ ہنر مندی، قلع کاری اور کاری گری کو صنعت کہتے ہیں۔ کلام میں صنعتیں بغیر کسی تردد اور کوشش کے خود ہی اس طرح در آتی ہیں، جس طرح کھلے یا ادھ کھلے دریچے سے ہوا کا جھونکا۔ یہ ہوا کا جھونکا جس طرح طبیعت کو معطر کرتا ہے، اسی طرح کلام میں صنعتوں کا بے تردد استعمال بھی سماعت اور طبیعت کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے صاحبِ سخن کو بغیر کسی سعی، محنت اور مشقت کے کلام میں صنعتوں کا استعمال کرنا چاہیے، تاکہ وہ بھلی معلوم ہوں۔ بدیع کا تعلق چوں کہ کلام میں حُسن سے ہے، یہ حُسن اگر مفاہیم اور معانی کے بل پر پیدا ہوا ہو تو یہ صنائع معنوی کے زمرے میں آتا ہے اور اگر کلام لفظی خوبیوں اور رعنائیوں سے معمور ہو تو یہ صنائع لفظی کہلاتا ہے۔ خطیب خطابت کے کینوس میں خوب صورت شعروں سے رنگ بھرتا ہے، موضوع سے متعلق اشعار پیش کرتا ہے، تاکہ اس کا موقف بیّن اور مزیّن ہو سکے۔ اشعار کے استعمال کا فائدہ یہ ہے کہ دریا کوزے میں سمٹ آتا ہے، یعنی کم الفاظ میں مفصل بات موثر انداز میں بیان ہو جاتی ہے، اختصار اور ایجاز کے پیرائے میں بات کی تفہیم سہل ہو جاتی ہے۔ المختصر، شعروں کی بہ دولت تقریر کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ یہ اشعار علمِ بدیع کی مختلف خوبیوں اور صنعتوں سے مزیّن ہوتے ہیں۔ ذیل میں چند صنعتوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ "صنائع لفظی میں صنعت تجنیس، صنعت قلب، صنعت اشتقاق، صنعت تنسیق الصفات، صنعت ذوالقوافی، صنعت سیاقۃ الاعداد، صنعت منقوطہ، صنعت غیر منقوطہ، صنعت تلمیع، صنعت تضمین اور نواح" شامل ہیں۔ 'تجنیس' کا مطلب "ایک جنس کا حامل ہونا، کلام میں ایسے الفاظ پرونا جن کے معانی مختلف ہوں لیکن تلفظ مشابہت رکھتا ہو"۔ صنعت تجنیس کی کئی اقسام ہیں: تجنیس تام سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جن کے

حروف، ترتیب، اعراب ایک جیسے ہوں لیکن معانی مختلف ہوں۔ مثلاً مرزا غالبؔ کے درج ذیل شعر میں مذکورہ شعر کے مصرعِ اول میں بات بہ معنی معاملہ اور مصرعِ ثانی میں بات بہ معنی گفت گو مستعمل ہے:

"ہے کچھ ایسی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی" (۳۰)

شورش کاشمیری کی کتاب "فنِ خطابت" سے سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریر کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو، جس میں صنعت تجنیس تام دیکھی جاسکتی ہے:

"جنگ ہو گی، ضرور ہو گی، یورپ کے میدانوں میں ہو گی اور اپنی ہولناک بربادیوں کے ساتھ پھیل جائے گی۔ جو چیز پردہِ غیب میں ہو اس کے بارے میں حکم نہیں لگایا جاسکتا اور نہ کوئی پیش گوئی کی جاسکتی ہے، علیم و خبیر ذاتِ الٰہی ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جنگ کیا لائے گی اور کیا چھوڑ کے جائے گی۔" (۳۱)

تجنیس مرکب سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جو ہر اعتبار سے ایک جیسے ہوں، لیکن ایک لفظ مفرد اور دوسرا مرکب کی صورت میں ہو۔ مثلاً اقبال کے درج ذیل شعر کے مصرعِ اول کے حرفِ اول کارواں بہ معنی قافلہ اور مصرعِ اول کے آخری دو حروف "کا اور رواں" سے صنعتِ تجنیس مرکب کی کیفیت بن رہی ہے:

"کارواں دل سے ہوا صبر و تحمل کا رواں
کہنے آیا ہوں میں اپنے درد و غم کی داستاں" (۳۲)

تجنیس مرفوع سے مراد یہ ہے کہ کلام میں الفاظ ایک طرح کے ہوں، مگر ایک لفظ مفرد اور دوسرا لفظ دو الفاظ کے اتصال کی وجہ سے بنے۔ مثلاً غالبؔ کے مذکورہ شعر میں "مطربِ دل" اور "بیدل" تجنیسِ مرفوع ہے۔

"مطربِ دل نے مِرے تارِ نفس سے غالبؔ
ساز پر رشتہ پئے نغمہِ بیدلؔ باندھا" (۳۳)

تجنیس خطی سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کو برتنا جن میں محض اعراب یا نقاط کا فرق ہو۔ مثلاً غالبؔ کے درج ذیل شعر میں "خلوت اور جلوت" تجنیسِ خطی کی کیفیت پیدا کر رہے ہیں:

"دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بار ہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہُشیار بھی نہیں"(۳۴)

تجنیس محرف سے مراد کلام میں دو ایسے الفاظ بروئے کار لانا، جو املا کے اعتبار سے ایک جیسے ہوں، لیکن اعراب میں تغیر و تبدل ہو۔ مثلاً اقبال کوثر کے اس شعر میں الفاظ "رَہ اور رہ" تجنیسِ محرف کا اظہار ہیں:

"تمام ہم نفساں قطع کر گئے منزل
بس اِک مسافرِ رَہ رہ گیا بچا ہوا میں"(۳۵)

تجنیس مضارع سے مراد کلام میں ایسے متجانس الفاظ کو استعمال کرنا، جن میں صرف ایک حرف کا فرق ہو، لیکن وہ قریب المخرج ہوں۔ مثلاً میر تپش کے مذکورہ شعر میں الفاظ "برسوں اور پرسوں" کا اہتمام تجنیسِ مضارع کے مظاہر ہیں:

"دین و دِل عشق میں کھو بیٹھے ہیں ہم برسوں سے
طاقتِ صبر بھی جاتی رہی کل پرسوں سے"(۳۶)

قلب عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی "بدلنے اور الٹ دینے" کے ہیں۔ صنعت قلب کل سے مراد کلام میں دو الفاظ اس طرح برتنا کہ ایک لفظ کے حروف کی ترتیب کو الٹ دیا جائے تو دوسرا لفظ بن جائے۔ مثلاً اقبال کے اس شعر میں "کیا اور ایک" قلبِ کُل کی بیّن مثال ہے؛ لفظ "کیا" کے حروف الٹنے سے لفظ "ایک" بنتا ہے، جب کہ لفظ ایک کے حروف الٹنے سے لفظ "کیا" بنتا ہے:

"تُو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو ہی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں" (۳۷)

صنعت قلب بعض سے مراد کلام میں الفاظ کے حروف کی تعداد تو یکساں ہو لیکن ترتیبِ حروف یکساں نہ ہو۔ مثلاً اقبال کے مذکورہ شعر میں الفاظ "عرش اور شعر" کے حروف کا الٹ پھیر صنعت قلب بعض کی کیفیت کا اظہار ہے:

"لامکاں تک کیوں نہ جائے گی دعا اقبالؔ کی
عرش تک پہنچی ہے جس کے شعر کی اُڑ کر زمیں"(۳۸)

صنعت قلب مستوی سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کو بروئے کار لانا جن کو الٹ دیا جائے تو وہی الفاظ بن جائیں۔ مثلاً درج ذیل شعر میں لفظ "نالاں، نادان، لیل، قلق، درد" قلبِ مستوی کی واضح امثلہ ہیں:

"درد و قلق میں گُزرے لیل و نہار اپنے
نادان دِل نے ہر دَم نالاں جگر کو رکھا"(۳۹)

صنعت اشتقاق سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال جن کا ماخذ یا مصدر ایک ہو۔ مثلاً مرزا غالبؔ کے درج ذیل شعر میں الفاظ "شہود، شاہد، مشہود اور مشاہدہ" صنعتِ اشتقاق کو ظاہر کرتے ہیں:

"اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہیں
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں"(۴۰)

صنعت تنسیق الصفات سے مراد عبارت یا کلام میں بُری یا اچھی صفات کا تسلسل بیان ہے۔ مثلاً ضیا جالندھری کے اس شعر میں مختلف صفات "دھج، رُوپ، بَل، فان" صنعتِ تنسیق الصفات کی کیفیت کا سبب ہیں:

"یہ دھج، یہ رُوپ، یہ بَل، کل من علیھا فان
سبھی ہیں رزقِ اجل، کل من علیھا فان"(۴۱)

صنعت ذوالقوافی سے مراد کلام میں ایک سے زیادہ قوافی لانا ہے۔ اسے صنعت ذو قافتین بھی کہتے ہیں۔ مثلاً شہزاد نیر کے اس شعر کے مصرعِ اولیٰ میں "منجدھار، پتوار" اور مصرعِ ثانی میں الفاظ "پار، بار" صنعتِ ذوالقوافی کی مثالیں ہیں:

"سوچوں کو منجدھار کیا، خود کو پتوار کیا
دل کا دریا پار کیا اور پہلی بار کیا"(۴۲)

صنعت سیاقۃ الاعداد سے مراد کلام میں اعداد یا تعداد کا تذکرہ کرنا ہے۔ مثلاً ہجر شاہ جہان پوری کے اس شعر میں الفاظ "ہزاروں، کروڑوں اور لاکھوں" سنعتِ سیاقۃ الاعداد ہیں:

"ہزاروں غم، کروڑوں حسرتیں، لاکھوں تمنائیں
بہت کچھ لکھنے والے نے، مِری قسمت میں لکھا"(۴۳)

کلام میں تمام الفاظ ایسے استعمال کرنا، جو نقطے سے خالی نہ ہوں، صنعت منقوطہ کہلاتا ہے۔ مثلاً ناصر کاظمی کے اس شعر کا ہر لفظ منقوطہ ہے:

"اپنی بے چینی بھی عجب تھی
ترا سفر بھی نیا نیا تھا"(۴۴)

صنعت غیر منقوطہ سے مراد کلام میں ایسے الفاظ کا استعمال کرنا ہے جن میں کوئی نقطہ نہ ہو۔ مثلاً

"حدِ ادراک سے ماورائے گُماں
وہ وریٰ الوریٰ، کوئی اس سا کہاں"(۴۵)

صنعت تلمیح سے مراد کلام میں ایک سے زیادہ زبانوں کے الفاظ کا استعمال ہے۔ مثلاً عزیز اعجاز کے مذکورہ شعر میں الفاظ "مُوڈ اور منظر" صنعتِ تلمیح کا موجب ہیں:

"جیسا مُوڈ ہو ویسا منظر ہوتا ہے
موسم تو انسان کے اندر ہوتا ہے"(۴۶)

کتاب "تعلیمِ تقریر" میں ابو البیان نے ابو الکلام آزاد کی ایک تقریر نقل کی ہے، جس میں اردو اور عربی زبان کے جملوں کے استعمال میں صنعتِ تلمیح کی کیفیت ابھرتی ہے:

"جو لوگ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو اس کا شریک بنا لیتے ہیں، ان کے لیے یہی کہا، یحبونھم کحب اللہ، ان ہستیوں کو محبوب رکھتے ہیں اور پھر مومنوں کی نسبت بھی یہی کہا، 'اشد حباً للہ'، وہ تو اللہ ہی کو سب سے زیادہ محبوب رکھنے والے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کا معاملہ اصلاً محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"(۴۷)

صنائع معنوی میں "صنعت تضاد، صنعت ایہام، صنعت حسن تعلیل، صنعت مراعات النظیر، صنعت لف و نشر، صنعت جمع، صنعت تفریق، صنعت مبالغہ، صنعت تلمیح، تجاہل عارفانہ، صنعت عکس، صنعت تکرار، صنعت تعجب، صنعت تصلیف، صنعت سوال و جواب، صنعت سہل ممتنع، صنعت احتجاج بہ دلیل اور صنعت متتابع" شامل ہیں۔ صنعت تضاد سے مراد کلام میں متضاد اور مخالف الفاظ کا استعمال ہے۔ مثلاً آمنہ بہار کے اس شعر میں الفاظ "پُورا اور آدھا" باہم متضاد الفاظ سے صنعتِ تضاد کی کیفیت ابھر رہی ہے:

"مِری قسمت میں جو پُورا لکھا تھا
مجھے وہ دیس آدھا کیوں ملا ہے؟"(۴۸)

شورش کاشمیری نے مولانا محمد علی جوہر کی ایک تقریر کتاب "فنِ خطابت" میں نقل کی ہے، جس میں صنعتِ تضاد کی عمدہ مثال واضح دکھائی دیتی ہے:

"جس بات کے عقب میں خوف ہو یا جس سخن ساتھ تذبذب ہو اور لہجہ لیپا پوتی کا ہو، وہ بات کسی حال میں موثر نہیں ہوتی، وہ سونا نہیں ملمع ہے۔"(۴۹)

ایسا کلام جو ذو معنویت کا حامل ہو، صنعت ایہام کے زمرے میں آتا ہے۔ مثلاً مومن خان مومن کے معروف شعر میں "خُدا خُدا کر کے" جیسے الفاظ سے ذو معنویت کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ یعنی، ایک معنی 'مسجد میں خُدا کا ذکر کرتے ہوئے رات گُزری' اور دوسرا معنی 'رات مشکل سے کٹنا'؛ دونوں معانی یہاں بر محل ہیں، حقیقی معنی تک پہنچنا دقیق النظری کا طالب ہے:

"شب جو مسجد میں جا پھنسے مومنؔ
رات کاٹی خُدا خُدا کر کے"(۵۰)

مولانا ظفر علی خان نے کانگریس کے ایک جلوس کے شرکا، جو ننگے پاؤں احتجاج کر رہے تھے، کے اس طرز کے احتجاج پر ایہام سے بھرپور ایک شعر کہا، ملاحظہ کیجیے:

"کانگریس آ رہی ہے ننگے پاؤں
جی میں آتا ہے بڑھ کے دوں جُوتا"(۵۱)

کلام میں کسی واقعے، کیفیت یا امر کی کوئی ایسی وجہ بیان کرنا، جس کا حقیقی وجہ سے کوئی تعلق نہ ہو، صنعت حسنِ تعلیل کہلاتی ہے۔ اکثر ذاکرین و مقررین جب واقعہِ کربلا کو بیان کرتے ہیں تو مظلومینِ کربلا کی پیاس کی شدت کو بیان کرتے ہوئے میر انیسؔ کا حُسنِ تعلیل سے معمور یہ شعر پڑھتے ہیں:

"پیاسی جو تھی سپاہِ خُدا تین رات کی
ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی"(۵۲)

صنعت مراعات النظیر سے مراد یہ ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ یا اشیا کا تذکرہ جن میں باہم مناسبت پائی جائے اور کوئی تضاد نہ ہو۔ مثلاً درج ذیل شعر میں الفاظ "عدالت اور انصاف" سے متذکرہ صنعت کی کیفیت ابھر رہی ہے:

"انصاف نہیں اس کو ملا ہو گا مسلسل
یوں ہی کئی توہینِ عدالت نہیں کرتا"(۵۳)

کسی تاریخی واقعے، تاریخی شخصیت و کردار، قرآنی آیت، حدیثِ نبوی، مشہور شعر، مثل، داستان یا علمی اصطلاح کو جزوِ کلام بنانا، صنعتِ تلمیح ہے۔ مثلاً افتخار عارف کے درج ذیل شعر میں "خاکِ پاک اور نیزوں پہ سر تولے گئے" کے الفاظ واقعہِ کربلا کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس سے صنعت تلمیح کا اظہار ہوتا ہے:

"وہ خاکِ پاک ہم اہلِ محبت کو ہے اکسیر
سرِ مقتل جہاں نیزوں پہ سر تولے گئے تھے"(۵۴)

مولانا احمد سعید دہلوی اردو فنِ خطابت کی ایک معتبر شخصیت ہیں، ان کی تقریر میں صنعتِ مراعات النظیر اور صنعتِ تلمیح کی حسنِ مثال ملاحظہ کیجیے:

"ہم اپنی تقدیر سے خود آنکھیں پھیر چکے ہیں، ہماری ناؤ ہچکولوں کی پکڑ میں ہے، بادباں ٹوٹ چکا ہے، کبھی ہمارے بازو چپُو اور ہمارے قدم لنگر تھے۔ اب ہاتھ پھیلاتے ہیں تو چپُو نہیں ملتے۔ ہم پانی کی لہروں کے سفینے پر سوار ہیں، ہمارا وجود اس کے لیے بوجھ ہے۔ سفینہ کہتا ہے کیا تم ان کے وارث ہو، جو کناروں پر پہنچ کر عشق مقصد کی دُھن میں اپنے سفینے ڈبو دیتے تھے اور سفینے ناز کرتے تھے کہ ہم نے معراج پائی ہے، اس طرح اللہ کے سپاہی محمدؐ کا پھریرا لے کر 'ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست' کا جلوہ دکھاتے تھے۔"(۵۵)

دہلوی صاحب کی اس تقریر میں کس خوب صورتی سے علمِ بدیع کا استعمال کر کے تقریر کی زیبائی اور رعنائی کو بڑھانے کے لیے صنعتِ تلمیح کو برتا ہے۔ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے اور منزل کے حصول کے لیے برانگیخت کرنے کے لیے انھوں نے طارق بن زیاد کی روش کو اپنانے کی ترغیب دلائی ہے۔

"لف" کے مطالب و معانی میں "لپیٹنا" کا مفہوم مضمر ہے، جب کہ "نشر" کے معانی میں "پھیلانا" کا مفہوم شامل ہے۔ اصطلاحاً صنعت لف و نشر سے مراد کلام کے ایک حصے میں کسی بات کی طرف اشارہ کرنا اور دوسرے حصے میں اس کی وضاحت کرنا ہے۔ مثلاً

"ایک سب آگ، ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں"(۵۶)

ابوالکلام آزاد کی خطابت کی دھاک پورے ہندوستان پر تھی، برصغیر میں ان جیسا ہمہ جہت خطیب و ادیب کی مہارت آج بھی مقررین کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ان کی تقریر میں صنعتِ لف و نشر کا خوب صورت اہتمام دیکھیے:

"آزادی ہر قوم کا حق ہے اور مصلوب ہونے کی صورت میں استقامت کی شاہراہ سے گُزر کر ایثار کی طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہم اپنی آزادی کے حصول کا فیصلہ کر

چکے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ ہم پہ کیا گزرتی ہے، جو پیش آتا ہے، ہم اس کے لیے تیار ہیں۔ جو لوگ مقصد کے عشق میں سفر کو نکلتے ہیں ان کے آبلے کانٹوں سے گھبراتے نہیں، ان کی مدارت سے خوش ہوتے ہیں۔ وہی انسان سرخ رُو ہوتا ہے جو استیلاو آزمائش میں ثابت قدم رہا اور جس کا دل اس یقین سے معمور ہو کر آگ کے شعلے، جدوجہد کی سچائی سے گلستان ہو جاتے ہیں۔"(۵۷)

کلام میں جب مختلف اشیا کو مخصوص صفت اور خاصیت کی بنا پر جمع کر دیا جاتا ہے، تو یہ کیفیت صنعتِ جمع کہلاتی ہے۔ مثلاً ظہور مظہر کے اس شعر میں "حرم، کلیسا، مے خانہ، ویراں، غُربت اور بھرم" کے الفاظ کو استعمال کر کے مختلف اشیا کو جمع کیا گیا ہے:

"رکھا نہیں غُربت نے کسی اِک کا بھرم بھی
مے خانہ بھی ویراں ہے، کلیسا بھی، حرم بھی"(۵۸)

ڈاکٹر سیف الدین کی تقریر کی شیرینی اور بیان میں سنگینی کا عکس دیکھیے، کس خوب صورتی اور مہارت سے انھوں نے صنعتِ جمع استعمال کی ہے:

"میں نوجوانوں سے کہتا ہوں، آگے بڑھو یا وقت کی رفتار روک لو۔ وہ جوانی میرے نزدیک عناصرِ اربعہ کا کفن ہے جس میں مقصد کی تب و تاب اور آزادی کا ولولہ و عشق نہیں۔ جس قوم سے راستباز زبانیں اُٹھ جائیں، وہ قوم گورِ غریباں ہو کر رہ جاتی اور اس کا شعلہ احساسِ چتا کی راکھ ہو جاتا ہے۔"(۵۹)

صنعت تفریق سے مراد کلام میں دو چیزوں، دو لمحوں، دو کیفیتوں یا دو زمانوں کے مابین فرق بیان کرنا ہے۔ مثلاً عبدالعزیز خالد کے اس شعر میں الفاظ "حُسنِ کلام، صنعت گری؛ آمد اور آورد" کے مابین فرق بیان کیا گیا ہے، جس سے صنعتِ تفریق متشکل ہوتی ہے:

"حُسنِ کلام اور ہے، صنعت گری ہے اور
یہ فرق صرف آمد و آورد کا نہیں"(۶۰)

علمِ بدیع پر کامل دسترس مقرر کے فن کو نکھارنے میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے، مافی الضمیر کے اظہار میں نہ صرف ممد و معاون ہوتی ہے، بلکہ تقریر کو پُر اثر بھی بناتی ہے۔ صنعتِ تفریق کا بہترین استعمال ڈاکٹر اشرف علی کی تقریر میں دیکھیے:

"آج کا انسان قبل از مسیح کا انسان نہیں۔ وہ دھات اور پتھر کے زمانے سے بہت آگے نکل چُکا ہے۔ اب علم کی وسعتوں نے کرہ ارضی کے انسان کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے۔ وہ زمانہ نہیں رہا جب انسان اپنے ہی ملک میں اجنبی تھا۔ یا اُس پر سرکش انسان مار دھاڑ سے حکمران ہو جاتے تھے۔ آج کے انسان کا شعور جاگ اُٹھا ہے۔ وہ جغرافیائی حدوں کی تقسیم کے باوجود عالمی انسان ہے۔"(۶۱)

صنعت مبالغہ سے مراد کلام میں معائب و محاسن کو اس حد تک بڑھا چڑھا کر بیان کرنا جو حقیقی زندگی میں ناممکن ہو۔ مثلاً قتیل شفائی کے درج ذیل شعر میں صنعتِ مبالغہ کا بہ خوبی اہتمام موجود ہے:

"گُنگُناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بُوندیں
کوئی بدلی تیری پازیب سے ٹکرائی ہے"(۶۲)

مولانا ظفر علی خان کی خطابت اردو ادب کی چاشنی میں گندھی ہوئی تھی۔ دیکھیے، کس خوب صورتی سے صنعتِ مبالغہ کا استعمال کر کے سامعین کا انہماک اور ان کے ولولوں کو برانگیخت کرتے ہیں اور خطابت کا سحر طاری کر کے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

"قدرت نے ہم میں ہمالہ کی بلندی، بحرِ ہند کی گہرائی اور گنگا و جمنا کی روانی پیدا کر دی ہے۔ ہمارا کارواں مرتب ہو چکا ہے۔ جواہر لال سالارِ کارواں ہیں۔ حُدی خوانوں کے نغمے ہیں۔ جوانی کی اُمنگ و ترنگ ہے اور ہم سے ٹکرانے والے نوٹ کر لیں کہ وہ ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔ اپنی آزادی کے لیے ہم بے پناہ ہو گئے ہیں۔ ہم بنیانِ مرصوص ہیں۔ ہم نے اپنے اختلافات کی خلیج پاٹ دی ہے۔"(۶۳)

کسی امر یا واقعے کا علم ہوتے ہوئے بھی کلام میں اس سے لاعلمی کا اظہار کرنا، تجاہلِ عارفانہ کے زمرے میں آتا ہے۔ مثلاً اسلم انصاری کے مذکورہ شعر میں متذکرہ صنعت کا حسنِ استعمال دیکھیے:

"کون سا موڑ ہے، کیوں پاؤں پکڑتی ہے زمیں
اُس کی بستی بھی نہیں، کوئی پُکارا بھی نہیں"(۶۴)

سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تقریر میں تجاہلِ عارفانہ کی مثال ملاحظہ کیجیے:

"میں نے اپنی عمر اسی جدوجہد میں بِتا دی ہے۔ میں اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ تھک چُکا ہوں، میرے بالوں میں سفیدی آ گئی ہے، لیکن بعض دلوں کی سیاہی ابھی تک نہیں دُھلی، ان کے نزدیک ہم باغی ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ بغاوت کیا ہوتی ہے؟

کیا اپنی آزادی کا مطالبہ کرنا بغاوت ہے؟ اور جب یہ الفاظ وہ لوگ کہتے ہیں جنھیں
اپنے ہندوستانی ہونے سے انکار نہیں اور مسلمان کہلاتے ہیں، تو میرا دل کھول اٹھتا
ہے۔"(۶۵)

صنعت عکس سے مراد کلام میں الفاظ کی ترتیب میں خاص تغیر و تبدل کے تحت تکرار، جس سے خاص معانی پیدا ہو جائیں۔ رستم نامی کے بقول:

"کام کرتا ہے آدمی جب تک
آدمی کام کا نہیں ہوتا" (۶۶)

صنعت تکرار سے مراد کلام میں الفاظ کی تکرار ہے۔ مثلاً باقی احمد پوری کے درج ذیل شعر میں الفاظ کی تکرار صنعتِ تکرار کو ظاہر کرتی ہے:

"یہ عشق کا آزار قیامت ہے قیامت
کب تک دلِ بے چارا یہ آزار سنبھالے"(۶۷)

نواب بہادر یار جھنگ کی تقریر میں صنعت تکرار کی یہ عمدہ مثال دیکھیے:

"ہم نے مغرب کے نظریاتی چراغوں کی روشنی ہی کو اصل روشنی سمجھ لیا تھا۔ اقبال
نے ایک باطل کے مقابلے میں دوسرے باطل کی طرف داری کرنے سے انکار کیا
اور واشگاف لہجے میں کہا کہ ہم کسی باطل کا اس لیے ساتھ نہیں دے سکتے کہ وہ
جدوجہد کر رہا اور حریفِ باطل کو شکست دے کر اس کی جگہ لینا چاہتا ہے۔ غلطی کی
جگہ غلطی لے تو اس سے تصحیح نہیں ہوتی اور نہ خرابی ہی خوبی ہو سکتی ہے۔"(۶۸)

صنعتِ تعجب سے مراد کلام میں کسی خاص نکتے پر متکلم کا اظہارِ تعجب کرنا ہے۔ کبھی کبھی یہ اظہارِ تعجب طنز کے پیرائے میں بھی ہوتا ہے۔ مثلاً شبنم رومانی کا اظہارِ طنز صنعتِ تعجب کے پیرائے میں دیکھیے:

"دیکھتے ہیں گھر کے روزن سے جو نیلا آسماں
وہ بھی اپنے آپ کو اہلِ نظر کہنے لگے"(۶۹)

سردار عبدالرب نشتر اردو فنِ خطابت میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ان کے روشن اسلوب میں صنعتِ تعجب کی یہ مثال دیکھیے:

"کچھ لوگ پاکستان کے تصور کو شاعر کے خیال سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اگر ان کے خیال

میں پاکستان فی الواقع شاعر کا خیال ہے تو وہ اس سے پریشان کیوں ہیں؟ ان کی ذہنی صعوبت کا سبب کیا ہے؟ وہ اپنے سفر میں لگے رہیں، ہمیں اپنی دُھن میں چلنے دیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کے خیال حقائق کی دُنیا سے تعلق نہیں رکھتے، اس طرح کچھ لوگ اپنے دماغ کی اُڑانوں کا سہارا کر پاکستان کے موقف کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیتے ہیں، حیرت کا موجب ہے کہ انھیں بھی مسلمانوں کی حیات کا احساس ہے۔"(۷۰)

کلام میں دو افراد یا اشیا کے درمیان سوال و جواب کی صورت میں گفت گو یا مکالمہ صنعت سوال و جواب کہلاتی ہے۔ مثلاً مجید اختر کے مذکورہ شعر میں صنعتِ سوال وجواب کا استعمال دیکھیے:

"میں نے کہا کہ کیا کروں؟
اُس نے کہا کہ احتیاط"(۷۱)

"تعلیمِ تقریر" میں ابوالبیان آزاد نے ابوالکلام آزاد کی ایک شہرہ آفاق تقریر نقل کی ہے، اس کے آغاز میں ہی ابوالکلام آزاد سوالیہ اور مکالماتی انداز اپناتے ہوئے سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتے ہیں:

"تم نے کبھی غور کیا کہ ایمان کی شناخت کیا ہے؟۔۔۔لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ساری شناختیں تمھاری گڑھی ہوئی ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی ٹھہرائی ہوئی نہیں۔ بتلاؤ، کہ وہ ایک ہی شناخت کون سی ہے جو خود اللہ نے بتلائی ہو، اس کے رسول نے اس کی توضیع کی ہو؟ اس کے سچے پیروؤں نے اپنے عمل میں اس کا نمونہ دکھلایا ہو؟ وہ ایک ہی کسوٹی کون سی ہے؟ جو اس چمکتی ہوئی چیز کے کسنے کے لیے بنا دی گئی ہے؟۔۔۔حبِ ایمانی۔ یہ شناخت حبِ ایمانی کی شناخت تھی یعنی، اللہ اور اس کے رسول کی محبت!"(۷۲)

'سہل' عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا معنی "آسانی" ہے، جب کہ 'ممتنع' کا مطلب 'مشکل اور کٹھن' ہے۔ صنعت سہلِ ممتنع سے مراد جب کلام بہ ظاہر تو آسان معلوم ہو لیکن جب اس جیسا کلام کہنے کی سعی کی جائے تو مشکل اور دشواری کا سامنا ہو۔ مثلاً مذکورہ شعر سہلِ ممتنع کی صریح مثال ہے:

"وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا"(۷۳)

صنعت احتجاج بہ دلیل سے مراد کلام میں کسی موقف پر ڈٹ جانا اور پھر اس موقف کے متعلق ایسے دلائل لانا، جو تسلیم شدہ ہوں۔ مثلاً واحد سراج کے اس شعر میں صنعت احتجاج بہ دلیل کی مثال دیکھیے:

"وہ حفاظت سے مجھ کو رکھتا ہے
اپنی مرضی سے مارنے کے لیے"(۷۴)

ابوالکلام آزاد اپنی ایک تقریر کے دوران "حبِ اللہ اور حبِ رسول کو ایمان کی اصل شناخت" قرار دینے کا موقف اپناتے ہیں، اس ضمن میں وہ مستند قرآنی آیات اور احادیث کے حوالے سے استدلال پیش کر کے اپنے موقف کا اثبات کرتے ہیں، تقریر ایک حصہ ملاحظہ کیجیے:

"دونوں محبتوں میں اگر مقابلہ ہو جائے تو قدم اللہ اور اس کے رسول کی طرف نہ بڑھیں۔ کسی اور محبوب کی طرف بڑھیں تو ایمان ناقص ہو گیا، اس کی شناخت باقی نہ رہی، کسوٹی پر پورا نہ اترے اور تم ان لوگوں کی طرح ہو گئے، جن کی شناخت یہ بتلائی گئی ہے کہ یحبونھم کحب اللہ۔ ان میں نہ ہوئے جن کی شناخت یہ بتلائی تھی کہ والذین آمنوا اشد حباًللہ۔ اس بارے میں آیات و احادیث بے شمار ہیں، خطبے کا وقت محدود۔ حضرت انس سے مروی ہے۔ کہ فرمایا: لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین۔"(۷۵)

جب صاحبِ کلام بات سے بات نکالتا ہے اور استعمال شدہ الفاظ کے تتبع میں ایسے الفاظ اہتمام سے استعمال کرتا ہے کہ خوب صورت سلسلہ بن جاتا ہے، تو یہ کیفیت صنعت متتابع کہلاتی ہے۔ تقریر میں یہ خصوصیت موضوع کی تفہیم اور ترویج میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، اس سے نہ صرف بات مکمل طور پر سمجھ آجاتی ہے، بلکہ موضوع کی نئی جہات سامنے آتی ہیں۔ عصمت حمید کی نظم متوازی دنیا میں صنعتِ متتابع کی یہ عمدہ مثال دیکھیے کہ کس طرح بات سے بات نکالنے کی راہیں ہموار کی گئی ہیں:

"یہ کیا منطقہ ہے
یہاں
صبح کا شام میں
شام کا رات میں
رات کے دن میں
ڈھلنے کا احساس نہیں ہوتا

اس کی تقویم ہی مختلف ہے"(۷۶)

محولہ بالا مذکورہ صنائع ہیں جن کی وجہ سے کلام کو مزین اور مستحسن کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں بعض اوقات صنائع لفظی اور بعض دفعہ صنائع معنوی سے مدد لی جاتی ہے۔ کلام کی تزئین و تحسین کا دارومدار انھی صنائع پر ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ صنعتوں کے بغیر مدعا و مقصد کا اظہار نہیں ہو سکتا، کلام اور شاعری کا ایک بڑا حصہ صنعتوں سے تہی ہے۔ گویا یہ صنعتیں سخن کا مقصود و مطلوب نہیں لیکن اگر کلام میں یہ صنعتیں از خود در آئیں تو کلام کا لُطف اور اثر دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ یہی صنائع علمِ بدیع کے اجزا ہیں، مرزا سجاد بیگ کے الفاظ میں:

"صنائع لفظی لفظوں میں دل چسپی اور حُسن پیدا کرتے ہیں اور اس علم کو جس سے تحسین و تزئینِ کلام کے طریقے معلوم ہوتے ہیں، علمِ بدیع کہتے ہیں۔"(۷۷)

جلال الدین احمد جعفری اپنی جامع تصنیف "نسیم البلاغت" میں علمِ بدیع کی توضیح یوں کرتے ہیں کہ "علمِ بدیع وہ علم ہے، جس سے کلامِ فصیح و بلیغ کی لفظی و معنوی خوبیاں معلوم ہو جائیں۔"(۷۸)

خطابت میں علمِ بدیع حُسن اور جان پیدا کرتا ہے۔ خطابت کا تعلق چوں کہ گویائی اور شنوائی سے ہے، اس لیے مزین اور آراستہ کلام بولنے والے کی مہارت کا پتا دیتا ہے، نیز سننے والوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے مقرر کو اپنی تقریر کی آرائش و زیبائش کا خیال رکھنا چاہیے تاکہ وہ فنِ خطابت کے میدان میں کوئی قار ہائے نمایاں سر انجام دے کر ہمیشہ کے لیے داد و تحسین اور ستائش کا مستحق ٹھہرے۔ علمِ بدیع پر دسترس مقرر کا حلقۂ اثر وسیع کرتی ہے، نیز اس کو اپنی بات کی تفہیم و ترسیل میں کسی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا، وہ بہ آسانی اپنے مقصد میں ظفریاب ہوتا ہے۔ سید کلب مصطفیٰ نے "فنِ خطابت" میں تقریر میں صنائع بدائع کے استعمال کی افادیت کو جامعیت کے ساتھ قلم بند کرتے ہوئے مقررین کی توجہ اس سمت دلائی ہے، لکھتے ہیں:

"صنائع بدائع سے کلام میں جان پڑ جاتی ہے اور معمولی سے معمولی تقریر میں جادو کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، اس کے مشکل ترین مسائل کو بھی آسانی کے ساتھ سامعین کے ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔"(۷۹)

علمِ بدیع خطابت کے حُسن میں اضافے کا باعث ہے۔ اس سے مقرر کی فنی مہارت مزید نکھرتی ہے، اسے اظہارِ مدعا میں آسانی اور مقصد کی بہترین ترجمانی ممکن ہوتی ہے، طلاقتِ لسانی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ماہرینِ فن باقاعدہ اس فن کی تفہیم اور تعلیم پر زور دیتے ہیں۔ تاکہ جب نو آموز خطبا سامعین کے سامنے جائیں تو احسن طریقے سے اظہارِ خیال کر سکیں۔

## 3۔ علمِ معانی

علمِ معانی وہ علم ہے، جس میں الفاظ کے مفاہیم کو پرکھا جاتا ہے۔ معانی درحقیقت معنی کی جمع ہے۔ اس علم میں فصیح کلام کے برموقع اور برمحل ہونے سے بحث و تمحیص اور تحقیق و تدقیق کی جاتی ہے۔ اس علم پر دسترس بھی کلام کو معتبر اور مستند بناتی ہے۔ اصحابِ سخن مدتِ مدید سے اس علم سے مستفید و مستفیض ہوتے آئے ہیں۔

> "علمِ معانی وہ ہے جس کے ذریعے سے کلام کو مقتضائے مقام کے موافق ادا کرنے میں خطا نہ ہو اور کلام وہ ہے جو دو یا زائد کلموں سے مرکب ہو، پس اگر وہ بے اسناد ہے تو کلامِ ناقص ہے اور اگر بالاسناد ہے تو کلامِ تام۔"(۸۰)

اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ صاحبِ کلام کو اپنے مدعا و مقصد کو موقعِ محل کے مطابق اظہار کے ذرائع میسر ہوتے ہیں۔ فکری اغلاط و اسقام سے بچنے کے مواقع ملتے ہیں اور ان غلطیوں کے ازلے کا سبب معلوم ہوتا ہے۔ صاحبِ سخن کی بات کی تفہیم کے نئے در وا ہوتے ہیں۔

> "وہ علم جو کسی امر کو مقتضائے حال کے موافق بیان کرنا سکھاتا ہے اور ایسی غلطیاں کرنے سے بچاتا ہے، جس سے دلالتِ مطابقی کے موافق کلام کا مفہوم سمجھنے میں دوسرے شخص کو دقت ہو، علمِ معانی کہلاتا ہے۔"(۸۱)

کلام کا استحکام اور استناد علمِ معانی سے عبارت ہے، کیوں کہ محل اور مقام کو مدنظر رکھتے ہوئے اظہارِ مافی الضمیر کیا جائے تو سامعین و ناظرین پر اچھا تاثر جاتا ہے۔ اغلاط کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ ہر صاحبِ سخن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی بات زبان سے نکلے اور سامعین کے دلوں میں ترازو ہو جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب قارئین اور سامعین کلام کو سمجھ سکیں۔ علمِ معانی ہی وہ علم ہے جس کی بہ دولت ایک صاحبِ فن مذکورہ صفات سے متصف ہو سکتا ہے۔

ارسطو کے مطابق مقرر کو تقریر میں معانی کی فوری ترسیل کے لیے زبان، جذبات اور مدعا کو مربوط و مستحکم انداز میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب صاحبِ تقریر اس فن میں طاق ہو کہ وہ مذکورہ خصائص کو ربط و ضبط کے ساتھ پیش کر سکے۔ خطابت میں علمِ معانی ایک خاص کردار ادا کرتا ہے، کیوں کہ علمِ معانی سے شناسائی تقریر کی رعنائی میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ مقررین جب اس علم کے رمّاز ہو جاتے ہیں تو ان پر اظہار کے نئے طریقے منکشف ہوتے ہیں۔ مزید برآں، جب خطبا اس قابل ہو جاتے ہیں کہ وہ اس

علم کے احسن استعمال میں اتارو ہو جائیں تو ایک زمانہ ان کی فنی مہارت کا معترف ہو جاتا ہے۔ مقررین علمِ بیان کے اس حصے کو بھی باقاعدہ مشق کا حصہ بنا کر فنی محاسن کو مزید نکھارتے ہیں۔

> "Your language will be appropriate if it expresses emotion and character, and if it corresponds to its subject. 'Correspondence to subject' means that we must neither speak casually about weighty matters, nor solemnly about trivial ones... This aptness of language is one thing that makes people believe in the truth of your story: their minds draw the false conclusion that you are to be trusted from the fact that others behave as you do when things are as you describe them; and therefore, they take your story to be true whether it is so or not."(۸۲)

مقرر علمِ معانی کی بہ دولت ہی سامعین کی ذہنی استعداد اور صلاحیت کے مطابق ان سے مناسب انداز میں مخاطب ہو سکتا ہے۔ یہی علم بلاغت کو تقویت بخشتا ہے، جس کے باعث مدعا و مقصد احسن انداز میں نہ صرف طشت از بام ہوتا ہے، بلکہ سامعین مقرر کی تقریری صلاحیت کے بھی معترف ہو جاتے ہیں اور اس کی مقبولیت میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ یہی علم مقرر کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کس انداز میں اپنے موضوع سے متعلق مواد جمع کرے اور پھر اسے بالترتیب مخاطبین کی خدمت میں پیش کرے۔ خطابت کی سطوت، شان و شوکت اور حشمت اسی علم کی مرہونِ منت ہے۔

### 4۔ روزمرہ اور محاورہ

روزمرہ ایسے کلمات ہیں، جو اہلِ زبان روزانہ اپنی بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ اہلِ زبان ان لوگوں کو کہا جاتا ہے، جو کسی زبان کو بولنے میں مہارت رکھتے ہیں اور اظہارِ ما فی الضمیر خاص قرینوں اور قاعدوں کے پیرائے میں کرتے ہیں۔ روزمرہ کسی مخصوص قاعدے کا پابند نہیں ہوتا، روزمرہ کی سند اہلِ زباں کی بول چال سے حاصل ہوتی ہے اور وہی کلام فصیح و بلیغ کہلاتا ہے، جو روزمرہ کے مطابق اور موافق ہو، برعکسِ

ازیں کلام میں فصاحت و بلاغت متاثر رہتی ہے۔ وارث سرہندی نے اپنی کتاب "زبان و بیان" میں روزمرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "روزمرہ دراصل اہلِ زبان کے استعمال کا نام ہے۔ یعنی، اہلِ زبان اپنی روزمرہ بول چال میں الفاظ کو جس طرح استعمال کرتے ہیں، اسے اصطلاحِ زبان میں روزمرہ کہتے ہیں۔ بعض الفاظ قواعد کی رُو سے صحیح ہوتے ہیں مگر اہلِ زبان ان کو اس طرح استعمال نہیں کرتے، تو وہ روزمرہ کے خلاف ہوں گے اور صحیح ہوتے ہوئے بھی پایہ فصاحت سے ساکت ہوں گے۔"(۸۳)

وارث سرہندی نے روزمرہ کی مثالیں پیش کر کے اہلِ زبان کے استعمال سے پیدا ہونے والی معنی کی خصوصیت کو بڑی خوب صورتی سے عیاں کیا ہے۔ انھوں نے الفاظ "نامراد" اور "بے مراد" کے مفاہیم درج کر کے روزمرہ کے استعمال کے فرق کی توضیح کی ہے۔

> "مثلاً نامراد اور بے مراد کو لیجیے، قواعد کی رُو سے دونوں کا مفہوم ایک ہونا چاہیے، لیکن اہلِ زبان کے روزمرہ استعمال نے ان میں نازک فرق پیدا کر دیا ہے، چناں چہ نامراد کے معانی ہیں 'جس کی کوئی مراد پُوری نہ ہو' اور بے مراد کے معانی ہیں 'جو کوئی مراد ہی نہ رکھتا ہو'؛ ایک کے معنی میں محرومی ہے اور دوسرے کے معنی میں بے نیازی۔"(۸۴)

اہلِ زبان اپنی بول چال میں خاص الفاظ اور تراکیب کو زیادہ استعمال کرتے ہیں، وہ روزمرہ کہلاتے ہیں۔ اگر یہ اہلِ زبان کی بول چال کے قاعدوں اور قرینوں کے مطابق ہوں تو یہ فصاحت کا جھومر ہیں ورنہ یہ فصاحت کے خوب صورت چہرے پر بد نما داغ ہیں۔ خطابت میں روزمرہ کا مناسب استعمال تقریر کے حُسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مقرر کو خیالات کی ترسیل میں سہولت ہوتی ہے۔

دو یا دو سے زائد الفاظ کا ایسا مجموعہ جو حقیقی معانی کے بجائے مجازی معانی میں استعمال ہو اور اہلِ زبان کی بول چال کے عین مطابق ہو، محاورہ کہلاتا ہے۔ محاورے میں زبان کے قواعد کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی۔ الطاف حسین حالی اپنی معروفِ زمانہ کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" میں محاورے کی اہمیت و افادیت پر بحث کرتے اور اس کے استعمال پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "پس ضرور ہے کہ محاورہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے، کیوں کہ مفرد الفاظ کو

روزمرہ بول چال یا اسلوبِ بیان نہیں کہا جا سکتا۔ بہ خلاف لغت کہ اس کا اطلاق،
ہمیشہ مفرد الفاظ پر یا ایسے الفاظ پر جو بمنزلہ مفرد کے ہیں، کیا جاتا ہے۔"(۸۵)

حالی نے بہ طریقِ احسن محاورے کی تعریف و توضیح انتہائی مختصر مگر جامع انداز سے کی ہے۔ محاورات میں تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا، جیسے کہ معروف محاورہ "بھینس کے آگے بین بجانا" ہے، جس کے معنی و مفہوم میں یہ بات شامل ہے کہ کوئی شخص کسی نااہل کے سامنے اپنے ہنر اور کمال کا مظاہرہ کرے۔ اب یہاں کوئی شخص بھینس کی جگہ 'گائے یا بکری' کہے گا یا 'بین' کی جگہ 'بانسری یا ستار' کہے گا، تو یہ غلط ہو گا۔

خطابت میں روزمرہ اور محاورے تقریر کی رعنائی اور مقرر کی پذیرائی کو بڑھا دیتے ہیں۔ مفہوم کی ادائیگی میں آسانی ہوتی ہے۔ مقررین کے لیے روزمرہ اور محاورات پر کامل دسترس ضروری ہے، تاکہ وہ سامعین کی توقعات پر پورے اُتر کر زبان و بیان کے اعجاز دکھا سکیں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکیں۔ "خطابت و تقریر" از شمس الدین احمد، "فنِ تقریر" از ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد، "رموزِ خطابت" از نذیر الدین احمد، "فنِ خطابت" از سید کلبِ مصطفیٰ، "تعلیمِ تقریر" از ابوالبیان آزاد اور "فنِ خطابت" از شورش کاشمیری میں روزمرہ اور محاورات کے استعمال پر زور دیا گیا ہے کہ مقرر کو نہ صرف روزمرہ اور محاورات پر عبور ہونا چاہیے بلکہ محاورات اور روازمرہ کے بر محل استعمال کا بھی علم ہونا چاہیے، تاکہ مقرر دورانِ تقریر بر موقع زبان پر اپنی فنی مہارت ثابت کر سکے۔

"ایک مقرر کے لیے الفاظ، محاورے، روزمرہ،۔۔۔ کا مطالعہ و علم فنی طور پر ریڑھ
کی ہڈی ہے یا پھر خطابت کی نشو و نما کے لیے غذا۔"(۸۶)

## ب۔ مطالعہ اور خطابت:

مطالعہ کا عربی زبان کا لفظ ہے، قواعد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ثلاثی مجرد کے باب سے مشتق اسم ہے۔ جس کا مطلب "توجہ، غور، دھیان" ہے۔ کسی شے کو اس غرض سے دیکھنا کہ اس سے شناسائی حاصل ہو، مطالعہ کہلاتا ہے۔ مطالعے کا انسانی زندگی میں ایک اہم کردار ہے۔ اس کی بہ دولت مختلف علوم و فنون سے آگاہی اور آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ بہت سی غیر معلوم اشیا اور علوم کے بارے میں مطالعے کی بہ دولت جان کاری حاصل ہوتی ہے۔ علوم و فنون کے نئے راستے ہموار ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں، انسان کو جن علوم سے شناسائی حاصل ہوتی ہے، ان میں مزید وسعت، مہارت اور جدت پیدا ہوتی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ کتب بینی اور مطالعہ انسانی زندگی کی فوز و فلاح، ترقی و کام یابی اور کامرانی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہی اقوام دُنیا میں قابلِ قدر

حیثیت حاصل کرتی ہیں، جو اقتضائے حال کے مطابق و موافق علوم پر مطالعے اور تحقیق کی بہ دولت مہارت حاصل کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک پہلو کو ملحوظ رکھا جائے کہ مطالعے کے لیے ایسی کتب منتخب کی جائیں جو مفید ہوں، کیوں کہ بعض ایسی کتابیں بھی ہیں جو انسان کے علم و عمل اور شخصیت و کردار کے لیے زہرِ مار سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مطالعے کے لیے درست سمت کا تعین کر کے کتب کا انتخاب کرنا انتہائی اہم ہے، ورنہ مطالعہ بجائے افادیت کے نقصان کا موجب بنے گا۔ مفید مطالعہ انسان کی بنیادی اور اساسی ضرورت ہے۔ مقرر نے چوں کہ ہر موضوع اور عنوان پر اظہارِ خیال کرنا ہوتا ہے، اس لیے مقرر کے لیے مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسانی حیات کے لیے آکسیجن۔ مطالعہ علم اور معلومات میں بے بہا اضافے کا باعث بنتا ہے۔ مقرر کو اپنے موضوع سے متعلقہ مضامین و کتب اور جرائد و رسائل وغیرہ کا مطالعہ معمول بنانا چاہیے، تاکہ علم افزوں بھی ہو اور تر و تازہ بھی رہے۔ خطابت مطالعے سے پروان چڑھتی ہے، کیوں کہ اسی مقرر کو سامعین سنتے ہیں، جو ان کے مزاج کے مطابق ان کی علمی تشنگی مٹاتا ہے۔ خطابت ہر شعبہ ہائے حیات پر محیط ہے، اس لیے مقرر کو ہر طرح کے علوم کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ وہ تمام علوم جو اس کی خطابت کو نکھاریں، سنواریں اور سامعین کے ذوقِ سماعت کو ابھاریں۔ مقرر چوں کہ لوگوں کی رہ بری اور رہ نمائی کرتا ہے، ان کے اخلاق و کردار کو سنوارتا ہے، لہٰذا اسے اس پہلو کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ کس طرح اور کن ذرائع سے صحیح سمت کا تعین کر کے سامعین کو اس طرف راغب کرنا ہے۔ نیز، انھیں منزلِ مقصود تک پہنچانے میں کن پہلوؤں پر معاونت کرنی ہے۔ نذیر الدین احمد نے اپنی کتاب "رموزِ خطابت" میں مطالعہ کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرتے ہوئے سید سلمان ندوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

> "علمی زر و جواہر جن خزانوں میں سر بہ مہر محفوظ ہیں، ان کا نام کتاب ہے۔" ایک اور عالم کا قول نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "چراغِ فصاحت کے لیے تیل درکار ہے۔ تیل سے مراد مقرر کا مطالعہ ہے۔"(۸۷)

ارسطو نے مقرر کے لیے تحصیلِ علم کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس کے مطابق مقرر کو اپنے موضوع سے متعلق مکمل آگہی، معلومات اور دلائل پر کامل عبور ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں، ریاست کے جملہ معاملات اور حالاتِ حاضرہ سے مکمل واقفیت اس کی تقریری صلاحیت کو نکھارنے اور سامعین تک بہ طریق احسن اپنا موقف پہنچانے میں معان ہوتی ہے۔ مطالعے کی ذیل میں ارسطو مقررین کو کام یاب خطبا کی تقاریر کا بھی بالاستیعاب مطالعہ کرنے اور اس پر غور و خوص اور فکر و تدبر کرنے کی ترغیب دیتا ہے، تاکہ مقرر ان تمام

تقریر محاسن پر عبور حاصل کر سکے، جن کی بہ دولت کوئی کام یاب یانام ور مقرر عوام میں مقبولیت حاصل کر تا ہے۔ مطالعہ ہی وہ ذریعہ ہے جس سے مقررین متفرق موضوعات پر ضروری معلومات رکھنے میں کام یاب ہو سکتے ہیں۔ مقرر کے لیے اپنے موضوع کے تمام متعلقات پر کامل گرفت ہونالازم ہے، تاکہ کسی بھی اینٹی تھیسز کا سامنا کرنے کی صورت میں وہ فوری اور مدلل جواب دینے کے قابل ہو۔ نیز موضوع سے متعلق جملہ نکات کے مکمل علم سے ہی وہ بحث کو مدلل اور دلائل کو موثر بنا سکتا ہے۔

> "The main matters on which all men deliberate and on which political speakers make speeches are some five in number: Ways and means, War and peace, national defence, imports and exports, and legislation... These are the most important kinds of information which the political speaker must possess." (۸۸)

وہی مقرر کام یاب ہو سکتا ہے جو مختلف علوم کا ہمہ گیر علم رکھتا ہو۔ دیگر ذرایع کے علاوہ مطالعہ ومشاہدہ تحصیلِ علم کا بہترین اور مستند ترین ذرایع ہیں۔ اگر کوئی مقرر ماضی کے علوم پر گہری نظر رکھتا ہے اور حالیہ علوم سے نابلد و نا آشنا ہے تو اس کا چراغِ خطابت ٹمٹمانے لگتا ہے، روشنی مدھم پڑنے لگتی ہے اور حلقۂ اثر میں کمی واقع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ایسا مقرر جو قدیم علم، فن اور تکنیک کے ساتھ جدید علوم اور اظہار کے نئے پیرائے سے واقف ہے، نیز تازہ ترین صورت حال کے تمام پہلو اس کی نظر سے مخفی نہیں ہیں تو اسے سامعین کے سامنے لب کشائی کرتے ہوئے کسی دقت و تردد کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس کا مطالعہ اقتضائے حال کے جملہ پہلوؤں پر محیط ہے۔ ادارہ ادبیات اردو کی مرتب کردہ کتاب "فنِ تقریر" میں مطالعے کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے مصنف نے سسرو کا قول نقل کیا ہے: "مقرر ہونے کے لیے ایک شخص کو ہر ایک فن اور ہر ایک شے کا علم ہونا چاہیے۔" (۸۹)

سید کلب مصطفٰی نے اپنی کتاب "فنِ خطابت" میں مطالعہ کی اہمیت کو انتہائی اختصار کے ساتھ طشت از بام کرتے ہوئے مقررین کو اس جانب توجہ دلائی ہے کہ وہ قدیم وجدید تمام علوم پر گہری نظر رکھیں، تاکہ ہر موضوع پر تقریر کرتے ہوئے وہ مجوزہ موضوع اور اپنے فن سے انصاف کر سکیں، لکھتے ہیں کہ

> "مقرر کے لیے معلوماتِ عامہ کی بڑی ضرورت ہے اور اس کے لیے مطالعہ ومشاہدہ

اور فکر و نظر ناگزیر ہے۔"(۹۰)

اپنے عہد کے سب سے مقبول، دبنگ، منفرد لب و لہجے اور آہنگ کے حامل مقرر شورش کاشمیری مطالعے کی بابت اپنی کتاب "فنِ خطابت" میں رقم طراز ہیں کہ مطالعہ خطابت کا جوہر ہے۔ ایسا جوہر جس سے مقرر خاطر خواہ کام یابی سمیٹ سکتا ہے، مطالعاتی اور مشاہداتی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر فنِ خطابت کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دے سکتا ہے۔ وہ مطالعے کو خطابت کی زندگی اور سانسیں گردانتے ہیں۔ اگر خطابت سے مطالعے کو الگ کر دیا جائے تو اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور بالآخر خطیب وقت کی گرد میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔ جب کہ ایسا مقرر جو مطالعے کو اتنی ہی اہمیت دیتا ہے جتنی خود کو زندہ رکھنے کے لیے متوازن خوراک کو دیتا ہے۔ مقرر اگر مطالعے کو بھی فنِ تقریر کے لیے ضروری سمجھے تو وہ دنیائے خطابت میں امر ہو جاتا ہے۔ شورش کاشمیری نے مطالعے کی ناگزیریت کے حوالے سے اپنی کتاب "فن خطابت" میں لکھا ہے کہ

> "مطالعہ و مشاہدہ خطابت کے سونے کا سہاگہ ہے۔۔۔۔ایک خطیب و مقرر کے لیے حاصلِ مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا بدن کو زندہ رکھنے کے لیے غذا اور پیاس کو مٹانے کے لیے پانی۔ ایک خطیب کے لیے مطالعہ اس کی غذا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مطالعہ اس کا معمول ہو اور وہ جس طرح غذا اور پانی کے بغیر دن گزار نہیں سکتا، اس طرح مطالعے کے بغیر یہ محسوس کرے کہ اس کا دماغ آج بھوکا رہا ہے جو مقرر یا خطیب مطالعے سے ہاتھ اٹھا لیتے ہیں، خواہ اس خیال سے کہ انھیں مطالعے کی ضرورت نہیں رہی اور وہ خطابت کی معراج پر ہیں تو ممکن ہے کہ انھیں کچھ عرصہ مطالعاتی خلا کا احساس نہ ہو، لیکن وہ مطالعہ سے بچھڑ اور مشاہدہ سے بچھڑ کر خیالات میں ضعف کا شکار ہوتے اور ان کی خطابت کو لونی لگ جاتی ہے۔"(۹۱)

دورانِ مطالعہ بھی مقرر کو کچھ ضابطوں اور اصولوں پر کاربند ہونا پڑتا ہے۔ اگر وہ محض تفریح، وقت گزاری اور خانہ پُری کے لیے مطالعہ کر رہا ہے تو ایسا مطالعہ اس کے لیے باقاعدہ مدد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ مطالعہ کرتے ہوئے مکمل یک سوئی اور گہرائی سے تمام نکات کی پرکھ اور جانچ پڑتال کرنے، نیز انھیں اپنے الفاظ میں اشارات کی صورت رقم کرنے سے مطالعہ شدہ حصہ حافظے کا حصہ بن جاتا ہے۔ پھر اگر انھی نکات و اشارات کو وقفے وقفے سے دہرایا جائے تو وہ کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتے اور بہ وقت ضرورت برنوکِ زبان آ جاتے ہیں۔ نوٹس لینا حقیقی مطالعے کا اہم اصول ہے، اس کے بنا مطالعہ شدہ حصہ وسعتِ علم و دانش کا

سبب نہیں بن سکتا۔ مطالعے کے دوران میں مقرر کی نظر سے گزرے ہوئے اچھوتے، انوکھے اور موثر جملوں کو اگر مقرر اس نظریے سے نقل کر کے کہیں محفوظ کر لے کہ وہ انھیں دورانِ خطاب استعمال کرے گا تو یہ نہایت مفید عمل ہے۔ اسی طرح نئے افکار، خیالات اور نظریات کو بھی اس طریقے سے اپنے پاس محفوظ کرے کہ ان کو اپنے الفاظ میں ڈھال کر اقتضائے حال کے مطابق اپنے سامعین کی سماعتوں کے سپرد کرے گا تو یہ عمل بھی مدعا و مقصد کی ترسیل و تفہیم اور اثر پذیری کے لیے انتہائی مفید ہو گا۔ شورش کی تقریباً تمام عمر فنِ خطابت، ادب، صحافت اور سیاست میں صرف ہوئی۔ اس لیے وہ مذکورہ نکات اور موشگافیوں سے باقاعدہ آگاہ تھے، اس لیے انھوں نے مقررین کو مطالعہ کے چند موثر قرینے اور سلیقے بتائے ہیں، جن کو اپنا کر ایک مقرر اپنے علم کو وسعت، خیال کو رفعت، نظریے کو عظمت اور سامعین کو علومِ نو کی معرفت دے سکتا ہے۔

> "ہر وہ کتاب جو آپ مطالعے کے لیے منتخب کرتے ہیں اور اس کے مصنف و موضوع یا مولف و مضمون کے متعلق آپ کو اعتماد ہے تو اس کے نوٹ ضرور لیجیے، اس غرض کے لیے ایک کاپی رکھیے۔ اس کے نوٹوں اور خوب صورت جملوں کو دہراتے رہیے، تا آن کہ حافظے کا حصہ ہو جائیں اور دماغ انھیں محفوظ کرے۔"(۹۲)

مذکورہ حوالہ جات اور مرقوم خیالات اس حقیقت کو اظہر من الشمس کر رہے ہیں کہ مطالعہ خطابت سے منسلک لوگوں کے لیے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر بنیاد مستحکم اور مضبوط ہو تو یہ عمارت کی استواری اور مضبوطی کی ضامن ہے۔ خطابت کی عمارت بھی مطالعے اور مشاہدے سے عبارت ہے۔ وہی مقررین افقِ خطابت پر جگمگائے جنھوں نے مطالعے کو اپنی عادت و فطرت کا جزوِ لاینفک بنایا۔ کیوں کہ تازہ ترین معلومات و افکار سامعین کی بصارت و بصیرت اور سماعت کی متلاشی ہوتی ہیں۔ اگر کوئی مقرر اس رمز کو سمجھ لیتا ہے تو پھر وہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ سامعین کی علمی و فکری اور ذہنی و سمعی تشنگی اسی صورت میں مٹائی جا سکتی ہے، جب مقرر خود مطالعہ و مشاہدہ کے ذریعے نظری و نظریاتی اور علمی و عقلی طور پر سیراب ہو۔

## ج۔ اسلوبِ خطابت:

اسلوب عربی زبان کا لفظ، ثلاثی مجرد کے باب سے اخذ شدہ "سلب" سے مشتق ہے، جس کے مطالب میں "وضع، انداز، روش، ڈھنگ، طرز، سلیقہ، راہ" شامل ہیں۔ اطلاقی حوالے سے لفظِ اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ اسلوب فن کار کے ذاتی اور انفرادی خصائص کے برعکس اس کے طرزِ اظہار اور تخلیقی شاہ کار پر منحصر ہے۔ اہلِ فن کے اسلوب کو پرکھنے کے لیے اس کی شخصیت اور تخلیقی صلاحیت کا جائزہ کارگر

ثابت ہوتا ہے۔ یہ در حقیقت اظہارِ خیالات اور انکشافِ جذبات کا سلیقہ اور قرینہ ہیں۔ جب ہم کسی فن کار کے اسلوب کا جائزہ لیتے ہیں تو اس ضمن میں اس کی انفرادیت اور نبوغت کو مد نظر رکھا جاتا ہے کہ وہ کن خصائص کی بنا پر اپنے معاصرین سے ممیز و ممتاز ہے۔ کیوں کہ اظہارِ فن کے ذرایع کا اچھوتا اور نرالا ہونا ہی فن کار کو انفرادیت سے مملو کرتا ہے۔ علی رفاد فتیحی اپنی کتاب "ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ" میں نیومن اور مڈلٹسن مرے کا حوالہ دیتے ہوئے اسلوب کی تعریف درج کرتے ہیں کہ

> "اسلوب صرف ادیب کی داخلی شخصیت اور طرزِ مشاہدہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کے طرزِ احساس کا نام ہے۔ اسلوب نہ صرف ادیب بلکہ اس کی پوری تہذیب کے نقوش کا نام ہے۔"(۹۳)

گویا، کسی بھی فن کار کے طرزِ ادا، روشِ اظہار یا اندازِ بیان کا قرینہ اسلوب سے پتا چلتا ہے۔ یہی وہ خاصیت ہے، جو فن کار کے فکر و فن کو برتنے کے ذرایع طشت از بام کرتی ہے۔ خطابت کے حوالے سے اسلوب کو پرکھا جائے تو اس میں چند بنیادی خصائص "شکوہِ الفاظ، طنطنہ، اختصار و جامعیت اور ابلاغ" شامل ہیں۔ کسی بھی مقرر کے فن کی تفہیم اور اندازِ ترسیل مذکورہ محاسنِ اسلوب کی بنا پر کی جاسکتی ہے، کیوں کہ لب و لہجے کا قرینہ، ابلاغ و اظہار کا سلیقہ، مفاہیم و معانی کا طریقہ حتی کہ اس کی فنی تکنیک جو اس نے ادا و اظہار کے لیے خود اپنے لیے مختص کر رکھی ہے، وہی اس کا اسلوب و طرزِ ادا ہے۔

### 1۔ شکوہِ الفاظ:

شکوہ کا مطلب "دب دبہ، شان و شوکت، رعب" وغیرہ کے ہیں جب کہ الفاظ "لفظ" کی جمع ہے۔ مقرر اپنی تقریر کے دوران میں کن الفاظ کا چناؤ کرتا ہے اور انھیں کس طرح برتتا ہے، کیوں کہ اظہارِ خیال الفاظ کا محتاج ہے۔ اگر مقرر ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے، جو سامعین کے فہم کے مطابق ہونے کے علاوہ شان و شوکت اور متانت سے معمور ہوں، تو نہ صرف ابلاغ میں آسانی ہوتی ہے بلکہ خطیب کا اسلوب سطوت، شان و شوکت اور حشمت سے مزین ہو جاتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب مقرر لغت کا باقاعدہ اور بالاستیعاب مطالعہ کرے، ذخیرہِ الفاظ کو غیر معمولی حد تک بڑھائے، الفاظ کے مزاج کو سمجھے، پرکھے اور درست استعمال کا قرینہ سیکھے۔ کیوں کہ الفاظ مخصوص نوعیت اور مزاج کے حامل ہوتے ہیں، لہٰذا مقرر کو چاہیے کہ اسی نوعیت و مزاج کے مطابق موقعِ محل کی مناسبت سے استعمالِ الفاظ و تراکیب کے فن سے آشنائی و آگہی حاصل کرے۔ لفظوں کے استعمال کی رعنائیوں اور بوقلمونیوں سے آگہی مستند ادبا، شعرا، علما اور خطبا کی صحبت سے

حاصل ہوتی ہے۔ ان کے طرزِ ادا سے تلفظ کی نگرانی اور نگہبانی ہوتی ہے۔ اگر مقرر کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہے اور وہ مستند مقررین کے اسلوب پر گہری نظر رکھتا ہے، تو اس کے لیے پُر شکوہ الفاظ کے استعمال میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی۔ شورش کے مطابق

> "وہ چیز جس کا نام بیان کا جادو ہے، ہر مقرر کی انفرادیت اور الفاظ کی وجاہت سے پیدا ہوتا ہے۔ بھولیے نہیں کہ الفاظ کا بانک پن فقروں کی آرائش سے ابھرتا اور مقرر کا جوبن اظہار و اسلوب کے زاویوں سے مترشح و مرتب ہوتا ہے۔۔۔ آپ کے الفاظ آپ کے ذہن کا بجٹ ہیں۔"(۹۴)

ارسطو نے "ریطوریقا" میں شکوہِ الفاظ کے ضمن میں کہا ہے کہ روایتی انداز و الفاظ کے برعکس تقریر میں معیاری اور متین الفاظ کا استعمال خطابت کی تاثیر میں افزونی کا باعث ہے۔ مقرر متذکرہ الفاظ اسی وقت خوب صورتی سے برت سکتا ہے، جب وہ زبان پر مکمل دسترس رکھتا ہو، قواعد و انشا کے مطابق زبان دانی کا مظاہرہ کرے اور موضوع سے متعلق مناسب، مہذب اور موزوں الفاظ کے استعمال سے اپنے خیالات کی ترویج کرے۔ ارسطو کے مطابق اس سلسلے میں مقرر نام ور مقررین کی تقاریر کو سن کر، مستند شعرا کے کلام کو پڑھ کر، معتبر ادبا کے فن پاروں کے مطالعے سے نئے الفاظ کا حصول، تلفظ کی صحت کی سند، جملوں کی ترکیب کی مہارت، مطالب و مفاہیم کے خفی اور جلّی پہلوؤں، مترادفات کے استعمال کے زاویوں سے آگاہی و آشنائی حاصل کر کے اظہارِ خیال میں دل کشی، دل فریبی اور رعنائی پیدا کرتا ہے۔

> "The foundation of good style is correctness of language, which falls under five heads. (1) First, proper use of connecting words, and the arrangement of them in the natural sequence... (2) The second lies in calling things by their own special names and not by vague genral ones. (3) ... to avoid ambiguities; unless, indeed, you definitely desire to be ambigious ... (4) to observe Protagoras' classification of nouns into male and female and inanimate; (5) to express plurality, fewness and unity by correct wording." (۹۵)

حروفِ رابطہ کا بر محل اور فطری ترتیب میں استعمال، اشیا کو معروف مگر غیر مہذب القاب کے بجائے ان کے مخصوص اسما سے پکارنا، مبہم یعنی ذو معانی الفاظ و تراکیب سے گریز برتنا، تذکیر و تانیث کا درست استعمال اور اشیا کی کثرت و قلت اور اتحاد کو مخصوص اصطلاحات کے ساتھ پکارنا دورانِ تقریر اچھے انداز اور شکوہِ الفاظ کے ضامن ہیں۔ وہی مقرر میدانِ خطابت میں ممایزت اور انفرادیت سے مملو ہو کر قبولِ عام اور دوام حاصل کرنے میں کام یاب ہوتا ہے، جو صحیح معنوں میں استعمالِ الفاظ پر کامل قدرت اور مہارت رکھتا ہے۔ نئے زاویوں اور نئے ذریعوں سے سامعین کے ذہنوں اور دلوں پر اپنے مدعا و مقصد کے تمام نقوش مرتسم کرتا ہے۔ ایسے الفاظ سے اپنی تقریر کو تہی رکھتا ہے، جو متروک ہو چکے ہوں، سننے والوں کی فکری استعداد انھیں سننے سے انکاری ہو یا وہ جو شکوہ، طنطنے اور شعشعے سے محروم ہوں۔ گویا تقریر کا بہترین مرقع بہترین الفاظ سے ہی تشکیل پاتا ہے۔

## 2۔ طنطنہ

طنطنہ عربی زبان کا لفظ ہے، جس کے معانی "رعب داب، شان و شوکت، غصہ، بدمزاجی، تکبر، غرور، گھمنڈ، شور و غلغلہ "ہیں۔ اصطلاح میں اس سے مراد مقرر کا جوش و جذبہ اور ولولہ ہے، جو دورانِ تقریر میں از خود موقعِ محل کے مطابق تقریر کے اتار چڑھاؤ کے دوران پیدا ہوتا ہے۔ یہ خطابت کا حسن اور مقرر کے اظہارِ کمال کی دلیل ہے۔ اگر وہ اس بر موقع و بر محل استعمال کرتا ہے تو سامعین کا انہماک اور توجہ بڑھ جاتی ہے، نیز وہ خود بھی احسن طریقے سے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرتا ہے۔ اس کا جوش و خروش اگر ہوش میں رہتے ہوئے سامعین تک اپنے مدعا پہنچانے میں کام یاب ہو جاتا ہے تو اس کا فائدہ یہ ہے کہ وہ جس طرح اور جس طرف چاہتا ہے سامعین کے قلوب و اذہان اور طرزِ افکار کو موڑ لیتا ہے۔ اسے اس مقصد میں کام یابی و کام رانی اپنے ہم سے اور طنطنے کی بہ دولت ہی ملتی ہے۔ تقریر کا یہ حصہ اس وقت "نکتۂ کمال" تک پہنچتا ہے، جب پُر شکوہ الفاظ کے چناؤ اور متین جملوں کے بناؤ سے اپنے مقصد کی حرارت سے الاؤ روشن کر کے سامعین کے جذبات میں حدت اور حرارت پیدا کرتا ہے جو ان کی سہل پسندی اور آرام طلبی کو مفقود و معدوم کر کے انھیں منزل کی جانب گام زن کرتی ہے۔ ان کی قوتِ عمل کو فزوں کر کے ایسے مقصد کے حصول کے لیے متحرک کر دیتی ہے، جس مقصد کا حصول عام حالات میں ممکن نہیں ہوتا۔ بہزاد لکھنوی کے زاویہ الفاظ میں:

"اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے"

خطابت کا یہ وصف مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی بنا پر نکھرتا اور سنورتا ہے۔ مسلسل مشق مقرر کی مہارت کو بڑھاتی اور اس کے فن میں جادوئی خاصیت پیدا کرتی ہے۔ پھر وہ اسی خاصیت کی بہ دولت اپنے سننے والوں کو مسحور کرتا ہے۔ اپنے حلقۂ اثر میں نمایاں اور غیر معمولی تغیر و انقلاب پیدا کرتا ہے۔ خطابت کی خوب صورتی طنطنہ ہے اور طنطنہ آواز کا مناسب زیر و بم اور فنی اصولوں کی پاس داری میں مضمر ہے۔ اگر فنی قواعد کو ملحوظ رکھا جائے، زورِ بیان کو بہ طریق احسن برتا جائے تو تقریر میں ایک غیر معمولی تاثیر در آتی ہے۔ انھی خصائص کی بنا پر مقرر پل بھر میں چمنِ خیال کے مختلف حصوں کی سیر کراتا ہے، کارزارِ خطابت کے جوہر دکھا کر متنوع محاذوں پر لے جاتا ہے۔ جامد جذبات میں حیران کن تلاطم پیدا کرتا اور مثبت تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنی حاضر کلامی اور برجستہ گوئی سے مستفید ہوتا ہے۔ لفظوں کے صوتی جمال میں گھن گرج پیدا کرنے اور لب و لہجے کے زیر و بم کی صحیح تفہیم دو الفاظ میں مضمر ہے، وہ ہے محنت اور مشق۔ سید کلب مصطفٰی زورِ بیان، شدتِ اظہار، فطری زیر و بم اور طنطنے کو خطابت کا لازمہ قرار دیتے ہیں۔ رقم طراز ہیں:

> "جب مقرر کسی ایک لفظ یا متعدد الفاظ پر زور دے کر انھیں دوسرے الفاظ سے ممتاز بنا دیتا ہے تو زورِ بیان کی تخلیق ہوتی ہے۔۔۔ زورِ بیان سے مراد نہ تو چیخنا چلانا ہے اور نہ دقیق لغات یا بہت شان دار الفاظ کا استعمال، بعض اوقات خاموشی سے بھی بیان میں زور پیدا ہو جاتا ہے اور مناسب محل پر تکرار الفاظ سے بھی۔۔۔ آواز کو بلند سُروں سے پست سُروں میں اور پست سُروں سے بلند سُروں میں منتقل کرنے سے بھی زورِ بیان پیدا ہوتا ہے اور کلام کا اثر بڑھ جاتا ہے۔"(۹۶)

ارسطو نے Ethos یعنی مقرر کے وہبی و کسبی خصائص کے ضمن میں یہ بتایا ہے کہ وہی شخص عوام میں مقبولیت اور برتری حاصل کرتا ہے، جو سماج میں وجاہت، شان و شوکت، حشمت، سطوت، طاقت اور اچھی شہرت کا حامل ہوتا ہے۔ وہی مقرر اپنی تقریر میں موثر جوش، ولولہ، طنطنہ و دب دبہ پیدا کر سکتا ہے، جو متذکرہ صفات سے متصف ہو۔ ذہن نشین رہے کہ "ریطوریقا" کے مطابق طنطنے سے مراد غل غپاڑا مچانا، آواز کو بے طرح بلند کرنا اور چیخنا چلانا نہیں ہے، بلکہ سوبر انداز اور شائستہ آواز میں موضوع اور مواد کی اقتضا کے مطابق لب و لہجے میں فطری طور پر کہیں تیزی اور روانی، کہیں ٹھہراؤ اور وقفہ، کہیں رعب و دب دبہ، کہیں

نرمی و ملائمت، کہیں سختی و درشتی، کہیں دھیما پن اور اتار، کہیں زور اور چڑھاؤ پیدا کرنا ہے۔ اسلوبِ بیان اور طرزِ اظہار کے یہی پہلو تقریر میں تاثیر، رغبت، کاملیت، جامعیت اور افادیت پیدا کرتے ہیں۔ اسلوبِ اظہار کی یہی تکنیکیں فطری رنگ میں ڈھل کر تقریر کے آہنگ کو نیا ڈھب اور منفرد ڈھنگ عطا کرتی ہیں۔

## 3۔ اختصار و جامعیت:

اختصار عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب "طوالت کی ضد، چھوٹا پن اور خلاصہ" کے ہیں۔ جامعیت بھی عربی زبان کا لفظ ہے جو لفظ 'جامع' سے مشتق ہے۔ اس کے معانی میں "وسعت، ہمہ گیری اور اکملیت" شامل ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ مقرر اپنے مافی الضمیر کا اظہار انتہائی مختصر اور جامع انداز میں کرے۔ جس موضوع پر تقریر کر رہا ہے، اس کا کوئی پہلو سامعین سے مخفی اور پوشیدہ نہ رہے۔ اپنے مدعا و مقصد کے تمام تر دلائل و اثبات غیر ضروری طوالت سے پرہیز کرتے ہوئے، اختصار کے پیرائے میں سمیٹ کر جامعیت کے ساتھ پیش کرے، کیوں کہ غیر ضروری طوالت دل چسپی کو معدوم کرتی ہے اور نتیجتاً اکتاہٹ جنم لیتی ہے۔ جس کہ وجہ سے مقرر کا حلقۂ اثر متاثر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، اختصار توجہ، انہماک اور فنی مہارتوں کا متقاضی ہے، کیوں کہ مقرر کو اپنی تقریر اتنی زیادہ مختصر بھی نہیں کرنی چاہیے کہ موضوع کا حق ادا نہ ہو سکے اور سامعین کے دامن ہائے سماعت خاطر خواہ معلومات و دلائل سے تہی رہ جائیں۔ یہ وصف بھی اس وقت درجۂ کمال تک پہنچتا ہے، جب مقرر مشقِ پیہم کو اپنا شعار اور وطیرہ بنالیتا ہے، کیوں کہ اختصار و جامعیت کا وصفِ کمال بھی مطالعے کی گہرائی، مشاہدے کی گیرائی، نام ور مقررین کی تقاریر کی بہ غور قرات و سماعت، برجستہ و برمحل اظہارِ خیالات پر قدرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اختصار اور جامعیت خطابت کے حسن کو بڑھاتے ہیں۔ ارسطو نے تقریر کی تنظیم و ترتیب کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ تمہید، بیانِ مدعا اور استدلال و اختتامیہ یہ چاروں حصص اختصار اور جامعیت کا مرقع ہوں۔ متذکرہ حصص میں کوئی پہلو اس قدر طویل نہ ہو کہ تقریر کا تاثر متاثر ہو اور اصل مقصد مفقود ہو جائے، لہٰذا ضروری ہے کہ مقرر اپنا مدعا و استدلال مختصر اور جامع انداز میں پیش کرے۔

اختصار و جامعیت موقعِ محل اور موضوع کی نزاکتوں کو مدنظر رکھ کر ان تمام معلومات کو جن سے موضوع کا ہر گوشہ اور پہلو روشن ہو سکتا ہے، انھیں یک جا کر کے مناسب اظہار کے پیرائے میں تمام تر فنی محاسن اور اجزائے خطابت، یعنی تکنیک، آواز، سلاست، متانت، اسلوب، ظرافت، استدلال، اشارات، تمثیلات اور انفرادیت کو اپنے تجربے، مشاہدے اور مہارت کی بنا پر بہ طریق احسن پیش کیا جائے۔

## 4۔ ابلاغ:

ابلاغ عربی زبان کا لفظ ہے، اور 'بلغ' سے مشتق ہے، مافی الضمیر، بات، پیغام، عقائد یا علوم وغیرہ تحریری، علامتی یا اشاراتی صورت میں دوسروں تک پہنچانے یا بھیجنے کا عمل ابلاغ کہلاتا ہے۔ خطابت کا مقصد ہی ابلاغ ہے۔ کیوں کہ یہ ترسیلِ خیالات کا سب سے عمدہ ذریعہ ہے۔ مقرر اس ضمن میں مختلف فنی عناصر کو بروئے کار لا کر ابلاغ میں کامیابی و کامرانی حاصل کرتا ہے۔ اجزائے خطابت اس سلسلے میں معاونت کرتے ہیں، جن میں سرفہرست آواز ہے۔ مقرر بہ ذریعہ مشق اپنی آواز کو اس حد تک موثر بنالیتا ہے کہ وہ ابلاغ و تبلیغ کے لیے موزوں ہو جاتی ہے۔ آواز کا زیر و بم ابلاغی قوت کو بڑھاتا ہے، پھر تقریری محاسن کو مد نظر رکھتے ہوئے مزین اظہار بھی اعانت کرتا ہے۔ خطابت کی مخصوص تکنیک، لب و لہجے کا آہنگ اور الفاظ و معانی کی ترنگ ابلاغ و اظہار کو شائستہ بناتا ہے۔ زبان و بیان کی ادائی، اسلوب کی رعنائی بھی مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اہم ترین خصوصیت 'سلاست' ہے۔ جب مقرر کی تقریر روانی سے معمور اور الجھاؤ اور اٹکاؤ سے مبرا ہوتی ہے تو خطابت کے جوہر نکھرنے لگتے ہیں۔ متانت ابلاغی قوت کو مستحکم کرتی ہے۔ غیر سنجیدہ، تمسخر اڑاتی تقاریر مداری کے تماشے کی طرح ہے۔ متانت اور سنجیدگی روئے خطابت کا اطمینان اور سکون ہے۔ موقع محل کی مناسبت سے کیے جانے والے اشارات بھی تقریر کے مدعا کی ترویج میں کلیدی کردار رکھتے ہیں۔ اعتدال کے دائرے میں رہتے ہوئے اور ابتذال سے دامن بچاتے ہوئے تقریر میں ظرافت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ نیز، دل چسپی بڑھتی ہے اور مدعا کی ترسیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مدعا کی تفہیم کے لیے تمثیلات کا استعمال بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔ استدلال کے بغیر اثر اور ترسیل محال ہے۔ موضوع کے تحت برموقع و برمحل دلائل کا استعمال تقریر کو اثر انگیز اور تحرک سے لبریز بناتا ہے۔ انفرادیت اور تجربے کی بنا پر موضوع کی ترسیل کے لیے تراشے گئے الفاظ، جملے اور عبارتیں اسلوبِ خطابت کے لیے "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق ٹھہرتے ہیں۔ یہ خطیب کا تجربہ ہی ہے جو مقرر کو اس نہج تک پہنچا دیتا ہے کہ اِدھر وہ اظہارِ خیال کرتا ہے اور اُدھر سامعین کے قلوب و اذہان پر پر بات من و عن ثبت ہونے لگتی ہے۔ مقرر کو شائستگی اور شگفتگی سے تقریر میں تاثیر پیدا کرنی چاہیے۔ ڈیل کارنیگی اپنی کتاب "گفتگو اور تقریر کا فن" میں سر آلیور لاج کا قول نقل کرتے ہوئے فنِ تقریر کے ضروری عناصر بیان کرتے ہیں، جو ابلاغ پر براہ راست اثرانداز ہوتے ہیں:

"پہلا ضروری عنصر موضوع کا علم اور اس کی تیاری اور دوسرا ضروری عنصر خیالات کی وضاحت ہے۔"(۹۷)

اسی طرح سید کلب مصطفٰی تقریر کو موقعِ محل کی مناسبت سے ڈھالنے کو کام یاب ابلاغ کی صورت قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مقرر کو سامعین کی ذہنی استعداد اور مقام و محل کو مد نظر رکھتے ہوئے تقریر کی بنت اور ترسیل کرنی چاہیے تاکہ خطابت سریع الابلاغ ہو۔ اپنے خیالات کو ان الفاظ میں سپردِ قرطاس کرتے ہیں:

> "کلام کا مقتضائے حال کے موافق ہونا بلاغت ہے۔ مقرر کو چاہیے کہ وقت و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے تقریر کرے، یعنی اس پر نظر رکھنا ضروری ہے کہ وہ کس ماحول میں تقریر کر رہا ہے اور کس ذہنیت کے مجمع سے مخاطب ہے، تاکہ اسی اعتبار سے وہ الفاظ و خیالات اور اندازِ بیان میں مناسب تبدیلی کر سکے۔"(۹۸)

عبد الرحمان بٹالوی نے اپنی مدونہ کتاب "خطباتِ شورش" میں بہ طور افتتاحی کلمات سید عطاءاللہ شاہ بخاری کے چند قیمتی الفاظ نقل کیے ہیں، جو ابلاغِ خطابت کو جامعیت و اختصار کے ساتھ اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں:

> "خطابت اپنا کوئی موضوع نہیں رکھتی، لیکن ہر موضوع کے ابلاغ کا نام ہے۔ خطیب وہی کام یاب ہوتا ہے، جو عوام کو ان کی سطح سے اٹھا کر اپنی سطح پر لے آئے۔ خطابت فنونِ لطیفہ کی غیر مرئی آواز کے اجتماعی حسن کا نام ہے۔ چہروں کا حسن آنکھیں چنتی ہیں، آواز کا حسن کانوں سے چنا جاتا ہے۔"(۹۹)

ارسطو نے "ریطوریقا" میں ابلاغ کو تقریر کا بنیادی لازمہ قرار دیا ہے۔ وہ تمام ذرائع بتائے ہیں، جن کی وجہ سے ابلاغ کی راہیں ہموار ہوتی ہیں، نیز ان تمام ذرائع سے مقرر کو گریز برتنے کی تنبیہ کی ہے جو ابلاغ کی راہیں مسدود کرتے ہیں اور مقرر کے مدعا و مقصد کو محض ایک خاص طبقے تک محدود کرتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے سامعین کی نفسیات کے متعلق طویل بحث کر کے اس نکتے کو واضح کیا ہے کہ کس طرح مقرر اپنے مقصد و منشا کو بہ طریق احسن سامعین کے قلوب و اذہان تک پہنچا سکتا ہے۔ خطابت کا براہ راست تعلق مقرر اور سامعین کے ساتھ ہے۔ جب تک کوئی مقرر سامعین کی ذہنی و فکری سطح اور علمی استعداد سے آشنا نہیں ہے، اس وقت تک وہ اپنے مطلوبہ ہدف میں کام یاب نہیں ہو سکتا۔ مذکورہ بالا تمام عناصر اور خصائص اگر مقرر کی تقریر کا لازمہ بن جائیں تو اس کا فن نہ صرف معائب سے تہی ہو کر مستحکم ہوتا ہے، بلکہ ابلاغ کے راستے بھی ہموار ہوتے ہیں۔ مقرر کی تقریر لمحہِ رواں کی طرح بے اثر ہو کر نہیں گزرتی بلکہ اس کا ایک ایک گوشہ سامعین

کی یاداشت کا جزو بن کر انھیں عمل پر ابھارتا ہے۔ گویا، ان خصائص کو اپنا کر مقرر ابلاغی رعنائیوں کے ذریعے مقصدیت کی ارفعیت کو پالیتا ہے۔

## د۔ نامور مقررین کی تقاریر کا جائزہ

ارسطو اپنی کتاب "ریطوریقا" میں مختلف ابحاث میں اپنے موقف کو مستحکم کرنے کے لیے کام یاب مقررین کی تقاریر کے کچھ حصص بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں۔ ان کی یہ روش اس لیے کارگر ثابت ہوئی، کیوں کہ اس طریقہ کار کے ذریعے وہ اپنے مقصد کی تفہیم و ترسیل میں کام یاب ہو جاتے ہیں اور دوسرا ان کی بات مستند ہو جاتی ہے۔ فنِ خطابت پر لکھی گئی اردو کتب میں اکثر مصنفین نے کتاب کے آخر میں کام یاب اور معروف مقررین کی تقاریر کو نقل کر کے ان کا مختصر تجزیہ پیش کیا ہے، اس کے برعکس ارسطو مکمل تقاریر رقم نہیں کرتے۔ بلکہ اپنے پیش کردہ نکات کی ذیل میں متذکرہ نکتے کی تفہیم و دلیل کے لیے مختلف مقررین کی تقاریر میں سے زیرِ بحث نکتے سے متعلق حصے کو نقل کر کے اس کے محرکات و اثرات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ مثلاً ارسطو اگر تشبیہات اور استعارات کے باعث پیدا ہونے والے تقریری حُسن کو بیان کرتے ہیں تو اس ضمن میں کسی مستند مقرر کے استعمال کردہ تشبیہات اور استعارات کو بھی بیان کرتے ہیں کہ کس خوب صورتی سے انھوں نے اپنے مقصد کی ترویج کے لیے اس فنی مہارت کو برتا ہے اور پھر وہ مستعمل تشبیہ اور استعارے کے پس منظر بھی بیان کرتے ہیں۔ ارسطو کی اسی روش کی جھلک فنِ تقریر کے موضوع پر لکھی گئی اردو کتب میں بھی ملتی ہے، تاہم ان کا طریقہ تسوید ارسطو کی نسبت مختلف ہے۔ "ریطوریقا" میں ارسطو نے اپنے موقف کی بحث کے ساتھ ساتھ تقاریر کے مختصر اقتباسات درج کر کے ان کا تجزیہ پیش کیا اور اپنے موقف کو مستند کیا، جب کہ اردو مصنفین نے موقف کی بحث کے دوران میں مختصر اور طویل اقتباسات کو بہ طور دلیل پیش کیا ہے، نیز کتاب کے آخر میں نامور اور کام یاب خطبا کی تقاریر کے مفصل اقتباسات یا مکمل تقاریر کو درج کر کے مختصر تجزیہ تحریر کیا ہے۔ کتاب کے حصہ اول میں خوشی کے محرکات کی تصریح کرتے ہوئے ہومر کے ایک قول سے غصے کو بعض مخصوص حالات میں باعثِ مسرت ثابت کرتے ہیں، ہومر کا یہ قول اکثر مقررین کے لیے کارگر ثابت ہوتا ہے:

> "Hence even being angry is pleasant-Homer said of wrath that 'Sweeter it is by far than the honeycomb dripping with sweetness.' For no one grows angry with a person on whom

there is no prospect of taking vengeance, and we feel comparatively little anger, or none at all, with those who are much our superiors in power." (۱۰۰)

اردو فنِ خطابت کے میدان میں ایسے مقررین کا تذکرہ بھی ملتا ہے جن پر خطابت خود نازاں ہے۔ ان کی عظمت و رفعت آج بھی مسلّم ہے۔ ان کی تقاریر میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں موجود ہیں، جو فنی تقاضوں کو بہ طریق احسن پورا کرتی ہیں۔ ان کا اسلوب، اظہار، تکنیک، لب و لہجہ غرض فن کا ہر حصہ اور گوشہ بو قلمونیوں سے مزین ہے۔ الفاظ کی سجاوٹ، معانی کا عنفوان، بلاغت کا ریعان، فصاحت کا کیف، تمثیلات کا حسن، استعاروں کی شستگی، تشبیہات کی رعنائی، فقروں اور جملوں کی گل کاری، مطالب و مفاہیم کی یک جہتی جب یک جاہو جاتی ہے تو ابوالکلام آزاد کی خطابت جنم لیتی ہے۔ ابوالکلام آزاد کی تقریر کا یہ حصہ دیکھیے:

"سیاست ایک آگ ہے، جو پہلے خود بھڑکتی، پھر بھڑکائی جاتی ہے۔ جس حکومت سے ہمارا واسطہ ہے، اس کا شعار ہو گیا ہے کہ نہ تو ہمیں عزت کے ساتھ جینے دیتی ہے اور نہ عزت کے ساتھ مرنے دیتی ہے، جو ہمارے راستے کی روک ہے۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ آزادی کا جو چولھا دھک رہا ہے اس کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے ایندھن جمع کروں، پھر اپنے دامن سے ہوا دوں اور چولہے کو دھکا تا رہوں۔ آگ بھڑک رہی ہے، چولھا گرم ہے اور اب کوئی سی طاقت اپنے کسی گھمنڈ یا زعم میں ہمارے ولولوں کو سرد کرنے کی حوصلہ نہیں کر سکتی۔ ہماری صبحِ آزادی قریب آچکی ہے اور پو پھٹنے ہی والی ہے۔ جس اقتدار کی نمایندگی مسٹر چرچل کرتے ہیں، اس کی شام آچکی ہے، سورج جا چکا ہے، دن ڈھل گیا ہے۔" (۱۰۱)

اسی طرح ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء کو اجلاس خصوصی انڈین نیشنل کانگریس کی تقریر کا یہ ابتدائیہ دیکھیے:

"دنیا تیزی کے ساتھ ایک نئے پلٹے کے لیے جھک رہی ہے۔ وہ باتیں جو کل تک غیر متزلزل حقیقت سمجھی جاتی تھیں، اب جنبش میں آیا ہوا تزلزل ہیں۔ دنیا کے اصولوں اور عقیدوں کی طرح اس کے حدود اور خطوط بھی مل رہے ہیں۔ کتنی ہی بلندیاں ہیں، جو گر کر پست ہو رہی ہیں اور کتنی ہی پستیاں ہیں جو اٹھ کر بلند ہو رہی ہیں۔ عروج اپنے انتہا سے زوال کی ابتدا کر رہا ہے اور مایوسیوں کی تاریکی بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہنچ چکی ہے، جس کے بعد سے صبح شروع ہو جاتی ہے۔ کون دیکھ سکتا

ہے کہ مستقبل کے دامن میں کیا ہے۔"(۱۰۲)

ابوالکلام آزاد کی خطابت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ عوامی نفسیات اور خیالات اور عصری رجحانات کو مد نظر رکھ کر اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ایسا طرزِ اظہار اختیار کرتے ہیں جو خطابت کی داخلی اور خارجی خوبیوں سے مملو ہوتے ہیں۔ ان کی تقاریر سن اور پڑھ کر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ ان خطبات میں ایک مفکر کا عمق، شاعر کی طرزِ ادا، سپہ سالار کا دب دبہ، صاحبِ تدبیر کا تجربہ، فلسفی کی منطق اور نباض کی پرکھ مضمر ہے۔

> "وہ زمانہ آ گیا ہے، جس کا انتظار تھا، نگاہ اٹھاؤ اور دیکھو کہ جنگِ عظیم گھنگھور گھٹاؤں کی طرح سروں پر منڈلا رہی ہے۔ نہ جانے کب جل تھل ہو۔ غیب کا علم تو اللہ کو ہے۔ وہی علام الغیوب ہے۔ لیکن مشیتِ ایزدی نے ظالموں کا یومِ حساب قریب کر دیا ہے۔ جنگ ہو گی، ضرور ہو گی۔ یورپ کے میدانوں میں ہو گی اور اپنی ہولناک بربادیوں کے ساتھ پھیل جائے گی۔ جو چیز پردہِ غیب میں ہو، اس کے بارے میں حکم نہیں لگایا جاسکتا اور نہ کوئی پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔۔۔ اس زمانے میں کوئی سی قوم نہ تو غلام رکھی جاسکتی ہے اور نہ غلام رہ سکتی ہے۔ ہندوستان آزاد ہو گا۔ آیندہ جنگ کے دوران آزاد ہو گا۔ جنگ اپنے انجام کو پہنچے گی تو آزاد ہو گا۔ اب اس کی آزادی موقوف و معطل نہیں کی جاسکتی۔ قدرت اپنے فیصلے انسانوں کی خاطر نہیں بدلا کرتی۔ ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ عرش کی رفعتوں پر ہو چکا ہے۔ جو لوگ اب بھی اپنی پیشانیوں پر وفاداری کا قشقہ لگا کر اپنی محکومی کی عمر کو طول دینا چاہتے ہیں، اس تعبد کا حق پہنچتا ہے، ان کا ضمیر آزادی کی لذت سے آشنا ہی نہیں۔ ان کے لیے ممکن ہے یہ سب فخر و ناز کی پونجی ہو۔"(۱۰۳)

عطا اللہ شاہ بخاری کی خطابت کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی۔ وہ پاک و ہند کے سب سے بڑے اور معتبر خطیب تصور کیے جاتے تھے۔ ان کی تقاریر ابلاغ کی قوت سے معمور، تخیل کے اوج اور فکر کی رعنائیوں سے بھرپور ہوتی تھیں۔ وہ اگر عشا کے بعد تقریر شروع کرتے تو سحر تک بولتے چلے جاتے۔ سارے مجمعے کو اپنی فنی مہارت کی وجہ سے اپنی گرفت میں اپنے خیالات سے متصل رکھتے۔ ایک انبوہِ کثیر کو جب چاہتے، جدھر چاہتے، موڑ لیتے۔ یہ محض اس وجہ سے تھا کہ وہ فنِ خطابت کے اسرار و رموز پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ ان کے الفاظ کے طنطنے اور طرزِ ادا کے ہم ہمے سے سامعین ان کے خیالات کی رو میں بہتے جاتے اور ان کے ہم خیال ہوتے جاتے۔

مولانا ظفر علی خاں کی تقریر کا یہ نمونہ دیکھیے، کس قدر عمدہ، فنی خصائص سے آراستہ اور فکری ارتفاع سے پیراستہ ہے۔

"انگریز اقتدار کے نشے میں اس بری طرح بدمست ہیں کہ انھیں ابھی تک یہ احساس نہیں ہو رہا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ وہ ۱۹۳۶ء میں بھی ہم سے وہی سلوک کر رہا ہے، جو اس نے ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے کیا تھا۔ اس کو آج تریسٹھ برس بعد بھی اس کا اندازہ نہیں ہو رہا کہ ہم کہاں پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا کارواں سرگرم ہے۔ ہم اس مقام پر ہیں کہ اب

ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن ہم لچک سکتے نہیں

قدرت نے ہم میں ہمالہ کی بلندی، بحرِ ہند کی گہرائی اور گنگا و جمنا کی روانی پیدا کر دی ہے۔ ہمارا کارواں مرتب ہو چکا ہے، جواہر لعل سالارِ کارواں ہیں، ہدی خوانوں کے نغمے ہیں، جوانی کی امنگ و ترنگ ہے اور ہم سے ٹکرانے والے نوٹ کر لیں کہ وہ ٹکرائیں گے تو پاش پاش ہو جائیں گے۔"(۱۰۴)

مذکورہ تقریر ظفر علی خاں کی قادر الکلامی، صلاحیتِ تدبیر، ان کی فکر اور تحرک کی برہنہ شمشیر ہے۔ ان کی تقاریر نے ہندوستان کے طول و عرض میں آزادی کی تحریک پیدا کی۔ ان کی ولولہ انگیز اور اثر انگیز خطابت نے عوام کے اذہان و قلوب اور افکار و تصورات کو انقلاب آفریں نظریات و خیالات سے ہم آہنگ کیا۔ ان کی خطابت تکنیکی مہارت، اسلوبی جسارت، تمثیلات کی شائستگی، تشبیہات و استعارات کی برجستگی، سلاست و متانت کا امتزاج اور استدلال کی گرج کا احسن مرقع ہے۔ ان کا خطیبانہ آہنگ اصوات کے ردھم، ادا کے زیر و بم، بیان کے اجلے پن، جملوں کے ارتباط اور لفظوں کے پس پردہ معانی و مدعا کی گونج سے تشکیل پاتا ہے۔ ان کے متین و مبین الفاظ ہوا کے دوش پر سفر کرتے ہوئے سامعین کی سماعتوں سے ٹکراتے ہیں تو اپنی قوتِ تاثیر کی شدت سے انھیں اپنا ہم نوا اور ہم صدا بنا لیتے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کی خطابت اظہار کی گھن گرج اور اسلوب کے طنطنے سے عبارت ہے۔

"میں لگی لپٹی رکھنے کا عادی نہیں۔ وہ زمانہ لُدھ گیا، جب الفاظ کے ہیر پھیر کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اب اس طرح کہو، جس طرح بادل برستے اور بجلی کڑکتی ہے۔ وہی بات اندھیروں کو چیر سکتی ہے، جس میں تلوار کی کاٹ ہے۔ میں کھلے الفاظ میں کہتا ہوں کہ برطانیہ کو ہندوستان سے چلے جانا چاہیے۔"(۱۰۵)

محمد علی جوہر جب بھی لب کشائی کرتے تو موتی اور جواہر رولتے۔ ان کے علم کی گہرائی اور فنی دسترس ان کی تقاریر سے میں جابہ جا نظر آتی ہے۔ ان کے لہجے میں عجب طرح کی سطوت، شان و شوکت، حشمت اور دب دبہ ملتا ہے۔ پر کشش ترتیبِ الفاظ و معانی اور ان کی قادر الکلامی سامعین کے جذبات میں تحریک پیدا کرتی اور ایک نئی امنگ اور ترنگ سے مقصد کی جانب گام زن کرتی ہے۔ جوہر کی تقریر کے فکری محاسن، استعداد و صلاحیت، ظاہریت و باطنیت کا احسن رچاؤ، فکری عمر اور طنطنے کے ساتھ باقاعدہ موجود ہے۔

احمد سعید دہلوی کی تقاریر فنِ خطابت کی قوت و توانائی، زیبائی و رعنائی، عوامی حلقوں میں ان کی پذیرائی کو فزوں سے فزوں کرتی رہی۔ ان کی تقریر کا یہ رنگ دیکھیے:

> "ہم اپنی تقدیر سے خود آنکھیں پھیر چکے ہیں، ہماری ناو ہچکولوں کی پکڑ میں ہے، بادباں ٹوٹ چکا ہے، کبھی ہمارے بازو چپو اور ہمارے قدم لنگر تھے۔ اب ہاتھ پھیلاتے ہیں تو چپو نہیں ملتے۔ ہم پانی کی لہروں کے سفینوں پر سوار ہیں۔ ہمارا وجود اس کے لیے بوجھ ہے۔ سفینہ کہتا ہے، کیا تم ان کے وارث ہو جو کناروں پہ پہنچ کر عشق مقصد کی دھن میں اپنے سفینے ڈبو دیتے تھے اور سفینے ناز کرتے تھے کہ ہم نے معراج پائی ہے۔ اس طرح اللہ کے سپاہی محمد صل اللہ علیہ وسلم کا پھریرا لے کر ہر ملک ملکِ ماست کہ ہر ملکِ خدائے ماست کا جلوہ دکھاتے تھے۔ جب سے ہم نے انھیں چھوڑا ہے، ساری کائنات نے ہمیشہ چھوڑ دیا ہے۔ اس کی اطاعت کے بغیر ہمارے لیے کوئی عزت نہیں۔"(۱۰۶)

زبان و ادب اور تاریخ پر مکمل دسترس رکھنے والے سعید احمد دہلوی کی تکنیکِ خطابت مقصدیت کی حامل، ارفعیت کی آئینہ دار، جامعیت کی عکاس، جذبات کی تحریک، خیالات کی تطہیر اور تحرک کے غل غلے پر محیط ہے۔ ان کی خطابت کی طلاقتِ لسانی، سلاست و روانی، جلال اور لہجے کا جمال احاطۂ کمال میں ڈھلا ہوا تھا۔

شورش کاشمیری کی خطابت الفاظ کی جادوگری، مطالب کی گل کاری، مفاہیم کی ضیا پاشی، افکار کی بوقلمونی، اظہار کی آراستگی سے عبارت ہے۔ وہ اپنی تقریر کے دوران فن کے تمام تر محاسن کو استعمال کرتے۔ علاوہ ازیں، ان کی خطابت کا کینوس مختلف رنگوں سے مزین ہے۔ کیوں کہ وہ بہ یک وقت مقبول شاعر، ادیب، صحافی، سیاست دان اور مورخ تھے۔ ان کی یہ تمام تر مہارتیں ان کی خطابت میں بھی جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ جس موضوع پر بولتے اس کے متعلق جملہ معلومات اس انداز اور قرینے سے عوام کے سامنے پیش کرتے کہ

اس موضوع کا کوئی حصہ ان کے سامعین سے پوشیدہ نہ رہتا۔ ان کی تمام عمر مزاحمت کرتے ہوئے گزری۔ وہ اعلائے کلمۃ الحق میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں انھیں بارہا مصائب و آلام کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن کسی طاقت و قوت کی یہ مجال نہ ہوئی کہ ان کی خطیبانہ بے باکی، جرات، طنطنے اور ہم ہمے کو نگوں کر سکے۔

شورش اسم بامسمی شورش تھے۔ ان کی خطابت کا جاہ و جلال، اظہارِ فن کا کمال، مختلف اجزا کا مرکب ہوتا۔ یہ اجزا ان کی تقریر کو پُر کشش، پر لطف اور پر اثر بناتے ہیں۔ ان اجزا میں زبان و بیان کا مہارت سے استعمال، مطالب و مفاہیم کی صراحت، عنوان پر دسترس اور وابستگی، مقصدیت سے والہانہ محبت، حرکات و استدلال، مطائبات، تشبیہات و استعارات، اشارات و کنایات وغیرہ شامل ہیں۔ انھوں نے اس فن میں وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ ان کے معاصرین نے انھیں نہ صرف داد و تحسین سے نوازا بلکہ ان کے انداز کو بھی سراہتے ہوئے اپنایا۔ متاخرین بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی کرتے اور اس پر نازاں ہیں۔

## ہ۔ خطابت-عوامی امنگوں کی ترجمان اور مسائل کا حل

یہ وہ فن ہے، جس کا یہ خاصہ اور اعزاز ہے کہ اس نے ہمیشہ انسانیت کے فروغ، فلاح، ترقی اور عوامی امنگوں کی ترجمانی کی ہے۔ ابتدا سے لے کر اب تک خطابت کے ذریعے نہ صرف انسانی ضروریات، مصائب، آلام، پریشانیوں اور مشکلوں کو نہ صرف اجاگر کیا ہے، بلکہ ان مسائل کا حل بھی پیش کیا ہے۔ یہ وہ فن ہے جو تمام تر علوم اور شعبوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کے دامن میں اتنی وسعت موجود ہے کہ یہ جدید و قدیم علوم کو بہ طریق احسن سمیٹ سکتا ہے۔

> "خطابت کا کوئی مخصوص موضوع نہیں ہے۔ یہ ہر مبحث اور ہر فن اور ہر علم کو محیط ہے۔ حتی کہ محسوساتِ ذہنی کی کوئی شے اس کے دائرے سے خارج نہیں۔"(۱۰۷)

ارسطو نے "ریطوریقا" میں سیاسی تقریر کے تناظر میں اس پہلو کو اظہر من الشمس کیا ہے کہ خطابت کا براہ راست تعلق ریاست اور اس کے عوام کے ساتھ ہے۔ سیاسی و سماجی میدانوں میں خطابت اہم کردار ادا کرتی ہے اور عوامی امنگوں کی ترجمانی میں مثبت کردار ادا کرتی ہے۔ خطابت کا یہ وصف ہے کہ یہ سامعین کی منشا اور رضا کے مطابق ڈھلتی چلی جاتی ہے، نیز مقرر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ سامعین کی امنگوں کے مطابق دلائل و براہین کی تیاری کرے۔ اسی لیے ارسطو نے سیاسی و سماجی اور رسوماتی تقاریر کے تناظر میں ان تمام پہلوؤں کو بہ طریق احسن طشت از بام کیا ہے جو سامعین کی ذہنی، علمی، فکری اور جذباتی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے مرتب

ہوتے ہیں۔ ارسطو نے جذبات کے ضمن میں انسان کے نمایاں جذبات کو مفصل بحث کے ساتھ رقم کیا ہے، مرقوم جذبات کے محرکات اور اثرات کو مع دلیل پیش کیا ہے۔ مقرر جب تک عوامی امنگوں، جذبات، محرکات اور تدارک سے واقف نہیں ہو گا، اس وقت تک وہ مقصد میں حقیقی کام یابی حاصل نہیں کر سکتا۔ مقرر کو بہ یک وقت ان جذبات کے محرکات سے آگہی ہونی ضروری ہے، جن کو سامعین کی ذہنی سطح قبول کرتی ہے، نیز ان جذبات کی وجوہات سے واقفیت بھی لازم ہے، جنھیں سامعین کے ذہن قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ اس علم کی بنیاد پر مقرر سامعین کو-خواہ وہ پیش کردہ موقف کے مخالف جذبات رکھتے ہوں-اپنے موقف پر بہ آسانی قائل کر سکتا ہے۔

"ریطوریقا" میں جس طرح ارسطو نے عوامی جذبات اور امنگوں کے بارے میں بحث کی ہے، اسی طرح فنِ خطابت کی منتخب کردہ اردو کتب میں بھی مصنفین نے اس امر پر زور دیا ہے کہ مقرر سامعین کی ذہنی، علمی، فکری اور جذباتی استعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اظہارِ مدعا کرے۔ اس فن کی رفعت اور قدر و منزلت انسانی ترقی کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ انسانی ترقی مقاصدِ صحیحہ کی سعیِ تکمیل اور تکمیل میں مضمر ہے۔ خطابت نے ہمیشہ انسانی ترجیحات کو طشت از بام کیا ہے۔ عوام کو ان کے حقوق کا احساس دلانے، تحصیلِ حقوق کے لیے جدوجہد پر ابھارنے، مقاصد طے کرنے، حصولِ مقاصد کے لیے درست راہوں کا تعین کرنے، درپیش مسائل کے طریقہ ہائے حل پیش کرنے اور پیش آیندہ مصائب کو حل کرنے کی کوشش سے متعلق ان میں تحریک پیدا کرنا خطابت کے ذریعے سہل ہو جاتا ہے۔ خطابت عوام کی ترجمان بن کر ابھرتی ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف پلیٹ فارمز پر رہ بر و رہ نماؤں نے مختلف شعبہ ہائے حیات سے منسلک عوامی مسائل اور مطالبات کو بہ ذریعہ خطابت حکامِ بالا تک پہنچایا اور مطلوبہ بارآور نتائج حاصل کیے۔

## 1۔ مختلف تحریکیں

ریاست میں مختلف تحریکیں ابھرتی ہیں، ارسطو نے سیاسی تقاریر کے ضمن میں اس امر کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے کہ مختلف تحریکوں میں خطابت مد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ مقررین کس طرح اپنے مخالفین کے نظریات کی تردید کر سکتے ہیں، نیز وہ کون سے ذرائع اور دلائل ہیں، جن کی وجہ سے مقررین اپنی تحریک کو کام یاب اور تحریکی مقاصد کو کام یاب کر سکتے ہیں۔

فنِ خطابت کی منتخب کردہ اردو کتب بھی اس امر کی عکاس ہیں کہ ماضی اور حال میں ابھرنے والی تحاریک میں خطابت کا اہم کردار رہا۔ یہ کہنا بے جا نہیں کہ تحاریک اچھی خطابت کے بل بوتے پر ہی کام یاب

ہوتی ہے۔ قائدین اور زعمانے اسی فن کے بل پر عوام وخواص کو مقاصدِ اولیہ کے حصول کے لیے برانگیخت کیا۔

زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، تحریکِ آزادی کے زعما اور قائدین کی پرجوش اور ولولہ انگیز تقاریر کو دیکھ لیجیے۔ یہ تقاریر انتہا کے ظلم و جبر کے زمانے میں بے حد جرات اور بے باکی سے کی گئیں۔ مخالفین اور معاندین نے ہر طرح سے رخنے ڈالے لیکن ان زعما کی تقاریر نے اپنا اثر اس قدر تیزی سے دکھایا کہ پورے ہندوستان میں آزادی کے حصول کے لیے کوششیں تیز تر ہو گئیں۔ ہر طرف یہ نعرہ بلند ہوا: "لے کے رہیں گے پاکستان؛ بن کے رہے گا پاکستان"۔ دیکھتے ہی دیکھتے، بے شمار لوگ اس تحریک کا حصہ بنے۔ خطابت کے بل پر ہی نظریہ پاکستان کو فروغ ملا۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے جلسوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا جاتا۔ زعما تقاریر کرتے اور تقاریر بھی ایسی جو سامعین کو اپنے حصار میں لے لیتیں اور پھر انھیں اس حد تک متاثر کرتیں کہ وہ کام یابی کی تمنا دل میں لیے اس وقت تک منزل کی جانب رواں دواں رہتے جب تک اس کا حصول ممکن نہ ہو جاتا۔ یہ بہترین خطابت کے جوہر ہی تھے جس کے بل پر یہ تحریک کام یاب ہوئی، شمعِ آزادی کے پروانے منزل تک پہنچے اور آزادی کا حصول ممکن ہوا۔ تحریکِ آزادی کے مقررین میں "مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، سردار عبدالرب نشتر، مولانا احمد سعید دہلوی، قائداعظم محمد علی جناح، علامہ محمد اقبال" کے نام سرفہرست ہیں، جن کی مسلسل کوشش اور غیر متزلزل جدوجہد نے ایسی تشویق اور تحریک پیدا کی ان کو سننے والے ہر شخص نے ایک انجمن کے طور پر کام کیا۔ ان کی لازوال اور باکمال تقاریر عوام الناس کے روح و نظر میں اتر کر ان کے منجمد احساسات اور جامد جذبات کو جھنجھوڑتیں، تحرک کی گرمی سے سرشار کرتیں اور نتیجتاً وہ راہِ آزادی کے سرگرم راہرو بن جاتے۔

"نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے"(۱۰۸)

علاوہ ازیں بے شمار تحاریک ایسی ہیں، جن کی کام یابی میں خطابت مدد و معاون ثابت ہوئی۔ تحریکِ ختمِ نبوت تاریخ پاکستان کی ایک نمایاں، ہمہ گیر اور فکر انگیز تحریک ہے، جو عقیدۂ ختمِ نبوت کے استحکام، مضبوطی اور تحفظ کے لیے چلائی گئی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد منکرینِ ختمِ نبوت کو غیر مسلم قرار دے کر اسلام کے بنیادی عقیدے "عقیدہ رسالت" کی تحفیظ و ترویج تھا۔ یوں تو یہ تحریک ۱۸۹۱ء سے ہی چل رہی تھی، تاہم پاکستان میں اس تحریک کے حوالے سے چند مقررین نے انتہائی اہم کردار ادا کیا، جن میں سرفہرست سید

عطااللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، سید ابوالاعلا مودودی، مولانا عبد الحامد بدایونی، احسان الحق تھانوی، مفتی محمد شفیع، شورش کاشمیری، شاہ احمد نورانی، غلام اللہ خان، عنایت اللہ شاہ بخاری، علامہ احسان الٰہی ظہیر اور یوسف بنوری ہیں۔ اس تحریک کو بھی مشکلات در مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس تحریک کے تقاضے مختلف ادوار میں مختلف رہے لیکن مقصد ایک ہی رہا، وہ ختمِ نبوت کا صحیح معنوں میں پرچار اور نفاذ تھا۔ ۱۹۵۲ء میں شورش کے مطابق اس تحریک کے قائدین نے پاکستان کی چودہ جماعتوں کو آل پارٹیز کنونشن میں شمول کے دعوت نامے جاری کیے۔ اس تحریک کے مقررین نے ملک کے کونے کونے میں ختمِ نبوت کے پروانے پیدا کیے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، توں توں یہ تحریک مستحکم ہوتی گئی۔ مختلف مکاتبِ فکر کے رہ نما، علما اور کارکنان اس کا حصہ بنتے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک کو وہ کام یابی اور کام رانی ملی جو اکثر تحاریک کے حصے میں نہیں آئی۔ اس تحریک کی کام یابی کا بنیادی وصف خطابت ہے۔ سید عطااللہ شاہ بخاری، سید ابوالاعلا مودودی، شورش کاشمیری جیسے سر برآوردہ مقررین نے اس ضمن میں خطابت کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس تحریک کے محسنین کا خواب شرمندہِ تعبیر ہوا۔

## 2۔ سیاست اور انقلاب

سیاست کا اگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ سیاست کے باقاعدہ فروغ میں خطابت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیاسی نظریات کی ترویج مقررین کی بہ دولت ہی ہوئی۔ مقررین بھی وہ جنھیں عوامی حلقوں میں بے حد قبولِ عام حاصل رہا۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف جماعتیں محض اس وجہ سے بامِ عروج تک پہنچیں کہ ان کے مقررین نے اپنی تقریری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے جماعتی مقاصد کو پوری آب و تاب کے ساتھ سامعین کے سامنے پیش کیا اور سامعین نے بہ سر و چشم قبول کیا۔ سیاست کا تذکرہ کیا جائے تو "قائداعظم محمد علی جناح، ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال، شورش کاشمیری، ذوالفقار علی بھٹو، مولانا ظفر علی خان، محمد علی جوہر" سرفہرست ہیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کی تقاریر نے ایک ہجوم کو قوم بنایا، قوم کو باہم مربوط کیا کہ وہ اپنی تمام تر صلاحیتوں، مہارتوں اور قوتوں کو ایک مقصد کے حصول کے لیے صرف کریں۔ اس سلسلے میں انھیں جو چاہے قربانی دینی پڑے، دے دیں، لیکن اپنے مقصد سے پیچھے نہ ہٹیں اور وہ مقصد قیامِ پاکستان تھا۔ ان کی خطابت عام فہم، تحرک انگیز، فکر انگیز اور متاثر کن تھی۔ اس کی وجہ سے ایک ناممکن شے ممکن ہوئی اور عجب انقلاب برپا ہوا۔ علامہ اقبال کی خطابت علم و رعنائی اور فکر و دانائی سے مرصع تھی۔ نیز ولولہ انگیز تحرک، سحر انگیز متانت اور تدبر کے سانچے میں ڈھلی ہوتی تھی۔ ان کا عمیق

مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، علمی گہرائی و گیرائی دورانِ خطابت ان کے جملوں، دلیلوں، تمثیلوں اور اظہارِ بیان کے متفرق زاویوں سے جھلکتی دکھائی دیتی۔ شورش کاشمیری سیاسی میدانِ خطابت کا ایک معتبر نام ہیں۔ ان کی خطابت علم وادب کا مرقع اور فکر و فن سے مرصع ہوتی تھی۔ ان کی تقریر کا ذکر آتے ہی ایک لفظ ذہن میں آتا ہے اور وہ ہے "مزاحمت"۔ شورش نے تمام عمر باطل قوتوں کے سامنے اعلائے کلمۃ الحق کے سوا کچھ نہ رکھا، وہ ہر لحظہ باطل قوتوں کے خلاف بہ ذریعہ تقریر و تحریر برسرِ پیکار رہے۔ وہ تاحیات ضمیر فروشوں کو للکارتے رہے۔ ان کی خطابت میں قوم کی اصلاح کا جذبہ جا بہ جا ملتا ہے۔ اسی جذبے کے تحت شورش نے ملک کے گوشے گوشے میں تقاریر کیں۔ نیز، فنِ خطابت پر دسترسِ کامل کی وجہ سے اکثریت کو اپنا ہم نوا و ہم صدا بنایا۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستانی سیاست کے ایک مقبول ترین رہ نما گزرے ہیں۔ ان کی مقبولیت ان کی خطابت سے جڑی ہوئی ہے۔ وہ پاکستانی سیاست کے ایک شعلہ بیاں اور جادو بیاں مقرر تھے۔ وہ اپنے معاصرین سیاست دانوں اور متاخرین کے لیے بہ یک وقت قابلِ تقلید اور ان کی مقبولیت کے لیے خطرے کا نشان رہے ہیں۔ ان کی خطابت کا نمایاں وصف ان کا طنطنہ، ہم ہمہ اور دب دبہ تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ سامعین کی نفسیات و جذبات کو ملحوظ رکھ کر اظہارِ مافی الضمیر کرتے۔ بھٹو نے اپنی تقریری مہارت کے بل پر عوام کے دلوں میں گھر کیا۔ مشکلات کی بلند تر چوٹیوں کو انتہائی سہولت سے سر کیا۔ مولانا ظفر علی خاں جیسا ذہین، فطین، لئیق اور حاضر جواب خطیب اردو فنِ خطابت کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ بدیہی گوئی میں ان کی مہارت قابلِ تحسین ہے۔ وہ اپنے مخالفین کو تقاریر میں آڑے ہاتھوں لیتے۔ اپنے نظریے کی فلاح و بقا کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے۔ تقریر اتنی دل چسپ ہوتی کہ سامعین مکمل توجہ اور انہماک کے ساتھ ابتدا سے انتہا تک ان کے ہم راہ چلتے۔ سیاست و انقلاب کو پرکھا جائے تو اس ضمن میں شمشیر سے زیادہ تقریر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ نام ور مقررین نے اپنی مہارت اور جدت کی بنیاد پر سیاست کے میدان میں غیر معمولی تحرک پیدا کر کے ایسے ایسے انقلاب برپا کیے جو تاریخ کی پیشانی پر ان مٹ نشان ثبت کر گئے۔ خطابت کا تعلق جذبات سے ہے۔ اس لیے انقلابی اور سیاسی مقررین نے جذبات و احساسات اور نفسیات کے اس پہلو کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سامعین کے جذبات کو جس طرف چاہا، موڑ کر مطلوبہ مقاصد پر اس طرح ابھارا کہ سامعین میں ہر شخص یہ کہہ اٹھا کہ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل ہے"۔

سیاست اور خطابت کے اسی براہ راست تعلق کے پیش نظر ارسطو نے بھی "ریطوریقا" میں چند اہم نکات کی نشان دہی کی ہے۔ وہ سیاسی تقاریر کی بحث میں رقم طراز ہیں کہ سیاسی تقاریر عوام اور ملک کے مستقبل

سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں، اس لیے مقرر کو ان تقاریر کی تیاری میں دیگر تقاریر کی نسبت دشواری پیش آتی ہے۔ سیاسی مقرر کے لیے ضروری ہے کہ وہ تقاریر کی تیاری انتہائی حزم و احتیاط سے کرے۔ ایسے دلائل کا اہتمام کرے جو حقیقتاً عوام اور ریاست کی فلاح و بہبود میں ممد و معاون ہو سکیں، کیوں کہ سیاسی تقاریر اگر درست طریقے سے تیار کی جائیں تو وہ ملک اور معاشرے میں انقلاب کا ذریعہ ہوتی ہیں، لہٰذا ان میں وہ تمام خصائص موجود ہونے چاہئیں جو فی الحقیقت انقلاب کے امین اور قومی تقدیر بدلنے میں معین ہوں۔

# حوالہ جات


۱. سجاد مرزا بیگ دہلوی، تسہیل البلاغت، نظام دکن پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۹ھ، ص ۱۹۳۔

۲. نجم الغنی خان نجمی رامپوری، بحر الفصاحت (جلد دوم)، مقبول اکیڈمی، لاہور، س ن، ص ۳۸۲۔

۳. برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، دلی، فروری ۱۹۷۵ء، ص ۱۵۱۔

۴. وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ایجوکشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۔

۵. وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ص ۸۔

6. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), Create Space Independent Publishing Platform, 9 Febraury 2015, P139.

۷. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۹۵۔

۸. جلال الدین احمد جعفری، نسیم البلاغت، مطبع انوار احمدی مطبوعہ گردید، الہ آباد، س ن، ص ۵۔

۹. سجاد بیگ دہلوی، مرزا، تسہیل البلاغت، ص ۴۴۔

۱۰. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص ۹۹۔

۱۱. وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ص ۱۵۔

12. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P145.

۱۳. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، ۱۹۵۷ء، ص ۱۷۳۔

۱۴. شورش کاشمیری، فن خطابت، الفیصل ناشران، لاہور، فروری ۲۰۱۹ء، ص ۱۱۲۔

۱۵. شمس الدین احمد، خطابت و تقریر، نامی پریس لکھنو، جولائی ۱۹۲۴ء، ص ۸۔

۱۶. وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ص ۴۰۔

۱۷. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص ۷۔

18. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P160.

۱۹. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ص ۱۷۲۔

۲۰. نذیر الدین احمد، رموزِ خطابت، انجمن اشاعت علم و ادب، ۱۹۵۶، ص ۶۹۔

21. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P160.

۲۲. نجم الغنی، بحر الفصاحت (جلد دوم)، ص ۸۷۲۔

۲۳. وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ص۵۱۔

۲۴. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ص۱۷۵۔

۲۵. عابد علی عابد، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۲۳۵۔

۲۶. وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ص۴۸۔

۲۷. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ص۱۷۴۔

28. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P148.

۲۹. سید عابد علی عابد، البدیع، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۳۶۔

۳۰. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۲۰۔

۳۱. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، مطبوعات چٹان-۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص۷۶۔

۳۲. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۲۰۔

۳۳. ایضاً، ص۱۲۰۔

۳۴. ایضاً، ۱۲۱۔

۳۵. ایضاً، ۱۲۱۔

۳۶. ایضاً، ص۱۲۱۔

۳۷. ایضاً، ص۱۲۲۔

۳۸. ایضاً، ص۱۲۲۔

۳۹. ایضاً، ص۱۲۳۔

۴۰. ایضاً، ص۱۲۳۔

۴۱. ایضاً، ص۱۲۳۔

۴۲. ایضاً، ص۱۲۴۔

۴۳. ایضاً، ص۱۲۴۔

۴۴. ایضاً، ص۱۲۴۔

۴۵. لنک، نعت کائنات

۴۶. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۲۶۔

۴۷. ابوالبیان آزاد، تعلیمِ تقریر، ادریس المطابع، نئی دہلی، س ن، ص۶۳۔

۴۸. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۲۸۔

۴۹. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۷۹۔

۵۰. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۲۹۔

51. https://www.nawaiwaqt.com.pk/17-Dec-2009/112936 , 23January2023, 11:15PM.

52. https://www.urduweb.org/mehfil/threads/%D9%85%DB%8C%D8%B1-%D8%A7%D9%86%DB%8C%D8%B3-%DA%A9%DB%8C-%D9%81%D8%B5%D8%A7%D8%AD%D8%AA-%D8%BA%D9%84%D8%A7%D9%85-%D8%B1%D8%A8%D8%A7%D9%86%DB%8C.70997/ , 23January2023, 11:25pm

53. لنک-نفیس فاروق، عدالت شعر

۵۴. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۳۔

۵۵. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۸۴۔

۵۶. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۱۔

۵۷. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۷۵، ۷۴۔

۵۸. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۱۔

۵۹. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۸۲۔

۶۰. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۲۔

۶۱. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۸۳۔

۶۲. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۲۔

۶۳. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۷۸۔

۶۴. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۴۔

۶۵. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۷۷۔

۶۶. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۵۔

۶۷. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۵۔

۶۸. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص۸۰۔

۶۹. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۶۔

۷۰. شورش کاشمیری، فن خطابت، ص۸۱۔

۷۱. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۷۔

۷۲. ابوالبیان آزاد، تعلیمِ تقریر، ص۶۱۔

۷۳. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۳۸۔

۷۴. ایضاً، ص۱۳۹۔

۷۵. ابوالبیان آزاد، تعلیمِ تقریر، ص۶۴۔

۷۶. احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، ص۱۴۰۔

۷۷. سجاد بیگ دہلوی، مرزا، تسہیل البلاغت، ص۱۴۹۔

۷۸. جلال الدین احمد جعفری، نسیم البلاغت، ص۵۵۔

۷۹. کلب مصطفیٰ، سید، فنِ خطابت، ص۱۷۱۔

۸۰. منشی دیبا پرشاد، معیار البلاغت، مطبع منشی نول کشور، لکھنو، س ن، ص۳۔

۸۱. سجاد بیگ دہلوی، مرزا، تسہیل البلاغت، ص۴۴۔

82. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P149.

۸۳. وارث سرہندی، زبان و بیان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء، ص۸۲۔

۸۴. وارث سرہندی، زبان و بیان، ص۸۳۔

۸۵. الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص۱۷۳۔

۸۶. شورش کاشمیری، فن خطابت، ص۶۲۔

۸۷. نذیر الدین احمد، رموزِ خطابت، ص۵۴، ۵۳۔

88. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P19,20.

۸۹. ادارہ ادبیات، فن تقریر، ص۵۲۔

۹۰. کلب مصطفیٰ، سید، فن خطابت، ص۱۹۔

۹۱. شورش کاشمیری، فن خطابت، ص۳۷، ۳۶۔

۹۲. ایضاً، ص ۴۰۔

۹۳. علی رفاد فتیحی، ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ، بک کارپوریشن، دہلی، اشاعت اول ۲۰۱۶ء، ص ۱۳۴۔

۹۴. شورش کاشمیری، فنِ خطابت، ص ۷۰۔

95. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P

۹۶. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ص ۱۶۸۔

۹۷. ڈیل کارنیگی، گفتگو اور تقریر کا فن، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۲۳۵۔

۹۸. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ص ۱۶۵۔

۹۹. عطا اللہ شاہ بخاری، سید، خطبات شورش، مدون: شیخ حبیب الرحمان بٹالوی، احرار فاونڈیشن، پاکستان، ۲۰۰۳ء، ص ۷۔

100. Aristotle, Rhetoric, W. Rhys Robert (Translator), P

۱۰۱. شورش کاشمیری، فن خطابت، ص ۸۳، ۸۲۔

۱۰۲. ابوالکلام آزاد، مولانا، خطبات آزاد، مرتب: شورش کاشمیری، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، بار دوم یکم مارچ ۱۹۴۴ء، ص ۱۰۲۔

۱۰۳. شورش کاشمیری، فن خطابت، ص ۸۴۔

۱۰۴. ایضاً، ص ۸۸۔

۱۰۵. ایضاً، ص ۸۸۔

۱۰۶. ایضاً، ص ۹۴۔

۱۰۷. کلب مصطفٰی، سید، فن خطابت، ص ۵۔

۱۰۸. محمد اقبال، ڈاکٹر / علامہ، کلیاتِ اقبال، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، مارچ ۲۰۱۵ء، ص ۳۸۰۔

# باب چہارم

# مجموعی جائزہ، تحقیقی نتائج اور سفارشات

## الف۔ مجموعی جائزہ:

جب کوئی فرد اپنے مافی الضمیر کے منفرد اظہار کی بابت اجتماعی طور پر سامعین تک اپنا مدعا و مقصد پہنچائے تو یہ خطابت کہلاتا ہے۔ اس عمل کو کرنے والا خطیب یا مقرر کہلاتا ہے۔ خطابت وہ فن ہے جس کی بہ دولت دوسروں سے اپنی بات منوائی جاتی ہے۔ اس کی بہ دولت دلوں کو گرمایا، باتوں کو سمجھایا، جذبات کو بھڑکایا، کسی مقصد کے لیے اکسایا اور کسی امر یا معاملے کا یقیں دلایا جاتا ہے۔ ترغیب دینے یا ابھارنے میں خطابت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خطابت کو نوعی اعتبار سے چار حصص میں منقسم کیا جاتا ہے، خطابتِ مکتوبی، خطابت بالحفظ، خطابت اعدادی اور خطابت ارتجالی۔ خطابتِ مکتوبی وہ خطابت ہے جو قبل از خطاب (تقریر) تحریر کی جائے۔ تقریر کے تمام لوازم کو مد نظر رکھتے ہوئے موضوع کی مناسبت سے تمام تر معلومات، خیالات اور دلائل و اثبات کو قلم بند کر لیا جاتا ہے اور بہ وقت تقریر انھی کو بہ طور تقریر دہرایا جاتا ہے۔ خطابت بالحفظ سے مراد مکتوبی خطابت کو بہ وقت تقریر زبانی دہرانا ہے۔ یہ ایسی خطابت ہے جسے تقریر کرنے سے قبل موضوع کی مناسبت سے لوازماتِ تقریر اور مناسبتِ موضوع کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھ کر ذہنی قوت اور یاداشت کے بل پر یاد کی جاتی ہے اور سامعین کے روبہ رو من و عن زبانی دہرادی جاتی ہے۔ خطابت اعدادی وہ خطابت ہے جس میں خطیب اپنے موضوع سے متعلق تمام معلومات کے متعلق ایک ذہنی خاکہ تیار کر کے اسے نکات کی صورت میں ایک کاغذ پر قلم بند کر لیتا ہے، دورانِ تقریر ضرورت کے تحت دیکھتا رہتا ہے۔ ارتجالی خطابت وہ خطابت ہے جس میں مقرر اپنی بدیہی گوئی، برجستگی اور موضوع سے وابستگی کے بل پر تقریر کرتا ہے۔ خطاب سے قبل باقاعدہ چیزیں یاد نہیں کرتا، بلکہ اپنے علم کے بل پر بدیہی تقریر کرتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے خطابت ان حصص میں منقسم ہے: "دینی خطابت، علمی خطابت، سیاسی خطابت، سماجی خطابت، کاروباری خطابت، عسکری خطابت"۔ دینی خطابت کا موضوع انسان ہے، اس لیے اس کا حلقۂ اثر آفاقی اور عالم گیر ہے۔ علمی خطابت کی ذیل میں درس و تدریس، تحقیق و تنقید، علمی و فنی مسائل کی پرکھ اور غور و فکر شامل ہیں۔ سیاسی خطابت کے زمرے میں ریاست اور اس کے نظام کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے۔ سماجی خطابت میں تہذیب و ثقافت اور سماجیات سے متعلق اظہارِ خیال کیا جاتا ہے۔ کاروباری خطابت میں تجارت کی غرض سے

منعقدہ علاقوں میں ہونے والے مباحث اور عدالتی تقاریر شامل ہیں۔ عسکری خطابت میں وہ تقاریر شامل ہیں، جن کے بل پر سالارِ لشکر اپنے عساکر کو دشمن سے مقابلے کے لیے برانگیخت کرتا ہے۔ مدعا و مقصد کے لحاظ سے خطابت کو چار حصص میں تقسیم کیا جاتا ہے: "ترغیبی خطابت، ترہیبی خطابت، تائیدی خطابت اور اختلافی خطابت"۔ ترغیبی خطابت کا مقصد سامعین کو کسی خاص مقصد کی ترغیب دلانا ہے۔ ترہیبی خطابت اس کے برعکس ہے، یعنی سامعین کو کسی معاملے سے رکنے کے لیے اکسانا۔ ترہیبی خطابت میں کسی خاص مقصد کے تحت مخصوص پہلوؤں سے روکا جاتا ہے اور سامعین کو اجتناب کے لیے ابھارا جاتا ہے۔ تائیدی خطابت میں کسی خاص نظریے کی حمایت اور تائید حاصل کی جاتی ہے۔ اختلافی خطابت اس کے برعکس ہے، جس میں کسی تحریک، نظریے، معاملے یا رویے کی مخالفت کی جاتی ہے۔

خطابت کا ارتقائی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہو گئی تھی، جب انسان نے بولنا شروع کیا تھا۔ ابتدائے کائنات سے ہی خطابت کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس کے آغاز کا کوئی حتمی نکتہ مختص نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلا خطیب خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہیں اور سامعینِ اولین عالمِ ارواح میں موجود روحیں ہیں۔ جب انسان دنیا میں بھیجا گیا تو اس کی رہ نمائی کے لیے انبیا اور پیغمبر بھی بھیجے گئے۔ جن کا اظہارِ مدعا خطابت کے پیرائے میں ہوتا تھا۔ انبیائے کرام کے خطبا و تقاریر خطابت کے دیرینہ اور قیمتی نمونے ہیں۔ تاریخ کے اوراق پلٹنے سے اس پہلو کی تصریح ہوتی ہے کہ یونان وہ خطہ ہے جہاں باقاعدہ فنِ خطابت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یونانیوں کو اس فن پر مکمل دسترس تھی۔ یونان کے بعد اہلِ روما کے ہاں اس فن کو اہمیت اور وقعت دی گئی۔ انھوں نے اسے بامِ عروج تک پہنچایا۔ اہلِ روما کے بعد اہلیانِ عرب نے اس فن میں اپنے جواہرِ فصاحت و بلاغت سے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے کہ اس فن کی عظمت اس فن سے منسوب ہو گئی۔ کیوں کہ وہ فطرتاً فصاحت و بلاغت سے معمور تھے۔ عربوں کے بعد یورپ میں خطابت کو عروج ملا۔ فرانس، برطانیہ اور امریکا میں خطابت کو فروغ حاصل ہوا۔ فنی و فکری حوالے سے ترقی و ترویج ہوئی۔ بعد ازیں، برصغیر میں اس فن کو ترقی اور عروج حاصل ہوا۔ تاہم، فرنگی تسلط کے بعد اردو فن خطابت پر انگریزی فنِ خطابت کی چھاپ نظر آنے لگی۔

اردو فن خطابت بھی اردو زبان کی طرح دیگر زبانوں سے ماخوذ ہے۔ لیکن اس کے دامن میں تمام علوم کے سمونے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس کے دامن سے یونانی، عربی، فارسی اور انگریزی علم و ادب کی امتزاجی مہک ملتی ہے۔ فنِ خطابت کا دائرہ کار انتہائی وسیع ہے۔ یہ مختلف علوم و فنون کو اپنے دامن میں سمیٹے

ہوئے ہے۔ علم نفسیات، علم نباتات، علم حیوانات، علم معاشیات حتی کہ وہ تمام علوم جو انسانوں کی بقا کے لیے ضروری ہیں، فنِ خطابت کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ منطق اور خطابت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ منطق کی بنیاد دلائل ہیں، جب کہ فن خطابت میں استدلال اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ نفسیات اور خطابت اس لیے باہم منسلک ہیں کیوں کہ ایک خطیب کو سامعین کی نفسیات سے آگاہی و آشنائی لازمی ہے تاکہ تقریر موثر ہو سکے۔ اسی طرح صحافت اور خطابت بھی ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ صحافت خطابت کے دامن کو وسیع کرتی ہے۔ علم اور دلیل دونوں کی بنیاد ہے۔ ادب اور خطابت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ادب کی بہ دولت فصاحت و بلاغت کے راستے ہموار ہوتے ہیں، جو خطابت کی بنیاد ہے۔ شعر و ادب سے خطابت نکھرتی ہے اور تفہیم کے اسباب مہیا ہوتے ہیں۔ خطیب زبان و ادب پر دسترس پا کر موثر و مدلل گفت گو میں کاملیت حاصل کر سکتا ہے۔ ادب خطابت کو کام یابی کی شاہ راہ پر ڈالتا ہے۔ سماجیات اور خطابت باہم اس لیے منسلک ہیں کہ سماجیات کی بہ دولت معاشرہ اور اس کے مبادیات نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ خطابت سماج کی نباض ہے اور اسی شکل میں سماجیات خطابت کو بنیاد مہیا کرتی ہے۔ معاشرے اور معاشرت کی آگہی خطیب کو لازم ہے۔

"ریطوریقا" فنِ خطابت کی ابتدائی کتب میں معیار کا درجہ رکھتی ہے۔ ابتدا سے لے کر آج تک اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ متقدمین اور متاخرین اس سے مستفید و مستفیض ہوئے۔ اس کے بعد فنِ خطابت پر جتنی کتب لکھی گئیں ان پر اس کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ فنِ خطابت کی اردو کتب کا بہ غور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ فنِ خطابت کے جو خصائص ارسطو نے اُس دور میں بیان کیے، آج بھی معمولی سی تبدیلی اور وقت کی ضرورت کے تحت سرسری تغیر کے ساتھ مروج و مستعمل ہیں۔ اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد لکھی جانے والی کتب میں آج بھی مصنفین نے اس فن کا تعارف اسی طرز پر وقت کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے کروایا، جس طرح ارسطو نے اپنی کتاب میں اس فن کو متعارف کروایا تھا۔ فنِ خطابت کی افادیت اور دائرہ کار جس طرح ارسطو نے متعین کیا تھا، آج بھی یہ فن اسی طرح زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس لیے اردو فنِ خطابت پر قلم اٹھانے والوں نے بھی یہی موقف بیان کیا ہے اور اپنی کتب میں اس فن کی افادیت آج بھی معمولی رد و بدل کے ساتھ طشت از بام کی ہے، جس طرح ریطوریقا میں مترشح ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ "ریطوریقا" میں اگرچہ تحریر کی اقسام کو تین حصوں "عدالتی، سیاسی اور عوامی تقاریر" میں منقسم کیا گیا ہے۔ جب کہ اردو مصنفین نے اپنے عہد اور سماج کی ضرورت، رجحان اور پہلو ہائے حیات میں وسعت کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے کئی ذیلی حصوں میں منقسم کیا ہے، لیکن تقریر کی بنیادی اقسام اہلِ فن کے

نزدیک وہی ہیں۔ فنِ خطابت کی اردو کتب کا گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ آج سے کئی صدیاں قبل لکھی گئی تصنیف "ریطوریقا" میں بیان کی گئی تقریر کی خصوصیات، ان کی نوعیت اور اثرات اسی طرح مسلّم ہیں۔ ان کتب میں خصائصِ تقریر کا گوشہ آج بھی ریطوریقا کے اثر سے تہی نہیں ہے۔ محولہ بالا حوالہ جات کی بہ دولت یہ امر اب مخفی نہیں رہا۔ تقاریر کی مختلف اقسام میں استدلال کی ضرورت، اہمیت، افادیت اور اثر کی بابت "ریطوریقا" میں جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا گیا، اردو مصنفین نے بھی اسی طرح اثباتِ دعویٰ میں دلائل کی نوعیت و ہیت اور اثرات کی وضاحت کی ہے۔ "ریطوریقا" میں مقرر کے وہبی و کسبی خصائص کی ذیل میں شخصی و کرداری اور فن کے لحاظ سے مطلوبہ اوصاف کو تفصیل و تمثیل کے ساتھ منصہِ شہود پر لایا گیا ہے۔ یہ خصائص مقرر کی شخصیت کے نکھار اور اس کی تقریر کے تاثر و اظہار میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ خطابت پر لکھی گئی اردو کتب میں مذکورہ خصائص کو اور انھی بنیادوں پر اپنی سماجی روایات، مذہبی ترجیحات، اخلاقی اقدار، قومی و ملی رجحانات اور عصری میلانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مقرر کی مزید خصوصیات کو بھی شاملِ بحث کیا گیا ہے۔ "ریطوریقا" میں تقریر کے عناصرِ ترکیبی "تمہید، مدعا، اثباتِ مدعا (دلائل) اور اختتام" بیان کیے گئے ہیں۔ نیز، ان عناصر کو برتنے اس موضوع پر مرقوم اردو کتب میں بھی یہی عناصر بعینہٖ عصری اور موضوعی تقاضوں کے مطابق ملتے ہیں۔ "ریطوریقا" میں زبان و بیان کو موثر تقریر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ارسطو نے یہ حقیقت اظہر من الشمس کی ہے کہ زبان کے درست، مناسب، مہذب، آسان اور بر محل استعمال اور علمِ بیان و بدیع کے محاسن سے تقریر کو موثر، مزین و مستحسن کیا جاسکتا ہے۔ زیرِ تجزیہ کتب میں بھی کہیں مفصل اور کہیں مجمل انداز میں زبان و بیان کی اہمیت اور اس کے استعمال کی نوعیت و کاملیت کو واضح کر کے نو آموز مقررین کو یہ بتایا گیا ہے کہ زبان و بیان پر خاطر خواہ دسترس سامعین کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اردو فن خطابت پر تحریر کردہ کتب ریطوریقا سے تہی نہیں ہیں۔ لیکن، ان کتب میں عصری، سماجی اور مذہبی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے "ریطوریقا" کے برعکس بھی کچھ نکات شامل کیے گئے ہیں، جن میں سرِ فہرست "خطابت کی روایت" ہے۔ اس روایت کو مستحکم انداز میں کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً قلم بند کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں، یونانی مشاہیر خطابت کے خصائص اور طریقہِ تقریر کے بیان کے ساتھ سماجی اور زبانی تقاضوں کے مطابق ان کتب میں کہیں کہیں اردو مقررین اور مذہبی و ملی تقاضوں کے مطابق انبیا اور صحابہ کرام کا تذکرہ اور امثلہ ملتے ہیں۔ ابو البیان آزاد اور شورش کے ہاں انبیا و اصحابِ انبیا اور اردو مقررین کی تقاریر

اور اختصاصِ تقریر پر مفصل اور مدلل بحث موجود ہے۔ طریقہِ تقریر کے ضمن میں اقتضائے حال کو ملحوظ رکھتے ہوئے مصنفین نے فی البدیہہ کے علاوہ تقریر کے "تحفیظی اور تحریری" طریقہ ہائے کار متعارف کروائے ہیں۔ تاکہ مقررین، بالخصوص نو آموز مقررین، اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکیں۔ کیوں کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس قدر وسعت در آئی ہے کہ ایک موضوع کے کئی پہلوؤں کے علم کو منطقی ترتیب سے صفحہِ ذہن میں محفوظ رکھنا اور کہیں بھی، کبھی بھی ان سے منطقی دلائل بنا کر اثباتِ مدعا کرنا بعض صورتوں میں مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا، مذکورہ دو طریقے ایسی صورت حال میں شرمندگی اور سُبکی سے بچانے میں معاونت کرتے ہیں۔

شورش اور سید کلب مصطفیٰ نے اسٹیج کے خوف اور مقررین کو اس خوف پر قابو پانے کے ذرائع اور طریقوں سے آگاہ کیا ہے۔ تاکہ وہ بہ آسانی، بے خوف و خطر اظہارِ مدعا کر سکیں۔ فنِ خطابت کی اردو کتب میں مقرر کی جسمانی صحت اور ظاہری شخصیت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس امر کی نشان دہی کی گئی ہے کہ مقرر کے بارے میں اس کی ظاہری شخصیت کی بنا پر قایم کی جاتی ہے۔ سامعین کی توجہ کی پہلی بنیاد ہی مقرر کی ظاہری حالت و شخصیت ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ جب تک مقرر جسمانی لحاظ سے صحت مند نہیں ہو گا وہ تقریر کو مطلوبہ تقاضوں کے مطابق نہیں کر پائے گا۔ حرکات و اشارات جذبات و خیالات کی تحریک اور مدعا کی ترسیل میں معاونت و استعانت کرتے ہیں۔ موضوع کے مطابق مقرر کے چہرے، سراپے اور اشاروں سے وہی کیفیت عیاں ہونی چاہیے، جو وہ بیان کر رہا ہے۔ اس لیے ان مصنفین نے اوصافِ مقرر میں "فطری اشارات اور حرکات و سکنات کے ذریعے ترسیلِ مدعا" کا اضافہ کیا ہے۔

فصاحت خوش کلامی، شگفتہ بیانی کا دوسرا نام ہے۔ ایسا کلام جو معائب سے تہی اور محاسن سے آراستہ ہو، تنافرِ حروف، مخالفتِ قیاسِ لغوی و نحوی اور تحقید جیسے جملہ خامیوں سے پاک ہو اور علمِ صرف کے اصول و قواعد سے پیراستہ ہو، کلامِ فصیح کہلاتا ہے۔ اسی کی بہ دولت سامعین اور قارئین تک متکلم محرر یا مقرر کے تمام تر خیالات کی تفہیم ممکن ہوتی ہے۔ بلاغت وہ علم ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اپنے مخاطبین، سامعین اور قارئین سے کس طرح کلام کرنا ہے۔ ان کے سامنے کون سے نکات رکھنے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی پسند و ناپسند کو ملحوظ رکھنا از حد ضروری ہے۔ ان کے سامنے وہی باتیں بیان کی جائیں جو ان کے دل کو بھلی معلوم ہوں۔ ان کا ذوقِ طبع خوش دلی سے قبول کرے اور ایسی باتوں کو خارج از سخن کر دینا چاہیے جو ان کی طبیعتِ خاطر پر گراں گزریں، ان کا دل و دماغ اس جانب سُرعت کے ساتھ مائل ہونے سے کتراتا ہو بلکہ رُجعت و ترجیع کو ترجیح دے۔ ایسی باتوں کو اولیت دینی چاہیے، جن کی ضرورت، اہمیت اور قدر و منزلت سب سے زیادہ ہو۔ اس کے

برعکس ایسی تمام باتیں، جو کم اہمیت کی حامل ہوں، انھیں آخر میں بیان کیا جائے اور اہتمام کے ساتھ غیر ضروری کلام سے گریز برتا جائے۔ خطابت فصاحت و بلاغت کا مرقعِ جمال اور انتہائے کمال ہے۔ جب مقرر فصاحت و بلاغت کے اسرار و رموز سے کامل آشنائی کے بعد اس فن میں طبع آزمائی کرتا ہے تو اسے بالیقین، توقع سے بڑھ کر کامیابی ملتی ہے۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان دو خصائص کے بغیر اگر کوئی شخص میدانِ خطابت میں اترتا ہے تو اس کا یہ عمل امرِ لایعنی کے سوا کچھ نہیں۔ لہٰذا، خطابت میں غیر معمولی مہارت کے حصول کے لیے خطیب کا فصیح و بلیغ ہونا اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ظلمت میں روشنی کے لیے لمعہ اور ضیا۔

فصاحت و بلاغت کی پرتیں کھولی جائیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ علم، علمِ بیان، علمِ بدیع اور علمِ معانی سے عبارت ہے۔ علمِ بیان وہ علم ہے جو ایک بات کو مختلف طریقوں سے عیاں اور روشن کرنے کے ذرایع مہیا کرتا ہے۔ تقریر ہے ہی اظہارِ مافی الضمیر، تو جب تک علمِ بیان پر دسترسِ تامہ نہ ہو تو خطابت کو تقویت نہیں مل سکتی۔ اس ضمن میں مقرر کو "تشبیہ، استعارہ، کنایہ اور مجازِ مرسل" کے بہترین استعمال پر کامل و اکمل دسترس کی ضرورت ہے، جو مشقِ پیہم اور جہدِ مسلسل کے بغیر ممکن نہیں۔ علمِ بدیع وہ علم ہے جو یہ بتاتا ہے کہ کس طرح کلام آراستہ و پیراستہ ہو سکتا ہے۔ اس کی بہ دولت فصاحت و بلاغت سے معمور کلام کی لفظی اور معنوی خصوصیات مترشح ہوتی ہیں۔ یہ صنائع لفظی و صنائع معنوی پر محیط علم ہے۔ الفاظ و معانی کی صنعت گری سے تحریر و تقریر میں حُسن و لطافت اور تاثیر و اثر پیدا کرنا علمِ بدیع کا جوہر ہے۔ اس علم کی مہارتِ کاملہ مقرر کی تقریر کو اکارت ہونے سے بچاتی ہے، اس کے مدعا و مقصد کی بیّن اور واضح تفہیم کے ساتھ ساتھ سامعین کی سماعت کو بھی بھلی معلوم ہوتی ہے، اس کی تقریر کا ہر گوشہ اور حصہ بیّن اور مزین ہو جاتا ہے۔ علمِ معانی اس امر کی نشان دہی کرتا ہے کہ مدعا و مقصد کو بر موقع و بر محل کس طرح استعمال کرنا ہے۔ اغلاط و اسقام سے بچنے کے لیے کن ذرایع کو بروئے کار لانا ہے۔ تقریر میں یہ اس طرح کارگر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی بہ دولت مقرر اپنی بات کو مستحکم اور مستحسن پیرائے میں مقام و منصب کو سامنے رکھتے ہوئے پیش کر سکتا ہے۔

مطالعہ مقرر کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایک مکان کے لیے مکین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مکین نہ ہو تو وہ مکان ہی رہتا ہے، گھر نہیں بنتا۔ کیوں کہ مقرر نے مختلف مواقع پر متفرق موضوعات پر خطاب کرنا ہوتا ہے، اس لیے اسے مختلف کتب اور علوم پر دسترس اور مہارت ضروری ہوتی ہے۔ جب تک مقرر باقاعدہ اہتمام کے ساتھ مطالعے کو اپنی عادت اور فطرت نہیں بناتا، اس وقت تک وہ کسی موضوع سے انصاف نہیں کر سکتا۔ سامعین جب مقرر کی تقریر سنتے ہیں، تو ان کی منشا اور مقصد تجسس و تحقق میں ڈھلا ہوتا ہے، ان کی

سماعتوں کا دامن اقتضائے حال کے مطابق جدید تر معلومات کا خواہاں ہوتا ہے، اس لیے مقرر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مخاطبین اور سامعین کی اس بدیہی ضرورت کا خیال رکھتے ہوئے ان کی علمی تشنگی کو مٹائے۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب وہ خود خاطر خواہ علم کا حامل ہو گا، تحصیلِ علم کا بہترین ذریعہ و وسیلہ "مطالعہ و مشاہدہ" ہے۔ لہٰذا، مطالعہ مقرر کا وتیرہ ہونا چاہیے۔ مطالعے کے ضمن میں مقرر کو یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جو کتاب پڑھ رہا ہے، اس کے باقاعدہ نکات ایک کتاب پر لکھے، اس میں شامل خوب صورت جملوں اور شعروں ازبر کرنے کی کوشش کرے اور پھر انھیں مہارت سے تقاریر میں استعمال کرے۔

اسلوبِ خطابت سے مراد مقرر کے اظہارِ خیال کا طریقہ و سلیقہ ہے۔ اس نے کن خصائص کی بنیاد پر خود کو اپنے معاصر مقررین سے ممیز کیا ہے۔ اسلوب مقرر کے ظاہر کا ترجمان ہی نہیں ہے بلکہ اس کے طرزِ احساس کا بھی نمایندہ اور پیام بر ہے۔ خطابت کے اسلوب کو جانچا جائے تو اس کے چنیدہ خصائص "شکوہ الفاظ، طنطنہ، اختصار و جامعیت اور ابلاغ" مترشح ہوتے ہیں۔ شکوہِ الفاظ میں مقرر کی وہ مہارت شامل ہے جس کے بل پر وہ سطوت اور شان و شوکت سے معمور الفاظ کا انتخاب کر کے ابلاغ کو موثر اور اپنے مدعا کو معتبر بناتا ہے۔ طنطنہ مقرر کا وہ جوش و ولولہ ہے جو اس کی آواز، انتخابِ الفاظ اور اظہارِ مافی الضمیر سے جنم لیتا ہے۔ جب مقرر مخصوص الفاظ پر زور دیتا ہے اور کسی خاص مقصد کی ترویج کے لیے انھیں دیگر لفظوں سے ممیز کرتا ہے تو زورِ بیان ابھرتا ہے۔ یہاں زورِ بیان سے مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ مقرر محض شور و غل اور چیخنے چلانے کو وتیرہ بنائے، بلکہ بڑے تعقل اور تیقن کے ساتھ شان دار اور جان دار الفاظ کا استعمال کرے، تکرارِ لفظی اور آواز کے مناسب اور موزوں زیر و بم سے اپنی تقریر موثر بنائے۔ مقرر کو اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے وقت اختصار کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے، بے جا طوالت سے گریز کرے۔ خطابت کی خوبی یہ ہے کہ اپنے مدعا و مقصد خواہ محنت و جامعیت کے ساتھ پیش کیا جائے کہ دریا کوزے میں بند ہو جائے۔ اختصار اور جامعیت اس لیے ضروری ہے کہ اب لوگوں کے پاس وقت نہیں رہا۔ بے جا طوالت اکتاہٹ کا سبب بھی بنتی ہے اور اگر مقرر کسی کانفرنس یا جلسے میں موجود ہے تو اس سے دیگر مقررین کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ابلاغ تقریر کا بنیادی مقصد ہے۔ اگر کوئی خطاب یا تقریر ابلاغ سے تہی اور سراپا ابہام و اسقام ہے تو وہ بجائے اکسیر کے تزویر ہے۔ مقرر کو وقت، موضوع، سامعین اور حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنا چاہیے۔ ہر طرح کے فنی اسقام اور فکری ابہام سے تقریر کو اہتمام کے ساتھ تہی اور ابتدا سے انتہا تک اپنے ہر جملے اور تقریر کے ہر گوشے کو درجہِ کمال تک پہنچانے کی سعی کرنی چاہیے۔

اردو فنِ خطابت اس لیے معتبر اور مستحکم ہوئی، کیوں کہ مقررین نے اس فن میں فنی اور فکری مہارت کو اس طرح استعمال کیا کہ اردو فنِ خطابت بھی دیگر زبانوں کی خطابت کا مقابلہ کرنے لگی۔ ان کا اسلوبِ بیان، تکنیک، لب ولہجہ، الفاظ کی ترتیب، بلاغت کا عنفوان، معانی کا ریعان، تشبیہات کی رعنائی وزیبائی حتیٰ کہ ہر فنی گوشہ مہارت وجدت کا آئینہ دار ہے۔ ابوالکلام آزاد، عطااللہ شاہ بخاری، شورش کاشمیری، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، احمد سعید دہلوی ایسے نام ہیں کہ جن کی خطابت اردو خطابت کا طرہ اور امتیاز ہے۔ ان کی تقاریر کا ایک ایک جرعہ سامعین کو کیف و سرور کے عالم میں لے جا کر مطلوبہ مقاصد کے لیے اس قدر ابھارتا ہے کہ ہر سامع ان کی مرضی کے مطابق شاملِ کارواں ہو کر خوشی و فخر کے ساتھ منزل کی جانب گام زن ہو جاتا ہے۔ یہ سب اس لیے ممکن ہوا کہ یہ سب حضرات خطابت کے جملہ اسرار و رموز سے کامل آشنا تھے۔

خطابت نے ہر عہد اور عصر میں عوامی امنگوں کی صحیح معانی میں ترجمانی کی ہے اور یہ خطابت ہی ہے جو عوام کی ضرورت و منشا کے تحت ہر گام پر ان کی رہ بر و رہ نما ہوئی۔ تاریخ میں بے شمار ایسے مواقع ملتے ہیں جب خطابت کی بہ دولت لوگوں کے مسائل کو طشت از بام کیا جاتا، گویا کسی زمانے میں خطابت نے صحافت کا کردار بھی ادا کیا اور بڑے بڑے خطبانے ان مسائل کے باقاعدہ حل بھی پیش کیے۔ مختلف تحریکیں مختلف ادوار میں پنپتی رہیں، لیکن انھی تحریکوں کو استحکام اور کام یابی حاصل ہوئی، جن میں شعلہ بیان مقررین موجود تھے۔ جس کی سب سے بڑی مثال تحریکِ پاکستان ہے، جس جے مصائب و آلام کے انبار کے باوجود اپنے مدعا و مقصد کے اظہار میں کبھی لیت و لعل سے کام نہیں لیا۔ یہ اس تحریک کے قائدین کی تقاریر ہی تھیں، جنھوں نے ملک کے ہر حصے میں جاں نثار و وفادار پیدا کیے جنھوں نے تسلطِ اغیار کے اس غلیظ مگر مضبوط درخت کو اکھاڑ پھینکا جس کے تعفن اور زہریلے سائے سے وطن اور اہلیانِ وطن کا تنفس گھٹن کا شکار ہو گیا تھا۔ نیز اس کے سائے میں بیٹھنے والا ہر فرد اندیشۂ زوال کی وجہ سے خوف، تذبذب اور اضطراب میں مبتلا تھا۔ جن مقررین نے تحریکِ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا، ان میں قائد اعظم، علامہ اقبال، محمد علی جوہر، ظفر علی خاں، احمد سعید دہلوی، عبدالرب نشتر اور شورش کاشمیری کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کی ولولہ انگیز تقاریر نے بے نظیر اور بے مثل کام یابیاں سمیٹیں۔ علاوہ ازیں، تحریک ختم نبوت کی کام یابی بھی نام ور اور معتبر مقررین کی تقاریر کی بہ دولت ہوئی۔ ان مقررین میں سید عطااللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خان، شورش کاشمیری، سید ابوالاعلا مودودی، غلام اللہ خان، سید عنایت اللہ شاہ بخاری، مفتی محمد سعید، مفتی محمد شفیع، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مولانا احتشام الحق

تھانوی، شاہ احمد نورانی اور یوسف بنوری کے نام سرفہرست ہیں۔ جن کی بہترین تقاریر کی وجہ سے یہ تحریک حصولِ مقاصد کے لیے بارآور ثابت ہوئی۔

سیاست و انقلاب میں بھی خطابت نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے، جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ مقررین نے سیاست کے میدان میں اپنے مدعا و مقصد اور نظریے کی ترویج کے لیے خطابت کو ذریعہ اور وتیرہ بنایا۔ بڑے بڑے جلسوں میں سیاسی مقررین نے انتہائی محنت اور مہارت سے انبوہِ کثیر کو اپنے نظریات کا حامی بنایا اور اپنے مقصد میں کام یاب ہوئے۔

کوئی بھی فن بغیر تگ و دو، جستجو، تشویق اور تعمیق کے فن کار کو حاصل نہیں ہوتا۔ مہارت اور ممایزت کے لیے مشقی ذرایع سے گزرنا پڑتا ہے، خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے، ضروری اوقات کا ایک اہم حصہ مختص کر کے فنی دسترس کو نکھارنا پڑتا ہے اور بالآخر، فن کار اس قابل ہو جاتا ہے کہ جب وہ اظہارِ فن کرے تو وہ فن جہاں تک پہنچے وہاں تک اس کی عظمت و سطوت کی گونج سنائی دے، ہر سامع و قاری اور ناظر دادِ پذیرائی دے۔ نیز، فن کے ساتھ ساتھ فن کار کا بھی امر ہونا یقینی ہو جائے۔

## ب۔ تحقیقی نتائج

فنِ خطابت پر مرقوم اردو کتب پر ریطوریقا کے اثرات کے تحقیقی تجزیے سے درج ذیل نتائج طشت از بام ہوئے:

ا۔ ارسطو کے نظریہ خطابت کا عمیقانہ مطالعہ اس بات کو اظہر من الشمس کرتا ہے کہ خطابت کا دائرہ کار تین بنیادی نکات Ethos, Pathos and Logos پر محیط ہے۔ جن میں پہلا اساسی نکتہ یعنی Ethos اپنے اندر مقرر اور مقرر کی شخصیت و کردار، مقام و منصب، علم و فن اور مہارت کے مفاہیم سموئے ہوئے ہے۔ پہلے بنیادی نکتے میں اس امر کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ مقرر کی ظاہری شخصیت پُرکشش ہو، معاشرے میں اعلا و ارفع کردار اور ممیز مقام و منصب کا حامل ہو، علم و فن اور مہارت کے اعتبار سے مستند ہو، اس کے شخصی اوصاف اس قابل ہوں کہ انھیں بہ طور حوالہ یا دلیل پیش کیا جاسکے، تاکہ سامعین ابہام یا تذبذب کا شکار ہوئے بغیر مقرر کی بات کو تسلیم کر سکیں۔

دوسرا بنیادی نکتہ یعنی Pathos سامعین اور سامعین کی نفسیات و کیفیات، جذبات و احساسات اور خیالات و نظریات کے بارے میں مفصل و مکمل آگہی ہے۔ چوں کہ مقرر براہ راست عوام سے مخاطب ہوتا

ہے، لہٰذا اسے سامعین کے خیالات، ترجیحات اور وقت کے ساتھ بدلتی کیفیات کے مطابق اپنے دلائل پیش کرے، تاکہ وہ انتہائی آسانی اور مطلوبہ جادو بیانی سے اپنے مدعا اور مقصد کی ترویج میں کام یابی اور کام رانی حاصل کرے۔

سوم نکتۂ اساسی یعنی Logos سے مراد موضوع، مدعا اور مقصد کے بیان میں منطقی و عقلی دلائل اور ان کے درست استعمال کے بارے میں کامل آشنائی ہے۔ ارسطو کے مطابق منطقی اور عقلی دلائل کی تردید کرنا نسبتاً مشکل اور تقریباً ناممکن ہوتا ہے، لہٰذا مقرر کو اپنے موقف کا اثبات منطقی اور عقلی پیمانوں پر پورا اترنے والے دلائل سے کرنا چاہیے۔ مزید برآں، مذکورہ طرز کے دلائل کی منطقی ترتیب سے پیش کش اور برمحل استعمال پر مہارت سے خطابت کو موثر بنایا جاسکتا ہے۔ مقرر کی مستحکم آواز، مضبوط انداز، فصیح و بلیغ اسلوب، سریع الفہم استعارات و تمثیلات اور عام فہم کہاوتوں کا برمحل استعمال بھی اس نکتے کے تصریحی پہلو ہیں۔ اگر مقرر کا تقریری مواد موضوع کے تمام تقاضوں کے موافق و مطابق ہو اور مطلوبہ منطقی و عقلی دلائل بھی اس معیار کے ہوں کہ انھیں ذہن و دل قبول کرسکے، لیکن مقرر انھیں اقتضائے خطابت کے مطابق پیش نہ کرسکے تو مستند مواد کے باوجود تقریر غیر موثر رہے گی۔

اردو خطابت کی عمارت بھی انھی بنیادی نکات پر استوار ہے۔ شمس الدین احمد، نذیر الدین احمد، سید کلب مصطفٰی، ابوالبیان آزاد اور شورش کاشمیری کے ہاں خطابت کے بنیادی نکات "ریطوریقا" کے مطابق و موافق ہی ملتے ہیں۔ تاہم انھوں نے عصری ضرورت کے تحت ان تینوں نکات کی بنیاد پر ہی مزید مباحث بھی شامل کیے ہیں، جن میں مطالعے اور مشق کی ناگزیریت، اقسامِ خطابت کی توسیع اور خطابت کی تاریخ وارتقا جیسے مفید مباحث شامل ہیں۔ مطالعے کی بہ دولت مقرر کے خیالات کو وسعت اور فصاحت و بلاغت کو تقویت ملتی ہے۔ نیز، اظہارِ بیان کی منطقی ترتیب اور موثر اظہارِ خیال کی تفہیم میں معاونت و سہولت ہوتی ہے۔ مسلسل مشق مقرر کے اعتماد اور تقریری صلاحیت میں استحکام کا باعث ہے۔ ارسطو نے خطابت کی تین بنیادی اقسام سیاسی، عدالتی اور رسمی یا عمومی تقاریر کی ذیل میں فنِ خطابت اور متعلقاتِ خطابت پر بحث کی ہے، جب کہ فنِ خطابت کے منتخب اردو مصنفین نے مذکورہ تین اقسام کو بنیاد بناتے ہوئے ذیلی اقسام مذہبی، علمی، ادبی، سماجی، کاروباری، ترغیبی، ترہیبی اور اختلافی خطابت میں منقسم کیا ہے۔ ارسطو نے فنِ خطابت کی تاریخ اور ارتقا کو موضوعِ بحث نہیں بنایا، تاہم منتخب اُردو مصنفین نے خطابت کی تدریجی روایت کو مفصل قلم بند کیا ہے، نیز فنِ خطابت کی متفرق اقسام اور خصائص کے ساتھ اس کا ارتقائی ربط استوار کیا ہے۔

۲۔ فن خطابت پر مرقوم منتخب اُردو کتب کے مطالعے اور تجزیے سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ چنیدہ مصنفین نے "ریطوریقا" میں پیش کردہ نظریہ خطابت کے اثر کو شعوری و لاشعوری طور پر قبول کیا ہے، اپنی تصانیف میں ارسطو کے نظریہ خطابت کو بنیاد بناتے ہوئے اردو خطابت کی توضیح کی ہے۔ انھوں نے اس بات کی تصریح بہ دلیل کی ہے کہ منطقی دلائل اور عقلی توضیحات کے مطابق تقریری مواد کی ترکیب و ترتیب، قطعی اور مستحکم اندازِ بیان سے تقریر کو مستند بنایا جاتا ہے۔ نیز، تقریری نوعیت اور موقعِ محل کی مناسبت سے عام فہم تمثیلات، استعارات اور کہاوتوں کے ذریعے دلائل کی استواری اور مستحکم پیش کش مدعا کی تفہیم، معانی کی ترسیل اور خطابت کی تاثیر کا موجب ہے۔

۳۔ خطابت کے موضوع پر مبنی منتخب اردو کتب کا جائزہ اس بات کی تصریح و توضیح کرتا ہے کہ ان میں فنِ خطابت کے ضمن میں بیان کردہ فنی تقاضے اور نکات "ریطوریقا" میں موجود فنی لوازم و خصائص کے مطابق و موافق ہیں۔ اسلوب کا صریح اور واضح ہونا، اندازِ بیان کا مستحکم اور پرکشش ہونا، قواعد کے اعتبار سے زبان کا درست ہونا، تقاریر کے مختلف حصص میں منطقی ربط ہونا، نوعیتِ تقریر اور استعدادِ سامعین کے لحاظ سے مناسب تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے دلائل کی پیش کش کرنا وہ اسلوبی خصائص ہیں، جن کے ضمن میں "ریطوریقا" اور منتخب اردو کتب ایک جیسا موقف رکھتی ہیں۔ اسلوبِ خطابت کے صریح اور واضح ہونے سے مقصد و مدعا کی ترسیل و تفہیم میں آسانی ہو گی، جس کی وجہ سے تقریر کے تاثر میں اضافہ ہو گا۔ مقرر کا اندازِ بیان جس قدر پُرکشش ہو گا، سامعین اس قدر آسانی سے اس کی جانب متوجہ ہوں گے، نیز طریقۂ اظہار کی قطعیت سامعین کو قائل کرنے میں مدد و معاون ہو گی۔ قواعد کے اعتبار سے درست زبان کی حامل تقریر اور مقرر کے درست تلفظ کے ساتھ جملوں کی ادائیگی کے سبب سامعین مقرر کی علمیت کے قائل ہو کر اس کے مدعا اور اثباتِ مدعا پر اعتماد کر سکیں گے، اس اعتماد کے باعث تقریر موثر تر ہو گی۔ تقریر کے مختلف حصوں میں منطقی ربط کے ساتھ سامعین تک مدعائے تقریر ایک ترتیب کے ساتھ تدریجاً پہنچے گا تو مخاطبین اسے سہولت سے قبول کر سکیں گے۔ تقریر کی نوعیت اور سامعین کی صلاحیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب تکنیک کے تحت دلائل کی ترکیب اور پیش کش سے مقرر کا استدلال سامعین کو قائل کرنے کے لیے معاون ہو گا۔

## ج۔ سفارشات

تحقیق اور مجموعی جائزے کے بعد مندرجہ ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ اردو فنِ خطابت کے ضمن میں نام ور مقررین کی تقاریر کا فنی حوالے سے تحقیقی تجزیہ ممکن ہے۔

۲۔ اردو فنِ خطابت نے فروغِ اردو میں کلیدی کردار ادا کیا ہے، اس پہلو پر تجزیاتی کام تشنۂ تحقیق ہے۔

۳۔ اردو فنِ خطابت کا لسانیاتی تناظر میں تجزیہ اردو تحقیق میں ایک اہم اضافہ ہو گا۔

۴۔ اردو فنِ خطابت کے علم بیان و علمِ بدیع کے تناظر میں تحقیدی مطالعے سے تحقیق کی جہاتِ نو طشت از بام ہوں گی۔

۵۔ اردو فنِ خطابت ادب اور ابلاغیات کے تناظر میں تشنۂ تحقیق ہے۔

# کتابیات

## بنیادی مآخذ


ابوالبیان آزاد، علامہ، تعلیم تقریر، ادریس المطابع، دہلی، س ن۔

ادارہ ادبیاتِ اردو، فنِ تقریر، اعظم اسٹیم پریس، خیرت آباد، ۱۹۴۰ء۔

شمس الدین احمد، خواجہ، خطابت و تقریر، نامی پریس، لکھنو، جولائی ۱۹۲۴ء۔

شورش کاشمیری، فنِ خطابت، مطبوعاتِ چٹان-۸۸ میکلوڈ روڈ، لاہور، ۱۹۸۲ء۔

کلب مصطفیٰ، سید، فنِ خطابت، ادارہ فروغِ اردو، لکھنو، بار اول، دسمبر ۱۹۵۷ء۔

نذیر الدین احمد، رموز خطابت، انجم اشاعت علم و ادب، حیدر آباد، بار اول، ستمبر ۱۹۵۲ء۔


## ثانوی مآخذ


ابولاعلا مودودی، سید، تفہیم القران (جلد دوم)، ادارہ ترجمان القران، ستمبر ۲۰۱۲ء۔

ابوالکلام آزاد، مولانا، خطباتِ آزاد، مرتب: شورش کاشمیری، مکتبہِ شعر و ادب، لاہور، بار دوم، یکم مارچ ۱۹۴۴ء۔

احمد حسین مجاہد، رموزِ شعر، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء۔

احمد ندیم قاسمی، محیط، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔

احمد محمد الحو، فن الخطابۃ، نہضۃ مصر، القاہرہ، س ن۔

ارسطو طالیس، الخطابۃ، الترجمۃ العربیۃ القدیمۃ، تحقیق و تعلیق / عبدالرحمان بدوی، مکتبہ النہفضہ المصریہ، القاہرہ، ۱۹۵۹ء۔

برجموہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، فروری ۱۹۷۵ء۔

جلال الدین احمد جعفری، نسیم البلاغت، مطبع انوار احمدی مطبوعہ گردید، الہ آباد، س ن۔

ڈیل کارنیگی، گفتگو اور تقریر کا فن، مکتبہ جدید، لاہور، بار اول، ۱۹۵۹ء۔

سجاد مرزا بیگ دہلوی، تسہیل البلاغت، نظام دکن پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۳۹ھ۔

سلمان ندوی، سید، مقالاتِ شبلی (جلد دوم)، معارف اعظم گڑھ، ۱۹۶۴ء۔

شیخ حبیب الرحمان بٹالوی، خطباتِ شورش، احرار فاؤنڈیشن، پاکستان، ۲۰۰۳ء۔

عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

عابد علی عابد، سید، البیان، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء۔

علی رفاد فتیحی، ساخت اور اسلوب: نظریہ و تجزیہ، بک کارپوریشن، دہلی، اشاعت اول، ۲۰۱۶ء۔
عطااللہ شاہ بخاری، سید، خطباتِ شورش، مدون: شیخ حبیب الرحمان بٹالوی، احرار فاؤنڈیشن، پاکستان، ۲۰۰۳ء۔
مرزا یوسف حسین لکھنوی، علامہ (مترجم)، نہج البلاغہ، حیدری پریس، لاہور، دسمبر ۱۹۷۴ء۔
محمد احتشام کٹونوی، فن خطابت، پرویز بک ہاؤس سبزی منڈی پٹنہ-۴، ۲۰۰۹ء۔
محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد م ۲۰۱۵ء۔
محمد فیصل، ارسطو ایک عہد--ایک شخصیت، مشتاق بک کارنر، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۵ء۔
مظفر محسن (مترجم)، الفاظ کا جادو، جے وی سرنی، سیونتھ سکائی پبلیکیشنز، لاہور، جون ۲۰۰۸ء۔
منشی دیبا پرشاد، معیار البلاغت، مطبع منشی نول کشور، لکھنو، س ن۔
نجم الغنی خان نجمی رامپوری، بحر الفصاحت (جلد دوم)، مقبول اکیڈمی، لاہور، س ن۔
نور اللغات (جلد دوم)، حلقہ اشاعت لکھنو، س ن۔
وارث سرہندی، علمی اردو لغت جامع، علمی کتب خانہ، لاہور، س ن۔
وہاب اشرفی، تفہیم البلاغت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء۔

## انگریزی کتب

Daniel Michael Crimmin, A Dissertation upon Rhetoric, Stockdaif, London, 1811.

George A. Kennedy, A New History of Classical Rhetoric, Princeton University Press, New Jersey,1991.

Jaclyn Lutzke/Mary F. Henggler, The Rhetorical Triangle, School of Liberal Arts, University Writing Center, 2007.

John Henry Freese, Aristotle-The Art of Rhetoric, William Heinemann, New York,1924.

Richard Jebb, The Rhetoric of Aristotle, Cambridge University Press, Warehouse,1909.

W. Gellrich, Aristotle Rhetoric: Theory, Truth & Metarhetoric, Louisiana State University, 1990.

W.Rhys Robert, Rhetoric by Aristotle, Courier Corporation, 2004

## Websites ویب گاہیں

www.google.com/

www.merriam-webster.com/

www.mesacc.edu/

www.platostanford.edu/

www.rekhta.org/

www.rhetoric.sdsu.edu/

www.youtube.com/